

خوبصورت کسانیں کا مجموعہ

سینئر ڈائجسٹ

ماہنامہ

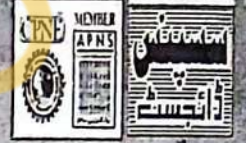
اکتوبر 2024

قیمت 200 روپے

پانی

معارف اور ترقی





مدیر اعلیٰ

عذر ارسول



مدیر

یمنی احمد

نائب مدیر

اطہر حسین



مارکیٹنگ و سرکولیشن منیجر

محمد شہزاد خان

0333-2256789

جون ایلیا



بصارت اور بصیرت کے درمیان
فسق کو واضح کرتی تحریر

زویا صفوان



ماضی کا آئینہ - باقی رہا اور باقی رہا
انسان کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

اسما قادری



اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے
ایک سرایا تھا ان کو جو ان کی تحیر انگیز داستان

مرزا امجد بیگ



بیگ صاحب کی ڈائری سے ایک
اور قتل کی لرزہ خیز داستان

مدیر اعلیٰ



سپنس کی مجلس مشاورت دست ارمن کی تلوار
شیریں ہاتھیں گلے شکوے اور پر خلوص مشورے

محمد شاہ زین رضوان



دولت کے گھنڈے میں دوسروں کی
زندگی کو کھلونا بنانے والوں کا قصہ

عیوق بخاری



اپنی ذات کے غلبے میں بسند چند
بسیار لوگوں کے دلوں کا چوڑکائیے والا حوالہ

ناہید سلطان اختر



موسم گل کا انتظار کرتے کرتے باپوں کے اندھیروں
میں بھٹکنے والے چند بد نصیب مسافروں کی دنگل از داستان

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی



معاشرتی تاسوؤں اور رنڈوں کی خوش و غم سازشوں اور
زخم زخم ہونے والے ایک جنگ بازی دلدوز داستان

ضیاء تسنیم بلگرامی



صاف دل، حق گو اور حدودِ رحیم الطبع
انسان کے پاکیزہ حالات اور واقعات

ایم اقبال



محبت کے زمانے میں قید ہونے والی ایک ماسدا اور عاقبت
نا اعلیٰ حیدر کی خطرناک کارروائیوں کی عبرت از داستان

قارئین



آپ کے ہاتھوں ہی ایک نئے جگہ تک
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آپ تک

عمران قریشی



دوست بن کر آستین میں رہنے
والے سانپ کا زہریلا وار

صائمہ دانش



قبر کے اندھیروں میں گم ہونے سے پہلے آسمان کی
دستوں میں نئی اڑان بھرنے والی حیدر کا قصہ

جلد 53 • شمارہ 10 اکتوبر 2024 • زیر سالانہ 3000 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 200 روپے •

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 021/35895313 • E-mail: jdpgrp@hotmai.com

پبلشر و پرنٹر: نیشنل رسالہ، مقاشعات: گراؤنڈ فلور، 63 فیو آئی ایکس ٹینشن، ڈیفنس، بین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

✽ چندی علی کی دعا ملتان سے۔ ”سب سے پہلے دعا سے آغاز کر اللہ کریم ادارہ سہنس کے تمام مدبران، اسٹاف اور سہنس کے تمام قارئین کے ساتھ سہنس کے خطوط سلسلے کے مستقل سماجی یعنی اشفاق بھائی، رویہ شاعر، رویہ شاہین، بیٹا شاہ، ملک وحید، ظفر اللہ ضیا، مہتاب احمد، انجم فاروق ساطی، روی بھائی، ناہید یوسف، بلیک لسٹ کے تمام سماجی اور دیگر کو آباؤ شادر رکھے۔ صحت و تندرستی اور خوشحالی کے ساتھ عمر خضر اور دین و دنیا کی تمام باتیں عطا فرمائے۔ سہنس اس بار 18 کو طابو جلدی سے پڑھ لیا اور تمبرہ کر دیا اور اس بار سے نئی صورت سرور شہینا نے پراٹھ کر لٹ کر دوادو دیا جاتا ہے کہ سرور شہینا اور منظر کشی سے ہم پور تھا ہے 10/10 نمبر دیے جاتے ہیں۔ اس بار ادارہ بھی بے حد اہم موضوع پر لکھا گیا تھا جس پر غور و فکر اور عمل کرتے ہوئے ہم بہت سے مسائل کو احسن انداز میں حل کر سکتے ہیں۔ خطوط میں ساحل سمندر کی دلکش لہروں کے شہر کراچی کی رویہ شاعر اپنے روایتی دلچسپ انداز میں کرسی صدارت پر احسن انداز میں ممکن تھیں۔ رویہ شاہین صاحبہ نے ماہ تمبر سے متعلق بہت پر فکر و فکرنگوئی جو ان کی اپنے وطن سے محبت کو ظاہر کرتی ہے، جیسے اشفاق بھائی کے خط کا آغاز ایک خوبصورت شعر سے ہوا اور ان کا نام شہداء کو خراج تحسین پیش کرنے کے ساتھ نئی نسل کو تعمیر دے رہا تھا۔ مہتاب احمد کو سہنس میں خوش آمدید اور وحید بھائی اپنے مخصوص جامع انداز میں محفل برخواست کر رہے تھے اور ساتھ بیٹا شاہ کی کی محسوس ہوئی جیسے عبدالجبار روی، ظفر اللہ ضیا اور ناہید یوسف طویل عرصے سے غائب ہیں اور سب کے خطوط تاخیر سے موصول ہوئے تو اگر آپ کو پرچہ بد تاخیر سے ملے تو سالانہ گولڈ اکیا کریں۔ اس بار آغاز میں ماضی کے درپچوں سے الیاس بیٹا پوری کی تحریر نے دلی مسرت سے ہمکنار کیا اور کہانی میں ان کے مخصوص انداز میں دلچسپی کی بنا پر پسند آئی جس میں امیر طلال کی عملی کارروائیاں عروج پر تھیں۔ ”جنگ باز“ میں تیزی لائی جائے جو دلچسپی سے خالی ہوتا جارہا ہے۔ آخری

رومیہ شاعر، کراچی سے لکھ رہی ہیں۔ ”ماہِ تمبر کا شمارہ اگست کی برسات میں بھیگی ہوئی شام کو ملا۔ ٹائٹل پر پہاڑی حسینہ برف پوش وادی میں کھڑی ہوئی کچھ سوچتی ہوئی اچھی لگی۔ ٹائٹل کو سنا اپنے اور فرست پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے جون ایلیا کے پُر مغز اور طویل انشائے سے مستفید ہوئے۔ اس بار انشاء دو صفحات پر مشتمل تھا جس میں جون ایلیا اپنی شخصیت کے قاتلوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ انہوں نے سچ ہی کہا کہ آج ادب، تاریخ، فلسفے، منطق اور ذہن و زبان و ثقافت کا ایک دور ختم ہو گیا ہے اور جو خلا پیدا ہوا ہے اسے ادبی بیوقوفوں نے پُر کر دیا ہے۔ لیکن یہ خلا بھی پُر نہیں ہوگا۔ خطوط کی محفل میں ایڈیٹر صاحبہ ملک کی معاشی اور عالمی سیاست پر سبکدوشی حاصل گفتگو کرتی نظر آئیں۔ اس بار کرسی صدارت ہمارے حصے میں آئی، خوشی ہوئی۔ محفل میں حنیف علی کی حاضری حسب سابق بھرپور رہی۔ سیدتی الدین اشفاق شہدائے حق کو سلام پیش کرتے ہوئے نظر آئے۔ تقریباً ہماری ہم نام رومیہ شاہین رونی شہداء اور قازیلوں کی منون نظر آئیں۔ بے شک ہم اپنے شہداء اور غازیوں کے منون ہیں جن کی کاوشوں اور قربانیوں سے یہ وطن قائم ہے۔ مہتاب احمد اور ملک وحید کی حاضری بھی بھرپور رہی۔ ابتدائی صفحات پر کافی عرصے بعد الیاس سیتا پوری کی تاریخی کہانی ”اندکائی آدمی“ نظر آئی۔ ان کا نام دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ امیر علانی کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ جھنڈا اور ناگلا نے مل کر امیر علانی کے خلاف سازش کی اور اسے دھوکے سے صحرائیں لے جا کر پھنسا دیا اور وہ جھوک، پیاس سے لڑتا ہوا بالآخر حوائی گھٹ کے ڈنٹے سے ہلاک ہو گیا۔ بہت زبردست تحریر تھی، کہانی کا پلاٹ اور اوقات کا تسلسل خوب رہا۔ مصنف نے دلچسپ و مغزدار اندازِ تحریر، معتدل جزئیات نگاری سے بھرپور تحریر لکھی، ویلڈن، شاہ سان کی تحریر ”پلان“، پسند آئی۔ کرشن، رسل اور گیل نے مل کر مسز یا میل کو بھلا پھلا کر ان سے رقم ادھار لی اور پھر رسل کی خوشی کا ڈراما رچایا۔ حقیقت کھلنے پر تینوں نے اپنا جرم قبول کر لیا اور پولیس کی پکڑ میں آگئے۔ کہانی کا پلاٹ اچھا تھا۔ جامعہ دانش کی کہانی ”سراغ“ اچھی لگی۔ ماہِ تمبر کے حوالے سے دلوں کو برمانی ہوئی عیوق بخاری کی تحریر ”جنبہ“ زبردست رہی۔ ہماری پاک دھرتی نے ایسے بیٹے پیدا کیے ہیں جو بھیجی، کہیں بھیجی، کسی بھی عمر میں اپنا جذبہ بیدار رکھتے ہیں اور اور وطن کی بیکار پر لپیک کھتے ہیں۔ طاہر علی نے وطن کی سازش ناکام بنا کر ثابت کر دیا کہ فوجی ریٹائر ہوتا ہے مگر اس کا فیذبہ کبھی ریٹائر نہیں ہوتا۔ نمک حرام نوکر کی چالاکیوں اور ملک صاحب کی کڑی قیقل کا پراسرار احوال ”راہِ گزر“ میں پڑھنے کو ملا۔ دوسری فصل الہی کی بھوی رخسانہ کو ان کے ڈرائیور عبدالرحمن نے طلالی زیورات سے بھرے ہوئے بیگ اور رقم ہتھیانے کے لیے قتل کیا مگر پولیس جب کی مجرم پر واقعی ہاتھ ڈال دیتی ہے تو پھر اس کی زبان کھلوانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی اور آخر کار

عبدالرحمن قانون کے گلے میں آگیا۔ ظلیل انجم کی تحریر ”سہارا“ اچھی لگی۔ فریج نے بازی بہت اچھی طرح کھیل اور نکاح کے نام پر افضل کی تمام دولت اور جائیداد اپنے نام کر والی اور پھر افضل کو دودھ میں زہری دوا ملا کر پلا دی۔ اسے اپنی بیٹی کی پرورش کے لیے افضل کی بیوہ ہونے کا سہارا مل گیا۔ عائشہ نصیری ”مغفور“ اچھی لگی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ”جنگ باز“ سب سے بہتر اور انجمن سے بھرپور واقعات کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ سیدہ شاہدہ شاہ کی ”فطرت“ کچھ خاص نہ تھی۔ فیاض تنیم بلگرامی کی ایمان افروز تحریر ”ابو عبد اللہ حارث مجاہد“ اچھی لگی۔ جاوید بسام کی ”نیا قیدی“ پسند آئی۔ آخری صفحات پر ناہید سلطانہ کے قلم سے تحریر کردہ ”لکھن“ زبردست رہی۔ غنا، ارسلان کی موت کے بعد خود کو نیکر تہا محسوس کرتی تھی۔ اسے نہ اپنی منہمی ذمے داریوں کا ہوش تھا نہ اپنی خبر۔ اور پھر اسے ارسلان کا جڑواں گمشدہ بھائی کا مران مل گیا۔ راحت جہاں بیگم کی اپنے گمشدہ بیٹے کے لیے اور غنا کی اس کے مرحوم شوہر کے لیے بے لوث لکھن مجرہ دکھائی، ویلڈن، محفل شعر و سخن میں اشعار کا انتخاب بھی خوب رہا۔ کترنوں کی کی محسوس ہوئی۔“

ملک وحید کا مختصر نامہ کراچی سے۔ ”ماہ تمبر کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ ٹائل اچھا لگا۔ ٹائل اور فہرست پر نظر ڈالتے ہوئے جون ایلیا کے انشائیے پر پہنچے جہاں حسب سابق جون ایلیا پر مغز گفتگو فرما رہے تھے۔ خطوط کی محفل میں ایڈیٹر صاحب کی گفتگو اچھی لگی۔ محفل میں روینہ اشعر صاحبہ کو کرسی صدارت کی مبارک باد۔ اس کے علاوہ جنید علی، سیدی الدین اشفاق، روینہ شاہین روہی اور مہتاب احمد کی حاضری بھی بھرپور رہی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے الیاس سیٹاپوری کی تاریخی کہانی ”اندرا کا آدمی“ پڑھی۔ امیر علانی کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ شاہ سان کی تحریر ”پلان“ اچھی لگی۔ سائمنڈش کی کہانی ”سراغ“ پسند آئی۔ عیون بخاری کی تحریر ”جذبہ“ اچھی لگی۔ ریاض فوجی نے حب الوطنی کا ثبوت دیتے ہوئے وطن کی سازش کا نام بنائی۔ ملک صفدر حیات کی کہانی ”راہ گزر“ اچھی لگی۔ ظلیل انجم کی تحریر ”سہارا“ زبردست رہی۔ فریج کی زندگی کے شیبہ و فراز نے اس کی ہر کہانی کے آخر نے سنا کر دیا۔ عائشہ نصیری ”مغفور“ کچھ خاص نہیں تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ”جنگ باز“ سب سے زیادہ دلچسپ رہی۔ سیدہ شاہدہ شاہ کی ”فطرت“ اچھی لگی۔ فیاض تنیم بلگرامی کی تحریر ”ابو عبد اللہ حارث مجاہد“ پسند آئی۔ جاوید بسام کی ”نیا قیدی“ زبردست رہی۔ اس کے علاوہ آخری صفحات پر ناہید سلطانہ کی تحریر ”لکھن“ اس ماہ کی سب سے عمدہ تحریر رہی، ویلڈن۔ اشعار اور کترنوں کا انتخاب اچھا رہا۔“

سیدی الدین اشفاق، فتح پور لیہ سے چلے آ رہے ہیں۔ ”تمبر کا شمارہ اپنی تمام تر دلچسپیوں، معلومات اور جلووں کے ساتھ ساتھ میں آیا تو ایک ہی نشست میں کافی حصہ پڑھ ڈالا۔ چھٹی کا دن تھا اس لیے مطالعے میں گزرا۔ خطوط کی محفل میں روینہ اشعر صاحبہ کرسی صدارت پر بیٹھی نظر آئیں۔ مبارک ہو۔ اچھے الفاظ کے ساتھ آپ اس منصب کی مستحق تھیں۔ جنید علی کا خوب صورت تبصرہ پڑھا، بڑی عرق ریزی سے الفاظ کا چناؤ کر کے حاضری دی ہے، جنید علی کی دعا میں شامل ہو کر آمین کہتے ہیں۔ جنید علی اور اے، مصنفین اور قارئین کا رشتہ اور الفاظ و قلم کا سلسلہ جاری رہے گا۔ انشاء اللہ کیونکہ اس دور میں بھی کتاب، رسالہ، لفاظی، اچھی اردو، مطالعے کو پسند کرنے والے لوگ موجود ہیں۔ قتل ساؤتھ پنجاب سے سیدہ روینہ شاہین روہی قوم کو یوم دفاع کی مبارک دے رہی ہیں۔ خیر مبارک، خدا اس وطن کے دفاع کو مضبوط بنائے اور ہمیں حب الوطنی کا جذبہ زیادہ سے زیادہ دے۔ (آمین) مہتاب احمد اور ملک وحید کی حاضری بھی خوب رہی۔ سب سے نصف ملاقات کے بعد کہانیوں کی جانب بڑھے۔ ناہید سلطانہ آخر کی ”لکھن“ جذباتی تحریر تھی۔ دو ماؤں میں بٹے ہوئے دو ہم شکل بیٹوں اور غنا کی داستان دلچسپ لگی۔ شاہ سان کی ”پلان“ میں پامیلا نے کھیل، کرکشن اور رسل کے پلان کو بڑی محفل مندی سے ناکام بنا دیا، غور سے بات سننے کا یہی فائدہ ہے کہ الفاظ اور جملے کی مزید باتیں سمجھا دیتے ہیں۔ ظلیل انجم کی ”سہارا“ میں فریج کی بے چارگی پڑھی لیکن افضل و راج کو کفر کر دار تک پہنچانا سناکوں کا باعث بنا۔ افضل و راج ایسے ہی انجام کا مستحق تھا۔ عیون بخاری کی ”جذبہ“ میں ریاض ڈٹا ہر ملی کے بھی ریاض نہ ہونے والے جذبے اور دہشت گردی کے ناکام ہوتے منصوبے کا احوال پڑھ کر آنکھیں نم ہوئیں۔ ”میرے جیتے جی ایسا نہیں ہو سکتا۔“ طاہر علی کا کہنا تھا اور پھر انہوں نے بات بھی کر دیا۔ واقعی یہ ایک شہداء کے لہو اور قازیوں کی جرات کے طفل سلامت ہے۔ عیون بخاری نے بہت اچھی کہانی لکھ کر فوج کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ عائشہ نصیری ”مغفور“ اور صائمہ دانش کی ”سراغ“ بھی دلچسپ تحریر تھی۔ کترنیں اور محفل شعر و سخن دونوں چیزیں کمال تھیں۔ مطالعے کی اہمیت کی اور کتاب کی مزید وقت کی دعا کے ساتھ۔“

سیدہ روینہ شاہین روہی کی اداسی قتل ساؤتھ پنجاب سے۔ ”حالیہ بارشوں سے ماحول میں قدرے ٹھنڈک ہو گئی ہے خصوصاً رات کے وقت لیکن..... دل کی اس جلن کا کیا کریں جو انہوں کے ڈھے جانے والے گھر اور انہوں کو بے گھر ہر سر و سامان دیکھ کر ہوتی ہے۔ بارشوں کے بعد کی تباہی نے اس کو دیا ہے۔ خدا ہماری کوتاہیوں، نالائقیوں کو معاف فرمائے اور ہماری مشکلات آسان کرے۔ (آمین) شہر قائد سے روینہ اشعر صدارت کرتی بڑی بھلی لگیں، میری ہم نام ہیں۔ اس لیے کچھ زیادہ ہی بھلی لگتی ہیں۔ ویسے باقی ساتھی ہیں۔ ہم سب اس رسالے کے توسط سے تخلص اور بے لوث ہے رشتوں میں جڑے ہوئے ہیں۔ مدینہ اویام سے جنید علی نے تبصرہ بھجوایا، تفصیلی اور پر مغز تبصرہ تھا۔ خصوصاً ان کا ”ہر دھڑ سسپنس“ کہنا بہت پسند آیا۔ سیدی الدین اشفاق کا شہداء و غازیوں کو سیلوٹ کرنا خط و خارج کرنا تھا کہ ہم وطن اور فوج سے کتنا پیار اور عقیدت رکھتے ہیں۔ سیدی الدین اشفاق آتین تین خوشیاں مبارک ہوں۔ خدا ہمیشہ ایسے ہی ڈھروں خوشیاں عطا کرے۔ (آمین) مہتاب احمد نے گرمی میں رسالہ پڑھ کر غلطی کا ذکر کیا، خوب کہا..... واقعی من پسند تجارتی موسمی شدت کو کم کرتی ہیں۔ ذاتی تجربہ ہے۔ ملک وحید کا مختصر خط اس امید کے ساتھ پڑھا کہ آئندہ ذرا زیادہ لکھیں گے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے ماہ تمبر کے حوالے سے لکھی گئی تحریر ”جذبہ“ پڑھی۔ عیون بخاری نے بڑے دل گداز، جذباتی اور ولولہ دینے انداز میں ریاض ڈٹا ہر ملی کے کہی بھی ”ریاض“ نہ ہونے والے جذبے کو بیان کیا۔ کہانی پڑھ کر وطن سے محبت کا اور فوج کی قربانیوں کا احساس اور شدت سے ہوا، ویل ڈن۔ ملک صفدر حیات کی ”راہ گزر“ میں نمک حرام نوکر اور اس بے جاری عورت کا احوال پڑھا جو خداوند سے ناراض ہو کر اپنی بناد گاہ سے نکلی تو سفاک مجرم کے ہاتھوں ماری گئی۔ نوکر جب پکڑا گیا تو یقیناً اسے یہ احساس ضرور ہوا ہوگا کہ غلط طریقے سے خوشی حاصل کرنا کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ سیدہ شاہدہ شاہ کی ”فطرت“ دلچسپ کہانی تھی۔ ڈاکٹر علی جیسے پڑھے لکھے سمجھ دار انسان کو بے وقوف بنانے والی جرائم پیشہ گروہ کی رکن، ڈاکٹر علی کی خوش قسمتی کی وجہ سے قانون کی گرفت میں آگئی اور انجام کو پہنچی۔ ناہید سلطانہ آخر کی ہم شکل بھائیوں کے بارے میں کہانی ”لکھن“ آخری صفحات پر بھی بڑی خوب صورت لگی۔ آصف علی لکھن والے کا شعر پسند آیا۔ وطن اور اہل وطن کے لیے کچھ چین کی دعا۔“

راحیل علی کی کراچی سے پہلی بار آمد۔ ”ماہنامہ سسپنس میرا پسندیدہ رسالہ ہے جس کا میں کافی عرصے سے قاری ہوں۔ اس بار میں نے سوچا کہ خطوط کی محفل میں شامل ہوا جائے۔ امید ہے احباب ہمیں کھلے دل سے خوش آمدید کہیں گے۔ ماہ تمبر کا شمارہ حسب معمول جلد ہی مل گیا۔ سب سے پہلے جون ایلیا کے انشائیے سے استفادہ کیا جہاں وہ پر مغز گفتگو فرما رہے تھے۔ محفل میں تمام احباب کی حاضری خوب رہی خاص طور پر جنید علی ہمیشہ کی طرح طویل تبصرے کے ساتھ موجود رہے۔ روینہ اشعر کو کرسی صدارت مبارک۔ روینہ شاہین روہی، مہتاب احمد اور ملک وحید کی حاضری بھی خوب تھی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے الیاس سیٹاپوری کی تاریخی کہانی ”اندرا کا آدمی“ پڑھی۔ کہانی کا پلاٹ اور کردار زبردست تھے، ویل ڈن۔ عیون بخاری کی تحریر ”جذبہ“ ماہ تمبر کے حوالے سے زبردست تحریر تھی۔ شاہ سان کی تحریر ”پلان“ کچھ خاص نہ تھی۔ سسپنس کی مستقل رائٹر صائمہ دانش کی کہانی ”سراغ“ خوب رہی۔ ملک صفدر حیات کی ”راہ گزر“ جرم و سزا پر مبنی اچھی تحریر رہی جہاں چودھری فضل الہی کی بیوی رخسانہ کو ڈرائیور عبدالرحمن نے طلائی زینوں سے بھرے ہوئے بگ اور قوم ہتھیانے کے لیے قتل کیا۔ مگر ملک صاحب کی کڑی تنقید کے باعث اصل جرم قانون کی گرفت میں آگیا۔ ظلیل انجم کی تحریر ”سہارا“ زبردست رہی۔ فریج نے اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے وباغ لایا اور افضل کی تمام دولت اور جائیداد اپنے نام کر والی۔ عائشہ نصیری ”مغفور“ کچھ مٹا کر نہ کر سکی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ”جنگ باز“ کچھ پور کرنے لگی ہے۔ سیدہ شاہدہ شاہ کی ”فطرت“ بہترین کہانی تھی۔ فیاض تنیم بلگرامی کی ایمان افروز تحریر ”ابو عبد اللہ حارث مجاہد“ اچھی لگی۔ جاوید بسام ہمیشہ کی طرح ”نیا قیدی“ کی صورت میں بہترین کہانی لائے۔ ناہید سلطانہ کے قلم سے تحریر کردہ آخری صفحات پر ”لکھن“ اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ غنا، ارسلان کی موت کے بعد تہا ہو گئی تھی اور پھر جب اسے ارسلان کا جڑواں گمشدہ بھائی کا مران مل گیا تو اس کی زندگی میں پھر سے بہار آگئی۔ محفل شعر و سخن میں اشعار اور کترنوں کا انتخاب خوب رہا۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
محمد اسلم، لاہور۔ سلطان احمد، لیہ۔ رانا مبشر علی، لاہور۔ سلام اللہ، بھکر۔ اعجاز احمد، سکرات۔ پرویز محمود، لیہ۔ محمد حسین، کراچی۔ راجہ احتشام، جہلم (بٹی گھر والا)۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

آخری وار

زردیا مفران

جنگ کوئی بھی ہو اگر اصول پر ہو
تو طاقت کی بنیاد پر شکست یا فتح کا
فیصلہ ہوتا ہے اور اگر... دھوکے سے
وار کیا جائے تو انسان ذلت کی پستی میں
گر کر قبر کی خواہش کرتا ہے... اس کے
ساتھ بھی ایسا ہی ہوا جو ایک ایسے دشمن
کے ہاتھ لگ چکا تھا جو دین کے نام پر گھناؤنا
کھیل کھیل رہا تھا... جس نے زمین پر فرعون
چالوں سے دین داروں کا جینا حرام کیا ہوا تھا...
اس کے خلاف کھڑے ہونے والے زندگی سے محروم
کر دیے جاتے تھے... انہی لشکروں میں ایک ایسا بہادر
سپاہی بھی اس کے ہاتھ لگا جو صحیح معنوں میں تخت و
تاج کا حقدار تھا لیکن... تاریخ گواہ ہے کہ سازشوں کے
دائے میں حقدار ہمیشہ محروم اور غاصب کو غلبہ حاصل رہا
ہے... دین کے اس دشمن نے جان کی بازی ہارتے ہارتے بھی ایک
ایسا آخری وار کیا جس کے بعد اس کے پوش و حواس قائم رہے اور
نہ ہی وہ کسی کومٹہ دکھانے کے قابل رہا... کیونکہ ظالم کا ساتھ دینے
والا بھی تو ظالم ہی ہوتا ہے... اور یہی بات وہ بھول گیا تھا۔



”تو کیا یہ جہاد آخری فیصلہ ہے؟“ جواد نے اپنے سامنے بے نیازی و اعتماد سے کھڑے حماد کو مضطرب ہو کر مخاطب کیا۔

”جی ہاں، بالکل آخری۔“ حماد نے اپنی بے نیازی میں بھی ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا۔

”ایک بار پھر سوچ لو۔ یہ سب اتنا آسان نہیں ہوگا۔“ اس نے متنبہ کیا۔

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے اور اب پیچھے ہٹنا ممکن نہیں ہے۔“ حماد نے دونوں انداز میں جواب دیا۔

”آذر بائجان میں اردبیل کے قریب قلعے کی منصب داری پھولوں کی بیج نہیں ہے۔“ جواد نے ایک اور کوشش کی۔

”میں نے منصب داری کو کبھی بھی پھولوں کی بیج سمجھا ہی نہیں۔“ حماد پُر اعتماد تھا۔

”اور تم...؟“ جواد کی اہلیہ آمنہ نے بیٹی سے مخاطب ہو کر دریافت کیا جو خاموشی و افسردگی سے اپنے والد اور شوہر کی بحث سننے میں مصروف تھی۔ ”تم نے اسے سمجھانے کی کوشش نہیں کی کیا؟“

”بہت کوشش کی تھی لیکن یہ نہیں مانتے۔ ان کا ایک ہی جواب ہے کہ اگر مجھے شوہر کے معاملے میں اتنے ہی تحفظات یا خدشات تھے تو مجھے کسی منصب دار سے شادی کرنا ہی نہیں چاہیے تھی۔“

”تمہارا فیصلہ کیا ہے؟“ اس نے کسی آس کے تحت استفسار کیا۔

”میں ان کے ساتھ ہی جاؤں گی۔“ عائشہ ہونٹ کچلے ہوئے گویا ہوئی۔

”تو اس عمر میں ہمیں تنہا چھوڑ جاؤ گے؟“ جواد کی آنکھوں میں نمی اٹھنے لگی۔

”مجبوری ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ یا انتخاب نہیں ہے۔“ حماد کے انداز میں بیزاری در آئی۔

”ایک راستہ بہر حال موجود ہے، اگر تم راضی ہو جاؤ تو۔“

جواد کی اس بات پر حماد استغہامیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

”سفیان کو یہیں ہمارے پاس چھوڑ دو۔ اس کی تعلیم و تربیت اور پرورش ہمارے ذمے ہوگی۔“

”ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ حماد نے ایک توقف کے بعد جواب دیا اور اہلیہ کے چہرے پر

اضطراب دیکھ کر کہا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم سفیان سے ملاقات کے لیے آتے جاتے رہیں گے اور اپنے بوڑھے والدین کے بارے میں بھی تو کچھ سوچو نا۔ سفیان کی ان کے پاس موجودگی جذباتی و اخلاقی سہارا فراہم کرتی رہا کرے گی۔“

”میری دلی دعا ہے کہ پروردگار تمہارے گلشن کے ان پھولوں میں مزید اضافہ فرمائے۔ کبھی بھی نوموود کی آمد کے بعد تم مصروف ہو تو وہی جاؤ گی۔“ جواد نے بیٹی کو دلاسا دینا چاہا۔

”اولاد کی کمک تو کبھی ختم نہیں ہو سکتی ابی محترم!“

عائشہ نے شکوہ کناں نگاہوں سے والد کی جانب دیکھا۔

”لیکن والدین کے قرض کی ادائیگی کے نئے مانتا کے جذبات کی قربانی بھی بے مول ہی ہے۔ میں اپنے جگر گوشے کو آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ سے بڑھ کر میرے بیٹے کا خیال کوئی نہیں رکھ سکتا۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آپ دونوں اسے بہترین تعلیم و تربیت سے آراستہ کریں گے۔“

”بالکل۔ تم اس معاملے میں بے فکر رہو۔ میں اپنے نواسے کو کسی بھی قسم کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔“ آمنہ کا چہرہ کھل گیا۔

”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اپنا ضروری سامان باندھ لو۔ قلعے کا انتظام جلد از جلد سنبھالنا ہے۔“ حماد نے اہلیہ کو ٹوکا۔

عائشہ نے اثبات میں سر ہلا کر روٹھائی کی تیاریوں کا آغاز کر دیا۔

☆☆☆

حماد اور عائشہ کی روانگی کا وقت قریب تھا۔ جواد اور آمنہ کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے بھی خشک نہ ہو پارہی تھیں۔ وہ دونوں بیٹی کے علاوہ ایک دوسرے سے بھی آنسوؤں کی نمی پوشیدہ رکھنے میں بلکان ہو رہے تھے۔ عائشہ والدین کی ان کیفیات سے بے خبر نہیں تھی۔ اسے اس لمحے اپنا دل کسی بھاری چٹان تلے دبنا محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھوں کی نمی میں سفیان کا چہرہ بار بار دھندلانے لگا۔

”آپ میرے اچھے بیٹے ہو نا؟ میری ایک بات مانو گے؟“ عائشہ نے سفیان کو اپنے پاس بٹھالیا۔

”جی امی جان!“ سفیان نے افسردہ نگاہوں سے والدہ کی سمت دیکھا۔

آخری وار

”نانا، نانی کو بالکل نہیں ستانا۔ ان کا بہت خیال رکھنا۔“ اس نے بیٹے کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”آپ کب لوٹیں گی امی جان؟“ سفیان گلو گبر ہوا۔

”ہم بہت جلد لوٹ آئیں گے۔“ عائشہ نے دلاسا دیا۔

”لیکن آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ نانا، نانی کی ہر بات مانو گے۔ انہیں کبھی کسی چیز کے لیے تنگ نہیں کرو گے۔“

”وعدہ امی جان!“ اس نے والدہ کے دراز ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

عائشہ کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے بیٹے کو آغوشِ محبت میں بھر لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”کہاں رہ گئی ہو عائشہ؟ جلدی باہر آؤ، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ حماد کی بیزار آواز سنائی دینے پر وہ چہرہ صاف کر لی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میری بیٹی! میں تیرا شکر یہ کیسے ادا کروں؟“ جواد نے اسے اپنے سینے میں بٹھایا۔

”شکر یہ کیسا ابی جان؟ یہ میرا قرض تھا۔“ اس نے نظریں چرائیں۔

”مانتا کی قربانی فرض نہیں ہوا کرتی۔“ آمنہ بھی رونے لگی۔

”میری دلی دعا ہے کہ پروردگار تجھے ڈھیروں اجر دے اور سدا خوش و آباد رکھے۔“

”میں ملاقات کے لیے آتی رہوں گی۔“ عائشہ نے والدین سے زیادہ خود کو دلاسا دیا۔

حماد ایک جانب کھڑا بیزاری و غصے سے یہ مناظر دیکھ رہا تھا۔ آمنہ نے قرآن پاک کے سائے میں بیٹی کو رخصت کیا تو ان میں سے کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ بقید حیات ان سبھی کی آخری ملاقات ہے۔

☆☆☆

حماد کی آذر بائجان روانگی کو کئی برس بیت چکے تھے۔ ابتدائی چند مہینے سفیان کے لیے بے حد گمراہ تھے۔ وہ والدین کی کمی نہایت شدت سے محسوس کرتا تھا۔ باپ کے وجود کی گرمی، ماں کی مہک، ان دونوں کی ذات سے وابستہ ناگزیر رانیت اسے ہمہ وقت بے چین رکھتی تھی تاہم وہ اپنے جذبات کو کبھی نانا، نانی پر عیاں نہ ہونے دیتا۔ اسے نانی کے وجود میں ماں کی کم گشتہ مہک تو مل جاتی لیکن حماد کی شخصیت سے جڑی وہ مخصوص خوشبو تا حال ایک غلش میں جتلا رکھی تھی۔

جواد کی کہنہ سال نگاہیں نواسے کی یہ غلش اور کک بھانپ گئی تھیں۔ اس نے متانت اور سمجھ داری کا مظاہرہ

کرتے ہوئے سفیان سے دوستانہ تعلقات استوار کر لیے۔ نواسے کو بھرپور شفقت و محبت فراہم کرتے ہوئے جواد ایک آفاقی نظریے کا بھی قائل تھا کہ محبت، خلوص اور اپنایت تو جانوروں کو بھی رام کر لیا کرتی ہے۔ اس شفقت کے ساتھ جواد نے سفیان کو عسکری امور میں طاق کرنے کا آغاز بھی کر دیا۔ سفیان نے بھی نانا کو کسی لمحے مایوس نہیں کیا اور بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مکمل باریک بینی سے عسکری مہارت کے سانچے میں ڈھلتا گیا۔ جواد نواسے کی ذہانت اور فطری صلاحیتوں سے کافی متاثر ہو چکا تھا۔

دن بھر جان توڑ مشقت کی جنگ میں بیٹے کے بعد سفیان رات کو جب بستر پر لیٹا تو والدین کی یاد کی خوشبو کی طرح حواس پر غالب آ جاتی۔ وہ والدہ کا استعمال شدہ دوپٹا اور والد کی نماز کے لیے لی جانے والی مخصوص ٹوپی و تہیج اپنی ہاتھوں میں بھر لیتا۔ آنکھوں میں اٹھنے والی نمی صاف کرتے وہ سر جھٹک کر خود دکھائی کرتے لگتا۔

”خود کو سنبھالو سفیان! تمہاری یہ کیفیت نانا، نانی کو بہت افسردہ اور مایوس کر دے گی۔ ان کی ریاست خاک میں ملانے پر کیوں تلے ہو۔ اپنی یہ بے چینی محض خود تک ہی محدود رکھو۔“

برسہا برس بیتنے کے بعد بھی سفیان کے اس معمول میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ بوڑھے نانا، نانی بھی اس کے سامنے ماضی کا ذکر چھیڑنے سے حتی الامکان گریزی کرتے تھے لیکن پھر ایک روز یہ ذکر از خود ہی محسوس ہوپ میں ان کے سامنے چلا آیا۔ اس شب ایک قاصد ملاقات کے لیے آیا تھا۔ اس کے مخصوص لباس و اطوار نے جواد کو یہ زبان خود ہی اپنا تعارف کروا دیا۔ وہ قاصد حماد کی جانب سے وہاں آیا تھا۔

”کہو، کیسے آتا ہوا؟“ جواد نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ اس کی مضطرب حرکات سے عیاں تھا کہ وہ کوئی اچھی خبر نہیں لایا۔

”میں قلعے کے منصب دار حماد کی جانب سے آیا ہوں۔ میرے پاس آپ کے لیے ایک افسوسناک خبر ہے۔ آپ کی بیٹی اب حیات نہیں رہیں۔“

قاصد کے ان الفاظ پر ان تینوں کا دل دھک سے رہ گیا۔

”کب ہوا یہ سانحہ؟“ جواد نے بھنجی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

”چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ میں محترم حماد کا قاصد ضرور ہوں لیکن آپ کے شائستہ اطوار اور رکھ رکھاؤ سے

١٠
 ١١
 ١٢
 ١٣
 ١٤
 ١٥
 ١٦
 ١٧
 ١٨
 ١٩
 ٢٠
 ٢١
 ٢٢
 ٢٣
 ٢٤
 ٢٥
 ٢٦
 ٢٧
 ٢٨
 ٢٩
 ٣٠
 ٣١
 ٣٢
 ٣٣
 ٣٤
 ٣٥
 ٣٦
 ٣٧
 ٣٨
 ٣٩
 ٤٠
 ٤١
 ٤٢
 ٤٣
 ٤٤
 ٤٥
 ٤٦
 ٤٧
 ٤٨
 ٤٩
 ٥٠
 ٥١
 ٥٢
 ٥٣
 ٥٤
 ٥٥
 ٥٦
 ٥٧
 ٥٨
 ٥٩
 ٦٠
 ٦١
 ٦٢
 ٦٣
 ٦٤
 ٦٥
 ٦٦
 ٦٧
 ٦٨
 ٦٩
 ٧٠
 ٧١
 ٧٢
 ٧٣
 ٧٤
 ٧٥
 ٧٦
 ٧٧
 ٧٨
 ٧٩
 ٨٠
 ٨١
 ٨٢
 ٨٣
 ٨٤
 ٨٥
 ٨٦
 ٨٧
 ٨٨
 ٨٩
 ٩٠
 ٩١
 ٩٢
 ٩٣
 ٩٤
 ٩٥
 ٩٦
 ٩٧
 ٩٨
 ٩٩
 ١٠٠

[illegible]

آجریوار

[illegible]

آجریوار

[illegible]

[illegible]

۱۰۰
 ۱۰۱
 ۱۰۲
 ۱۰۳
 ۱۰۴
 ۱۰۵
 ۱۰۶
 ۱۰۷
 ۱۰۸
 ۱۰۹
 ۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰
 ۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰
 ۲۰۱
 ۲۰۲
 ۲۰۳
 ۲۰۴
 ۲۰۵
 ۲۰۶
 ۲۰۷
 ۲۰۸
 ۲۰۹
 ۲۱۰
 ۲۱۱
 ۲۱۲
 ۲۱۳
 ۲۱۴
 ۲۱۵
 ۲۱۶
 ۲۱۷
 ۲۱۸
 ۲۱۹
 ۲۲۰
 ۲۲۱
 ۲۲۲
 ۲۲۳
 ۲۲۴
 ۲۲۵
 ۲۲۶
 ۲۲۷
 ۲۲۸
 ۲۲۹
 ۲۳۰
 ۲۳۱
 ۲۳۲
 ۲۳۳
 ۲۳۴
 ۲۳۵
 ۲۳۶
 ۲۳۷
 ۲۳۸
 ۲۳۹
 ۲۴۰
 ۲۴۱
 ۲۴۲
 ۲۴۳
 ۲۴۴
 ۲۴۵
 ۲۴۶
 ۲۴۷
 ۲۴۸
 ۲۴۹
 ۲۵۰
 ۲۵۱
 ۲۵۲
 ۲۵۳
 ۲۵۴
 ۲۵۵
 ۲۵۶
 ۲۵۷
 ۲۵۸
 ۲۵۹
 ۲۶۰
 ۲۶۱
 ۲۶۲
 ۲۶۳
 ۲۶۴
 ۲۶۵
 ۲۶۶
 ۲۶۷
 ۲۶۸
 ۲۶۹
 ۲۷۰
 ۲۷۱
 ۲۷۲
 ۲۷۳
 ۲۷۴
 ۲۷۵
 ۲۷۶
 ۲۷۷
 ۲۷۸
 ۲۷۹
 ۲۸۰
 ۲۸۱
 ۲۸۲
 ۲۸۳
 ۲۸۴
 ۲۸۵
 ۲۸۶
 ۲۸۷
 ۲۸۸
 ۲۸۹
 ۲۹۰
 ۲۹۱
 ۲۹۲
 ۲۹۳
 ۲۹۴
 ۲۹۵
 ۲۹۶
 ۲۹۷
 ۲۹۸
 ۲۹۹
 ۳۰۰
 ۳۰۱
 ۳۰۲
 ۳۰۳
 ۳۰۴
 ۳۰۵
 ۳۰۶
 ۳۰۷
 ۳۰۸
 ۳۰۹
 ۳۱۰
 ۳۱۱
 ۳۱۲
 ۳۱۳
 ۳۱۴
 ۳۱۵
 ۳۱۶
 ۳۱۷
 ۳۱۸
 ۳۱۹
 ۳۲۰
 ۳۲۱
 ۳۲۲
 ۳۲۳
 ۳۲۴
 ۳۲۵
 ۳۲۶
 ۳۲۷
 ۳۲۸
 ۳۲۹
 ۳۳۰
 ۳۳۱
 ۳۳۲
 ۳۳۳
 ۳۳۴
 ۳۳۵
 ۳۳۶
 ۳۳۷
 ۳۳۸
 ۳۳۹
 ۳۴۰
 ۳۴۱
 ۳۴۲
 ۳۴۳
 ۳۴۴
 ۳۴۵
 ۳۴۶
 ۳۴۷
 ۳۴۸
 ۳۴۹
 ۳۵۰
 ۳۵۱
 ۳۵۲
 ۳۵۳
 ۳۵۴
 ۳۵۵
 ۳۵۶
 ۳۵۷
 ۳۵۸
 ۳۵۹
 ۳۶۰
 ۳۶۱
 ۳۶۲
 ۳۶۳
 ۳۶۴
 ۳۶۵
 ۳۶۶
 ۳۶۷
 ۳۶۸
 ۳۶۹
 ۳۷۰
 ۳۷۱
 ۳۷۲
 ۳۷۳
 ۳۷۴
 ۳۷۵
 ۳۷۶
 ۳۷۷
 ۳۷۸
 ۳۷۹
 ۳۸۰
 ۳۸۱
 ۳۸۲
 ۳۸۳
 ۳۸۴
 ۳۸۵
 ۳۸۶
 ۳۸۷
 ۳۸۸
 ۳۸۹
 ۳۹۰
 ۳۹۱
 ۳۹۲
 ۳۹۳
 ۳۹۴
 ۳۹۵
 ۳۹۶
 ۳۹۷
 ۳۹۸
 ۳۹۹
 ۴۰۰
 ۴۰۱
 ۴۰۲
 ۴۰۳
 ۴۰۴
 ۴۰۵
 ۴۰۶
 ۴۰۷
 ۴۰۸
 ۴۰۹
 ۴۱۰
 ۴۱۱
 ۴۱۲
 ۴۱۳
 ۴۱۴
 ۴۱۵
 ۴۱۶
 ۴۱۷
 ۴۱۸
 ۴۱۹
 ۴۲۰
 ۴۲۱
 ۴۲۲
 ۴۲۳
 ۴۲۴
 ۴۲۵
 ۴۲۶
 ۴۲۷
 ۴۲۸
 ۴۲۹
 ۴۳۰
 ۴۳۱
 ۴۳۲
 ۴۳۳
 ۴۳۴
 ۴۳۵
 ۴۳۶
 ۴۳۷
 ۴۳۸
 ۴۳۹
 ۴۴۰
 ۴۴۱
 ۴۴۲
 ۴۴۳
 ۴۴۴
 ۴۴۵
 ۴۴۶
 ۴۴۷
 ۴۴۸
 ۴۴۹
 ۴۵۰
 ۴۵۱
 ۴۵۲
 ۴۵۳
 ۴۵۴
 ۴۵۵
 ۴۵۶
 ۴۵۷
 ۴۵۸
 ۴۵۹
 ۴۶۰
 ۴۶۱
 ۴۶۲
 ۴۶۳
 ۴۶۴
 ۴۶۵
 ۴۶۶
 ۴۶۷
 ۴۶۸
 ۴۶۹
 ۴۷۰
 ۴۷۱

[illegible]

۱۰۰
 ۱۰۱
 ۱۰۲
 ۱۰۳
 ۱۰۴
 ۱۰۵
 ۱۰۶
 ۱۰۷
 ۱۰۸
 ۱۰۹
 ۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰
 ۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰
 ۲۰۱
 ۲۰۲
 ۲۰۳
 ۲۰۴
 ۲۰۵
 ۲۰۶
 ۲۰۷
 ۲۰۸
 ۲۰۹
 ۲۱۰
 ۲۱۱
 ۲۱۲
 ۲۱۳
 ۲۱۴
 ۲۱۵
 ۲۱۶
 ۲۱۷
 ۲۱۸
 ۲۱۹
 ۲۲۰
 ۲۲۱
 ۲۲۲
 ۲۲۳
 ۲۲۴
 ۲۲۵
 ۲۲۶
 ۲۲۷
 ۲۲۸
 ۲۲۹
 ۲۳۰
 ۲۳۱
 ۲۳۲
 ۲۳۳
 ۲۳۴
 ۲۳۵
 ۲۳۶
 ۲۳۷
 ۲۳۸
 ۲۳۹
 ۲۴۰
 ۲۴۱
 ۲۴۲
 ۲۴۳
 ۲۴۴
 ۲۴۵
 ۲۴۶
 ۲۴۷
 ۲۴۸
 ۲۴۹
 ۲۵۰
 ۲۵۱
 ۲۵۲
 ۲۵۳
 ۲۵۴
 ۲۵۵
 ۲۵۶
 ۲۵۷
 ۲۵۸
 ۲۵۹
 ۲۶۰
 ۲۶۱
 ۲۶۲
 ۲۶۳
 ۲۶۴
 ۲۶۵
 ۲۶۶
 ۲۶۷
 ۲۶۸
 ۲۶۹
 ۲۷۰
 ۲۷۱
 ۲۷۲
 ۲۷۳
 ۲۷۴
 ۲۷۵
 ۲۷۶
 ۲۷۷
 ۲۷۸
 ۲۷۹
 ۲۸۰
 ۲۸۱
 ۲۸۲
 ۲۸۳
 ۲۸۴
 ۲۸۵
 ۲۸۶
 ۲۸۷
 ۲۸۸
 ۲۸۹
 ۲۹۰
 ۲۹۱
 ۲۹۲
 ۲۹۳
 ۲۹۴
 ۲۹۵
 ۲۹۶
 ۲۹۷
 ۲۹۸
 ۲۹۹
 ۳۰۰
 ۳۰۱
 ۳۰۲
 ۳۰۳
 ۳۰۴
 ۳۰۵
 ۳۰۶
 ۳۰۷
 ۳۰۸
 ۳۰۹
 ۳۱۰
 ۳۱۱
 ۳۱۲
 ۳۱۳
 ۳۱۴
 ۳۱۵
 ۳۱۶
 ۳۱۷
 ۳۱۸
 ۳۱۹
 ۳۲۰
 ۳۲۱
 ۳۲۲
 ۳۲۳
 ۳۲۴
 ۳۲۵
 ۳۲۶
 ۳۲۷
 ۳۲۸
 ۳۲۹
 ۳۳۰
 ۳۳۱
 ۳۳۲
 ۳۳۳
 ۳۳۴
 ۳۳۵
 ۳۳۶
 ۳۳۷
 ۳۳۸
 ۳۳۹
 ۳۴۰
 ۳۴۱
 ۳۴۲
 ۳۴۳
 ۳۴۴
 ۳۴۵
 ۳۴۶
 ۳۴۷
 ۳۴۸
 ۳۴۹
 ۳۵۰
 ۳۵۱
 ۳۵۲
 ۳۵۳
 ۳۵۴
 ۳۵۵
 ۳۵۶
 ۳۵۷
 ۳۵۸
 ۳۵۹
 ۳۶۰
 ۳۶۱
 ۳۶۲
 ۳۶۳
 ۳۶۴
 ۳۶۵
 ۳۶۶
 ۳۶۷
 ۳۶۸
 ۳۶۹
 ۳۷۰
 ۳۷۱
 ۳۷۲
 ۳۷۳
 ۳۷۴
 ۳۷۵
 ۳۷۶
 ۳۷۷
 ۳۷۸
 ۳۷۹
 ۳۸۰
 ۳۸۱
 ۳۸۲
 ۳۸۳
 ۳۸۴
 ۳۸۵
 ۳۸۶
 ۳۸۷
 ۳۸۸
 ۳۸۹
 ۳۹۰
 ۳۹۱
 ۳۹۲
 ۳۹۳
 ۳۹۴
 ۳۹۵
 ۳۹۶
 ۳۹۷
 ۳۹۸
 ۳۹۹
 ۴۰۰
 ۴۰۱
 ۴۰۲
 ۴۰۳
 ۴۰۴
 ۴۰۵
 ۴۰۶
 ۴۰۷
 ۴۰۸
 ۴۰۹
 ۴۱۰
 ۴۱۱
 ۴۱۲
 ۴۱۳
 ۴۱۴
 ۴۱۵
 ۴۱۶
 ۴۱۷
 ۴۱۸
 ۴۱۹
 ۴۲۰
 ۴۲۱
 ۴۲۲
 ۴۲۳
 ۴۲۴
 ۴۲۵
 ۴۲۶
 ۴۲۷
 ۴۲۸
 ۴۲۹
 ۴۳۰
 ۴۳۱
 ۴۳۲
 ۴۳۳
 ۴۳۴
 ۴۳۵
 ۴۳۶
 ۴۳۷
 ۴۳۸
 ۴۳۹
 ۴۴۰
 ۴۴۱
 ۴۴۲
 ۴۴۳
 ۴۴۴
 ۴۴۵
 ۴۴۶
 ۴۴۷
 ۴۴۸
 ۴۴۹
 ۴۵۰
 ۴۵۱
 ۴۵۲
 ۴۵۳
 ۴۵۴
 ۴۵۵
 ۴۵۶
 ۴۵۷
 ۴۵۸
 ۴۵۹
 ۴۶۰
 ۴۶۱
 ۴۶۲
 ۴۶۳
 ۴۶۴
 ۴۶۵
 ۴۶۶
 ۴۶۷
 ۴۶۸
 ۴۶۹
 ۴۷۰
 ۴۷۱

ان کی توہین سمجھتی ہوں۔ مجھ سے یہ سوال دوبارہ کر کے اپنا اور میرا وقت ضائع مت کرنا۔" اس نے مزید رکھائی سے جواب دیا۔

سلمان کو اس کے انداز پر اہانت تو محسوس ہوئی لیکن وجود میں ہلکے سے لپٹی سسٹن اس قدر لذت آمیز تھی کہ کوئی بھی داخلی و خارجی کیفیت فی الوقت اثر پذیر نہیں ہو رہی تھی۔ سلمان کے ان خیالات میں کسی بے ہوش شہرے غفل پیدا کر دیا۔ اس نے چونک کر شور کا مافذ جاننا چاہا تو مزید الجھ گیا۔ اسے بائک خری اسپن پہلو میں بیٹھی دو خواتین کے ساتھ مرستی کرتا دکھائی دیا۔

"یہ سب کیا ہے، کون ہیں یہ عورتیں؟" اس نے بے ساختہ منزل سے دریافت کیا۔

"ان خواتین کے لیے ادب ملحوظ خاطر رکھو۔ یہ دونوں یزدان کی لافانی روح کے ساتھ مسکن جاویدان کی مستورات ہیں۔" منزل نے عقیدت سے بتایا۔

"تو اب یہ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" سلمان مزید الجھ گیا۔ اسے یہ گورکھ دھندلکھنے کے ہی اندر سے رہا تھا۔

"یہ اب لافانی روح کے نئے مسکن کی ملکیت ہیں۔" منزل نے سلمان کی ناگہمی کو تانسف زدہ لگا ہوں سے دیکھا۔

بائک خری اب ان خواتین کو لیے اپنی آرام گاہ کی جانب بڑھ گیا تھا۔ سلمان کے اطراف میں شور مچ خراش صورت حال اختیار کرنے لگا۔ اس شور و غل میں گونجنے والے ہیجان انگیز نعرے سلمان کے ضبط کا امتحان ثابت ہو رہے تھے۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ ہنوز اسی طول کیفیت کا شکار تھی۔

منزل ان دونوں کی کیفیات و تاثرات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

"میں تمہاری دلی الجھن سمجھ رہا ہوں بد بخت!" اس نے کڑک کر سلمان کو مخاطب کیا۔ "یہ لڑکی اب تمہاری ملکیت ہے۔ اعلیٰ حضرت نے جنہیں بطور تحفہ عطا کی ہے۔ اس کے معاملے میں غیر فطری نرمی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

جنہیں اس کے دل میں خوابیدہ جذبے بیدار کرنے ہی ہوں گے۔ اعلیٰ حضرت کہتے ہیں عورت نفس کی تسکین و طلب مرد سے کہیں زیادہ محسوس کرتی ہے۔ اگر تمہاری جانب سے اسے فطری زندگی کی جانب واپس لانے میں کوئی کوتاہی ہوئی تو اعلیٰ حضرت کے غضب و عقاب سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم بد بختی اور زوال کے ایک لامتناہی گرداب میں پھنس کر اپنی زندگی ہی عذاب بنائے گھو۔"

منزل کی اس تنبیہ پر سلمان بے ساختہ جھرمجرا گیا۔ اس نے ہنر پر استغنائی سے اس کی جانب دیکھا اور قدر سے ہار عجب انداز میں کہنے لگا۔

"اپنا یہ رونا دھونا اب بند کر دو تو بہتر ہوگا۔ چلو میرے ساتھ، تمہیں آج سے میرے ہی کمرے میں رہنا ہوگا۔"

اس کے چہرے پر مزید ہراس دکھائی دینے لگا۔ اس ہراس میں پوشیدہ بے بسی، تڑپ اور الجھا لے سلمان کو ایک بار پھر غصے میں مبتلا کر دیا۔ خواب گاہ میں آتے ہی سلمان نے اسے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں بستر پر آرام سے سو جاؤ۔"

"اور تم؟" اس نے بے ساختہ دریافت کیا۔

"میں باہر برآمدے میں سو جاؤں گا۔" سلمان نے نظریں ملائے بغیر جواب دیا اور برآمدے کی سمت چل دیا۔

☆ ☆ ☆

اسانرم و گرم بستر پر لیٹی بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس کے پردہ تصور پر ماضی ترین کے مناظر چب دکھلا کر دل و دماغ میں شدید تلاطم برپا کیے ہوئے تھے۔ والدین کی شفقت، محبت بھری آغوش اور بائک خری کے الٹا کاروں کی جانب سے ان کے قتل کے لمحات آنکھوں میں آنکھیں جلن پیدا کرنے لگے۔

"یا اللہ! میرے ساتھ ہی ایسا کیوں؟ میرے والدین کو مجھ سے کیوں دور کر دیا؟ اگر انہیں مجھ سے جیننا ہی تھا تو مجھے بھی ان کے پاس ہی بھیج دیا ہوتا۔ میں ان جیوانوں کے زہن میں اکیلے رہ کر کس طرح زندگی گزاروں گی؟ میری عزت و آبرو ہمہ وقت خطرے میں ہے۔ کیا کروں میں خدا یا؟ مجھے کوئی رستہ دکھا دے۔ مجھے اتنا ہی بتا دے کہ یہ سب مجھے کن کا ہوں کی منزل راہی ہے؟" اس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس کے دل کو ایک شدید درد کا لگا تھا کہ سلمان کسی بھی لمحے اسے نوچنے کے لیے اکھڑا ہوگا۔ وقت نہایت ست روی اور کربناک انداز میں گزر رہا تھا۔ رات گہری ہونے لگی تو اس کو اپنا دل پھر تاحسوس ہوا۔ وہ بستر سے اتری اور دبے قدموں چلتی کمرے سے باہر چلی آئی جہاں سلمان برآمدے میں بستر بچھے سے کھڑے سنے انداز میں سو رہا تھا۔

اسا یہ منظر دیکھ کر خشک مٹی۔ خوابیدہ سلمان کے چہرے کو بغور دیکھتے وہ کسی بحر کے عالم میں آگے بڑھی اور اس کے قریب ہی دوڑا ہو کر بیٹھ گئی۔ اس لمحے اسے اپنا دل ایک عجیب

انداز میں سلمان کی جانب متوجہ ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اس اس کشش کو کوئی بھی عنوان دینے سے قاصر تھی۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ان حیدان مغت لوگوں کے بائین کوئی فرشتہ صفت انسان بھی موجود ہو سکتا ہے۔ تم یقیناً کسی نیک اور شریف والدین کی اولاد ہو۔ تمہاری تربیت بہترین اور مومن صفت انسانوں نے کی ہوگی۔ کاش تم مجھے اس طہا اور متعفن ماحول کے بہائے کہیں اور لے جاتے تو میں تمہاری قدر دانی کا حق ادا کر پاتی۔ پروردگار تمہاری یہ شرافت اور صالح طبیعت یونہی برقرار رکھے۔" اس نے خود کلاہ کی۔ اس کی آنکھوں سے پہنچنے والے آنسوؤں میں اب ایک نئی شدت آ گئی تھی۔

اگلے کچھ لمحے اسی خاموش گریہ و زاری میں بیت گئے۔ اس کے بعد وہ سر جھکانے کمرے میں واپس چل دی۔ اس کے روانہ ہوتے ہی سلمان نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ اس کے سامنے اب تک خوابیدگی کی اداکاری کر رہا تھا۔

"عورت کے وجود میں شہوانیت بیدار کرنے کے لیے کسی جبر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض اوقات نرم اور لطیف جذبے بھی عورت کا دل موم کر دیا کرتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میں تمہاری رضامندی اور محبت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔" اس نے سرشاری سے سوچے ہوئے کڑوت بدل لی۔

سنگی فرش پر لیٹے بدن کا ہر ایک جوڑ دکھنے لگا تھا لیکن سلمان کو ایسی کسی بھی تکلیف کی پروا نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی سلمان کمرے میں چلا آیا۔ اس کی حورم آنکھیں دیکھ کر اسے بے آسانی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ رات بھر بیدار رہی ہے۔

"میں یہاں کسی کے بھی آنے سے پہلے ہی اندر چلا آیا ہوں۔ بہتر یہی ہوگا کہ بائک خری کا کوئی بھی الٹا کار ہمارے فطرت کی اصل نوعیت نہ بھانپ سکے۔" اس نے اس کا کو وضاحت دی۔

اسا نے تنہی انداز میں سر ہلا دیا۔ سلمان کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ منزل ایک بار پھر ان کے پاس آدھکا۔

"کیسے ہو تم دونوں؟" اس نے آتے ہی سلمان سے معنی خیز انداز میں دریافت کیا۔

"ہم بالکل ٹھیک اور بھرپور مزے میں ہیں۔"

سلمان نے چمک کر جواب دیا۔

"رات کیسی گزری؟" وہ ایک قش اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"بہترین۔" سلمان کا چہرہ نفرت سے سرخ ہو گیا۔

اسا نے تھملا کر ہانسا ہنسا لپکا۔

"میں اعلیٰ حضرت کا ایک پیغام دینے آیا ہوں۔ اگر تم اس عورت کے وجود میں فطری جذبات بیدار کرنے میں ناکام رہے تو تمہارے لیے کسی نئے سماجی کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ اس صورت میں یہ لڑکی کسی ایسے مرد کے حوالے کی جائے گی جو تم سے زیادہ اہلیت کا حامل ہوگا اور اسے یہ آسانی شہوت کی طرف مائل کر لے گا۔"

منزل کی اس بات پر اساتحس ہو گئی۔ کزشتہ شب سلمان کے شرفیاد عمل کے باعث جانے کیوں اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اس کی آبرو کا محافظ ثابت ہوگا۔

"کیا تم میرا ایک جوابی پیغام پہنچا سکتے ہو؟" سلمان نے ایک توقف کے بعد کریمہ صورت سے دریافت کیا تو اس نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں یہاں پر شادی کے معاملات کی تفصیل جانتا چاہتا ہوں۔ مجھے اس لڑکی سے نکاح کرنا ہے۔"

سلمان کی اس بات پر منزل نے زوردار تہقہہ لگایا اور دو ٹوک انداز میں کہنے لگا۔

"یہاں شادی کے معاملات کا کوئی روان نہیں ہے۔ یہاں دلی رضامندی کو ہی سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اگر مرد اور عورت دلی طور پر ایک دوسرے کو قبول کر لیں تو اس کے بعد کی شادی یا نکاح کی گنجائش نہیں بچتی۔"

"لیکن ہماری بات بھی تو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم نے ساری زندگی ایک مخصوص ماحول میں بسر کی ہے۔ ہم اپنے رسم و رواج اور اخلاقیات کے پابند ہیں۔ ان سے مت موڑ کر زندگی بسر کرنا ممکن نہیں ہے۔" سلمان نے اسے سمجھانا چاہا۔

"اعلیٰ حضرت کے لیے ان دلائل کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔" منزل نے اسے متنبہ کیا۔ "ان کے وضع کردہ اصول بالکل فطری ہیں۔ لطف و لذت ہی اصل زندگی ہے۔ تم دونوں بے حد خوش قسمت ہو کہ انہوں نے خود تمہیں ایک دوسرے کے لیے منتخب کیا ہے۔ اگر تمہارے دل و دماغ اس باہمی فطرت کے لیے مائل نہیں ہوتے تو متبادل سماجی فراہم کر دیے جائیں گے۔ یہ سماجی تمہارے لیے بہترین لذت کا سامان ہوں گے۔ اس لیے شادی یا نکاح کی سوچ اپنے ذہن سے نکال دو تو بہتر ہے۔"

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

”میں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے
 بول کر فوراً بھاگ رہا۔ ”ہمارے دل و دماغ ایک دوسرے
 کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ بس ہمیں تھوڑا سا وقت دو۔ ہم
 اپنے رسم و رواج کی قید سے آزاد ہو جائیں گے۔ زندگی بھر
 ان اصولوں کے ساتھ جینے کے بعد رہائی کے لیے کچھ تو
 وقت درکار ہو گا۔“

”ٹھیک ہے، لیکن زیادہ وقت نہیں دیا جائے گا۔
 تمہیں بہر صورت اپنے وجود کو لذتِ آتشا کر کے فطرت کے
 خلاف پہنچی گئی ان بندشوں کا خاتمہ کرنا ہو گا۔“ منزل نے
 ایک بار پھر متنبہ کیا۔

سفیان نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی کمرے
 سے روانگی کے بعد اس کی آنکھیں دوبارہ برسنے لگیں۔
 ”یہ تم نے کیا کہہ دیا اسے؟“ سفیان نے نرمی سے
 دریافت کیا۔

”میں نے صرف یہ وقت ملنے کے لیے ایسا کہا
 ہے۔“ اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

”تم یہاں پر کتنے عرصے سے قیام کیا تم نے فرار
 کا کوئی طریقہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے؟“ سفیان نے
 استفسار کیا۔

”یہاں سے رہائی یا فرار کا طریقہ صرف موت ہے۔
 اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔“ اس نے روتے ہوئے
 جواب دیا۔

سفیان گہری سانس بھر کے خاموش ہو گیا۔ انہی
 لاتناہی سوچوں میں الجھ کر دن نہایت سرعت سے بیت گیا۔
 شام کے سیاہ آجلیں اڑھتے ہی اس کی رنگت خستہ ہونے لگی۔
 بے آبردی کا خدشہ ایک بار پھر اپنے نکیلے پنجوں سے اس
 کے روح و قلب کو اضمحلت کرنے لگا۔

”تم کل نہ کرو۔ میں آج رات بھی باہر برآمدے میں
 ہی بسر کروں گا۔“ سفیان نے تنہائی سے اسے مخاطب کیا۔
 ابا کو اپنی رکتی سانسیں بحال ہوتی محسوس ہوئیں۔
 اس نے کچھ کہنے کے ارادے سے لب دا کیے ہی تھے کہ
 سفیان نے رکھائی سے کہا۔

”اپنی خود ساختہ انسانیت لیے برآمدے میں آنے
 کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تمہیں میری شرافت، والدین کی
 صراحہ طبعیت یا ان کی جانب سے فراہم کردہ تربیت پر واقعی
 اعتبار ہوتا تو تم مجھے برآمدے میں سونے سے روک کر خود
 یہیں سو جانے کی پیشکش کرتیں۔“

اس کا وجود شل ہو کر رہ گیا۔ اس نے سفیان سے

نظریں چراتے ہوئے اپنے گھٹنوں میں سر جھپایا۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح کا آغاز حسب سابق تھا۔ منزل ایک بار پھر ان
 کے لیے مجبوریں اور میوہ جات لے آیا۔ اس ناشتے کے
 دوران وہ مسلسل ان کے سر پر ہی سوار رہا۔ اس کی تیز اور
 چھپتی نگاہیں اس کے بشرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس
 اپنے وجود میں شدید اضطراب محسوس کرنے لگی۔ سفیان کے
 دماغ میں بھی خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ منزل یقیناً ان دونوں
 کے انداز و اطوار سے گزشتہ شب بیٹنے والی رومانوی
 سماعتوں کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا جو ظاہری بات
 ہے ان دونوں میں بالکل متفاوت تھیں۔

سفیان کا دل شدت سے ہلکنے لگا۔
 ”آہ..... یہ رات اتنی جلد ختم کیوں ہو جاتی ہے؟ اس
 رات کے انتظار میں اب یہ دن کا لے نہیں کتنا۔ آہ، اس اہم
 نے مجھے یہ کس خسار میں مبتلا کر دیا ہے؟“ اس کا لہجہ محمور
 ہو گیا۔

اس کے ہونٹ حیرت سے وا ہو گئے۔ چہرے پر
 شدید بے چینی جھلکی اور اگلے ہی لمحے آنکھوں میں ٹیش کی
 چنگاریاں پھوٹ اٹھیں۔ سفیان اس کی کیفیات پر گڑبڑا کر
 رہ گیا۔

”ارے احق لڑکی! تو سمجھ کیوں نہیں رہی کہ میں یہ
 سب تیری ہی بھلائی کے لیے کر رہا ہوں۔“ اس نے اپنی سچی
 آنکھوں سے پیغام دینا چاہا لیکن بے سود۔
 اس کا تھنس بے ربط ہونے لگا۔ منزل نے معنی خیز
 نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور قدرے سرد مہرہ انداز
 میں سفیان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

”کیا تو نے اعلیٰ حضرت کے فرشتوں کو احق سمجھ رکھا
 ہے؟ تو کوئی بھی کہانی گھڑے گا اور ہم اس پر یقین کر لیں
 گے؟ میں تو کمرے میں آتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکی ہنوز
 لذت سے آشنا نہیں ہو سکی۔“

سفیان کی رنگت خستہ ہو گئی۔ منزل نے تاسف و تنفر
 سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے اپنا رخ اس کی جانب کر لیا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں نالڑکی؟“

سفیان نے بھی فوراً اس کی سمت دیکھا۔ وہ اپنی
 آنکھوں کے خفیف اشارے سے اسے مصالحت اختیار
 کرنے کا عندیہ دینا چاہتا تھا لیکن اس اس کی جانب متوجہ ہی
 نہیں تھی۔ اس نے اپنی نظریں کریمہ صورت کی نگاہوں میں
 گاڑتے ہوئے سرد مہری سے جواب دیا۔

آخری وار

”ہاں، تم بالکل سچ کہہ رہے ہو۔ مجھے میری مرضی کے
 خلاف کوئی بھی شخص حاصل نہیں کر سکتا اور اگر کسی نے جبراً ایسا
 کرنے کی کوشش بھی کی تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔“

سفیان کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کو شالوں سے پکڑ کر
 جھنجھوڑ ڈالے۔ وہ اپنی حیاقت سے ان دونوں کے لیے ہی
 ایک مہلک گڑھا کھود رہی تھی۔

”یعنی تم دونوں اعلیٰ حضرت کے احکامات کی خلاف
 ورزی کر رہے ہو؟“ منزل نے ٹیش سے استفسار کیا۔

”نہیں، میں اسے احکامات دینے کے قائل ہی نہیں
 سمجھتی تو خلاف ورزی کیسی؟ تم جاہلو تو میرا پیغام پہنچا دینا کہ
 کوئی بھی شخص مجھ سے باقاعدہ شرعی طریقے سے منسوب
 ہونے کے بعد ہی میرے بدن کو ہاتھ لگا سکتا ہے۔“ وہ
 رکھائی سے بولی۔

”کیا تم اس کی سزا جانتی ہو؟“ منزل کے چہرے کے
 عضلات تن کھلے۔

”مرگ سے زیادہ سزا کیا ہو سکتی ہے بھلا؟ میں یہ سزا
 ہنسی خوشی لینے کے لیے تیار ہوں۔“

اس کے اس بے خوف جواب پر سفیان سخت
 اضطراب محسوس کرنے لگا۔

”تمہیں اس جسارت اور اعلیٰ حضرت سے دروغ
 گوئی کا صلہ بہت جلد مل جائے گا۔“ منزل متنبہ کرتے ہوئے
 کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کی روانگی کے بعد سفیان دانت پیٹتا ہوا اس کی
 جانب متوجہ ہو گیا۔

”میں نے تم جیسی احق لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔“

”تم جسے حیاقت کہہ رہے ہو، وہ میرے لیے اپنی
 آبرو کی پاسداری ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”اگر تم اس وقت میری ہاں میں ہاں ملا دیتیں تو
 حالات تبدیل ہو سکتے تھے۔“ سفیان زچ ہو گیا۔

اس کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا۔

”میرا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی
 گھناؤنے جھوٹ کا حصہ بنوں۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔

سفیان کو اس کے انداز پر سخت امانت محسوس ہوئی۔ وہ
 ٹیش زدہ ہو کر آگے بڑھا اور اس کے بال دیو جھپکے۔ اس نے
 گھبراہٹ میں اپنی آنکھیں میچ لیں۔ وہ بہت جاہلوئی لگ رہا تھا۔

اس کی گھبراہٹ اور لرزش نے سفیان کو سکھ کر دیا۔ اس کے
 بدن کی خوشبو میں ایک عجیب محروم گند بھری انہایت محسوس
 ہوئی تھی۔ سفیان کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ بایک غریبی کے

قصر میں عود آنے والی سنٹی لمحہ بھر میں ہی غالب آگئی۔ اس
 نے اپنے ہونٹ اس کے چہرے اور گردن سے ہم کلام
 کر دیے۔ ریشمی لیس اور مسکون خوشبو نے سنٹی مہینہ تر کر دی۔
 اس نے اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے اپنے بدن کو کئی
 بار جھٹکے دیے لیکن سفیان کی دھشت سوا ہو چکی تھی۔

”میری ہو جاؤ اس! اپنی ضد چھوڑ دو ورنہ یہ لوگ
 تمہیں کسی اور کے حوالے کر دیں گے۔“ سفیان نے سرگوشی
 میں کہا۔

”ہرگز نہیں۔ اس اتنی کمزور نہیں ہے۔ میری
 رضامندی اور کسی بھی شرعی رشتے کے بغیر کسی نے مجھے
 اپنانے کی کوشش کرنا چاہی تو میں خودکشی کر لوں گی۔“

اس کے انداز میں پوشیدہ اس دھمکی نے سفیان کا جوش
 ودھشت سرد کر دیے۔

”مجھے افسوس ہے کہ تم نے حالات سے سمجھو تاکر نہ
 کی دانش مندی نہ دکھائی۔ تم موت کو ایک کھیل سمجھتی ہو جبکہ
 حقیقت یہ ہے کہ موت کو سامنے دیکھتے ہی بڑے بڑوں کا ہاتھ
 پانی ہو جاتا ہے۔“

”وقت آنے پر تم یہ بھی دیکھ لو گے۔“ اس نے بے
 نیازی سے جواب دیا۔

سفیان نے ٹیش سے اس کی جانب دیکھا اور اپنے
 وجود میں اٹھنے والی سنٹی پر قابو پاتے ہوئے ایک نئے
 خیال کی بابت سوچنے لگا۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح بے حد روشن اور گھمری ہوئی تھی۔ منزل حسب
 سابق کھانا لے کر آیا تو سفیان نے تنہائی سے کہا۔

”اپنے آقا سے کہنا میں ان کے تجھے کی قدر کرتا ہوں
 لیکن میں اب اس لڑکی کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔ اگر
 میرے لیے کسی متبادل ساتھی کا بندوبست ہو جائے تو اس
 ذہنی آزار سے نجات مل جائے گی جس میں ابھی مبتلا ہوں۔“

منزل کا چہرہ خوشی سے چمکانے لگا۔

”تم نے ایک بہترین فیصلہ کیا ہے۔ اپنی فطرت کو
 رسم و رواج کی بندش سے آزاد کر کے ہی زندگی سے لطف
 اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ میں اعلیٰ حضرت تک تمہارا یہ پیغام
 پہنچا دوں گا۔“

منزل کے روانہ ہوتے ہی اس نے کسی بیوی شیرینی کا
 روپ دھار لیا۔

”تم ایک فرحی انسان ہو۔ تمہاری وہ شرافت محض
 ایک ڈھونگ تھی۔ تم اپنے اس ڈھونگ کے ذریعے مجھے متاثر



انوکھا گدھ

وطن کی خاطر دشمنوں کی زہریلی سازشوں کے خلاف ڈٹ جانے والے محافظوں کی دلیرانہ کارروائی۔ ایچ اقبال کے قلم سے

جنگل

جنگل کا قانون انسانی معاشرے میں درجہ تو پھر تہذیب مرجاتی ہے۔ انسان اور انسانیت کی تذلیل کرنے والے درندوں سے لڑا جانے والے نوجوان کی داستان جدوجہد

ذہن

قدم قدم پر بڑھتی مصیبتوں کا معتبہ کرنے والے ایک دلیر نوجوان کی کوچ گردی

خسام بیٹا کے قلم سے سلسلے وار کہانی

سورج کے رنگ

اس نے اپنے دل میں اس وقت گلشن سب یا جب بہاروں نے بے رخی کی۔ غلام قادر کے قلم کی عاشقی

پیرلارنگ

اس نے اپنے دل میں اس وقت گلشن سب یا جب بہاروں نے بے رخی کی۔ غلام قادر کے قلم کی عاشقی

دوسرا رنگ

قتل کی ایسی واردات جس میں قاتل رگے ہاتھوں پڑا گیا تھا مگر... عبدالرب بھٹی کی دل نگاہ تحریر

جینی ٹیکٹ جینی

آپ کے تجربے... مشورے... نصیحتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

دیر برآمد کے کیڑیوں پر بیٹھا اپنی خادار سوچوں میں الجھا بیٹھا رہا۔
 ”میں کیوں بیٹھے ہوں؟“ منزل کی آواز نے سفیان کو اپنے خیالات سے چونکا دیا۔
 ”اندر میرا دم گھٹ رہا تھا۔“ اس نے بے بسی سے جواب دیا۔
 منزل کے ہوتوں پر ممتی خیر مسکراہٹ ابھرا آئی۔
 ”یہ ٹھنک کرے میں نہیں بلکہ تمہارے وجود میں پھیلی ہوئی ہے۔“
 ”ہاں، شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ میں اس محسن کا بوجھ اٹھائے تھنے لگا ہوں۔“ سفیان نے بے بسی سے اعتراف کیا۔
 ”اگلی حضرت کے زیر سایہ کوئی ایسی محسن اور تھکاوٹ کا شکار نہیں ہو سکتا۔ ان کی روحانی داہا ہی صلاحیتوں نے تمہارے وجود پر سایہ کر دیا ہے۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہارا خصوصی خیال رکھتے ہوئے یہاں بستی کی مکمل سیر کرواؤں۔“ وہ تافخر سے بولا۔
 ”یہ تو اچھی بات ہے۔ میں بھی خرمیہ معاشرے کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ سفیان پرجوش ہوا۔
 منزل نے اسے اپنے ہمراہ لیا اور مختلف پتہ و دم سے ہوتا بستی کی جانب چل دیا۔ سفیان ہر ایک شے اور منظر کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اسے وہاں موجود افراد میں ایک واضح نگاہ اور بھائی چارہ محسوس ہوا۔ وہ بلا درودہ دیکھ باہمی اشیاء کا استعمال کر رہے تھے۔ منزل اسے مختلف مقامات کے پس منظر سے آگاہ کرنے لگا۔ سفیان اس مسافت کے دوران اپنے اعصاب میں واضح لطافت محسوس کرنے لگا۔
 کچھ ہی دیر بعد منزل یکدم ٹھنک کر رُک گیا۔ سفیان نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا تو ایک ادھیڑ عمر شخص کو تیزی سے اپنے قریب آتے دیکھ کر چونک گیا۔
 ”میں مج سے آپ ہی کی تلاش میں تھا۔“ اس شخص نے منزل کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”کیسے ہو صابر؟ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟“ منزل متانت سے مسکرایا۔
 ”آپ کے طفیل بہت پُر سکون اور سرشار و مطمئن ہوں۔“ صابر عقیدت سے کہنے لگا۔
 ”گلتا ہے کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہو؟“ منزل کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔
 ”جی ہاں۔۔۔ اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس قدر

کرنا چاہتے تھے۔“
 ”تم نہایت حق لڑکی ہو۔ تمہیں دنیا کی پہچان ہی نہیں ہے۔“ سفیان نے سرد مہری سے جواب دیا۔
 اس کا جوش بلب بلب مہری سے سرد ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسوؤں نے مسکن بنالیا۔
 ”ہاں، شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ میری دنیا صرف میرے والدین تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی شناخت کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔“
 ”لیکن تمہارے والدین نے تمہیں اتنا تو سمجھایا ہی ہوگا کہ خود کو حالات کے مطابق کس طرح ڈھالتے ہیں۔ تمہاری حماقت نے ہی ہمیں اس مصیبت میں مبتلا کیا ہے۔“ سفیان کی اس صاف گوئی پر اس کا چہرہ سخت سے سرخ اور ضبط کا بیانیہ پل بھر میں ہی لبریز ہو گیا۔
 ”مجھے جیسا اگلی نسب لڑی پر یہ وقت بھی آنا تھا کہ کیسے کیسے لوگوں کی باتیں برداشت کرنا پڑ رہی ہیں۔“
 ”میں بھی کوئی گرا پڑا شخص نہیں ہوں۔ میرا حسب نسب معمولی مت بھگتا۔“ سفیان نے رکھائی سے جواب دیا۔
 اس کے بعد ان دونوں میں خاموشی کی ایک دیوار حائل ہو گئی۔ کچھ لمبے اسی سکوت میں گزر گئے۔
 ”اب کیا ہوگا سفیان؟“ اس کا سراپا آواز نے اس سکوت کا خاتمہ کیا۔ ”کیا وہ مجھے کسی اور مرد کے حوالے کر دیں گے؟“
 ”ہاں، اور تم اسی سلوک کی حقدار ہو۔ تمہیں کسی کی محبت و غلوں کی پہچان ہی نہیں ہے۔ ایسے لوگ زندگی میں ہمیشہ ماری کھاتے ہیں۔“
 ”محبت!۔۔۔! اس کا رخسار دھک اٹھے۔ ”کیا تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو؟“
 ”ہاں، مجھے تمہاری ذات میں ایک انوکھی کشش محسوس ہوتی ہے۔ اگر تم سے محبت نہ ہوتی تو اب تک تمہیں جسمانی لذت سے آشنا کر چکا ہوتا۔“ سفیان نے صاف گوئی سے کہا۔
 ”میری مرضی کے خلاف ایسا کرنے کی صورت میں سنگین سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ اس کی ہٹ دھرمی عود آئی۔
 سفیان نے جھنجھلاہٹ زدہ نگاہ اس کے منہ پر ڈالی اور پاؤں پٹختا کر سے باہر چل دیا۔
 ☆☆☆
 سفیان کی جھنجھلاہٹ اب دھیرے دھیرے کوفت میں منتقل ہونے لگی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکلا اور کتنی ہی

واضح عید کی محسوس کرنے لگا تھا۔

”یہ خوش نصیب نوجوان کون ہے جسے آپ کی ہمراہی میں بستی کا سفر نصیب ہو رہا ہے۔“ اس نے عقیدت سے منزل کی جانب دیکھا۔

”یہ ہمارا مہمان ہے۔“ منزل نے معنی خیزی سے سفیان کی جانب دیکھا۔

عورت کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

”اپنے مہمان کی خاطر تواضع کا موقع ہمیں بھی دیجیے۔ ہمارے لیے اس سے زیادہ خوش نصیبی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے؟“

منزل نے اثبات میں سر ہلایا اور عورت کی معیت میں اس کے گھر کی جانب چل دیا۔ سفیان کے پاس خاموش تھلید کے سوا کوئی راہ نہ تھی۔ عورت نے انہیں نہایت ادب و احترام سے نشست پر بٹھایا اور اٹھاتی ہوئی اندرونی سمت چل دی۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ ایک کم عمر لڑکی کی معیت میں دوبارہ نمودار ہوئی تو اس کے ہاتھوں میں ایک ٹشتری میں رکھی کئی چندر کا پیاں بھی موجود تھیں۔

”خدیجہ! یہ سب مہمانوں کی خدمت میں پیش کرو۔“ اس نے لڑکی کو طاعت سے مخاطب کیا۔

سفیان کی نگاہیں اب خدیجہ نامی اس لڑکی پر مرکوز تھیں جس کے نقوش میں اپنی والدہ ہی کی جھلک تھی۔ اس کا پڑشاپ سراپا کسی بھی ذی ہوش کی بصارت چکا چونہ کرنے کے لیے لگا تھا۔ خدیجہ کی عمر کے عالم میں آگے بڑھی اور سفیان کے سامنے دوڑا دوڑا بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں بھی سفیان کے پڑشاپ چہرے اور مضبوط کسرتی جسم پر ہی مرکوز تھیں۔ ان آنکھوں سے جھٹکنے والے جذبے سفیان کے دل میں ایک میٹھی میٹھی لذت پیدا کرنے لگے۔ یہ لذت بے حد انوشی اور مستی خیز تھی۔

”کیا یہ مہمان ہمارے معاشرے کا حصہ بن چکا ہے؟“ آمنہ نامی اس عورت نے دریافت کیا۔

”ابھی نہیں..... لیکن جلد ہی بن جائے گا۔“ منزل کے ہونٹوں پر ایک پُر اعتماد مسکراہٹ ابھری۔

خدیجہ نے ایک رکابی سے کٹے ہوئے پھل کا ٹکڑا اٹھایا اور سفیان کے ہونٹوں تک لے جاتے ہوئے کہنے لگی۔

”اتنا تکلف کیوں برت رہے ہیں؟ کیا ہماری خاطر تواضع میں کوئی کمی محسوس ہو رہی ہے؟“

سفیان کا بدن سستا کر رہ گیا۔ اس نے بے اختیار وہ ٹکڑا نگل لیا۔ خدیجہ نے اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلیاں

پھیریں اور دوسری رکابی منزل کے سامنے کر دی۔ خدیجہ کا لہس اور آنکھوں سے جھٹکنے والی بے باک خود پیرہنی سفیان کو حواس باختہ کرنے لگی۔ وہ گاہے گاہے کوئی نہ کوئی شے اس کی سمت بڑھا کر چہرہ، ہونٹ چھوئی اور انگلیاں اپنے ہی لبوں سے مس کر لیتی۔ سفیان کے بدن کا سارالہ بود و بار میں سمٹ آیا۔

”اس مہمان کو ازی کا موقع دوبارہ کب دیں گے؟“ آمنہ نے بوقتِ رخصت پوچھنا شروع کیا۔

منزل نے کچھ کہنے کے لیے لب دایکے ہی تھے کہ خدیجہ بے قابو ہو کر آگے بڑھی اور سفیان سے بغلگیر ہو کر اپنے ہونٹ اس کے چہرے سے ہم کام کر دیے۔ اس کے گداز بدن کا لمس سفیان کے دل و دماغ میں قیامت برپا کر گیا۔

”میں اس نوجوان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“ اس نے بے ربط شخص کے درمیان منزل کو مخاطب کیا۔

”اعلیٰ حضرت کی اجازت کے بغیر یہ کام ممکن نہیں۔“ منزل نے کندھے اچکائے۔ اس کی آنکھوں میں تیز چمک ابھرا آئی۔

”میں ان سے التجا کر لوں گی۔ ان کے پاؤں پکڑ لوں گی۔“ وہ مزید بے تاب ہوئی۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم اپنی فطرت کے سامنے بند نہیں باعہد رہیں اور دل میں اٹھنے والے جذبات کا کسی بھی منافقت کے بغیر برملا اظہار کر رہی ہو۔ میں اعلیٰ حضرت کے سامنے تمہاری التجا پیش کر دوں گا۔“ وہ فاضی سے کہنے لگا۔

سفیان کے دل و دماغ میں جاری جنگیں یکسو ہو کر اب ایک فوج پر منتج ہو گئی تھیں۔ خدیجہ ایک بار پھر فطرطہ جذبات میں سفیان سے بغلگیر ہو گئی۔

”مجھے امید ہے آج رات ہم دونوں ہی کے لیے یادگار ثابت ہوگی۔“ اس نے بیجان انگیز سرگوشی کی۔

سفیان نے بھی بے قابو ہو کر اس کے گرد اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

☆☆☆

اس سہ پہر منزل نے سفیان کو رہائش گاہ پر رخصت کیا تو وہ ایک قطعی تبدیل شدہ شخص تھا۔ اس کے وجود میں بیجان، مستکی اور طلب کا حلاطم برپا ہو چکا تھا۔ کمرے میں آتے ہی اس کی آرزوہ صورت دیکھ کر سفیان کو فٹ زدہ ہو گیا۔ اس نے اس کا نظیر انداز کرنے میں ہی عافیت سمجھی اور بستر پر دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔ چشم تصور میں خدیجہ کی

آخری وار

خود پیرہنی اور بے باکی ایک بار پھر اپنی چھب دکھلانے لگی۔ اپنے خیالات میں غلطیاں سفیان کو اندازہ ہی نہ ہوا کہ اس کی کیفیات کا بغور جائزہ لے رہی ہے۔ وہ اپنی کم سنی اور نا تجربہ کاری کے باوجود سفیان کی ”مندیلی“ پہل بھر میں ہی بجا بن گئی۔ اس کے دل میں کئی بار سفیان سے بات چیت اور اپنے مبینہ مستقبل کی بابت گفتگو کی خواہش بیدار ہوئی لیکن نسوانی اتار اور قارڈے آ گیا۔

شام کے سامنے گہرے ہوئے تو دروازے پر ایک مانوس دسک کی آواز سے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کا وجدان بھانپ گیا تھا کہ بیرونی سمت منزل موجود ہے۔ اس کا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اگلے ہی لمحے منزل ایک پڑشاپ حینہ کے ہمراہ اندر چلا آیا۔ اس حینہ کی دید نے سفیان کے وجود میں برقی رودرد ڈالی۔

”خدیجہ! تم یہاں؟ میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔“ وہ بیجانی انداز میں کہتا ہوا اس کو یکسر ایک اجنبی محسوس ہوا۔

خدیجہ کسی پچیلی شاخ کی طرح چلتی سفیان کی جانب بڑھی اور نہایت بے باکی سے اپنی بانہیں اس کی گردن میں حائل کر دیں۔

”اعلیٰ حضرت نے مجھے کچھ روز تمہارے پاس رہنے کی اجازت دے دی ہے۔“

سفیان کا چہرہ خوشی و جوش سے تھمتا اٹھا۔ وہ فطرطہ جذبات سے گنگ ہو کر رہ گیا۔

”ہمارے آقا اس وقت کچھ اہم انتظامی امور میں مصروف ہیں۔ وہ تم سے بہت جلد ملاقات کریں گے۔ اس کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ صادر ہوگا۔“ منزل نے سفیان سے مخاطب ہو کر کہا۔ نگاہیں البتہ اس کے بے چین چہرے پر بھی مرکوز تھیں۔

خدیجہ نے نمون نگاہوں سے منزل کی جانب دیکھا اور اسے رخصت کرنے کے لیے ازراہ اخلاق دروازے تک چلی آئی۔

”فکار اس وقت بہت بے تاب ہے۔ تمہیں اپنا کردار بخوبی سمجھنا ہوگا۔“ منزل نے اسے سرگوشی میں کہا۔

”آپ نے فکر نہیں۔ میرے وجود میں اس شخص کے لیے طلب معنوی ہرگز نہیں ہے۔ اسے کسی بھی موڑ پر رہتی بھر شک نہیں ہوگا۔“ خدیجہ نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

منزل کے بھدے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ سفیان کو ایک معنی خیز اشارہ کر کے رخصت ہو گیا۔

اس کی روانگی کے بعد خدیجہ کسی طغیانی زدہ نہر کی طرح سفیان کی طرف بڑھی اور اسے بھی اپنے بیجان کی زد میں لے لیا۔ سفیان کے جذبات کا بند پاش پاش ہو چکا تھا۔ اس نے خدیجہ کو اپنی آغوش میں بھرا اور بستر پر بیٹھ کر رقص انیس کا آغاز کر دیا۔ وہ دونوں اپنی اس سرسختی میں اس کا وجود فراموش کر بیٹھے تھے۔ اس ابتدا میں تو اس وحشیانہ میل کو حیرت و خوف سے دیکھتی رہی۔ اس کے بعد جھجھراتے ہوئے آنکھیں بند کیں اور دروازے کی سمت چل دی۔ وہ اس لہجے سے فرار ہو کر برآمدے میں وقت گزارنا چاہتی تھی۔ اس نے وحشت کے عالم میں دروازہ کھولنا چاہا تو اسے بیرونی سمت سے مشغل پاکر مزید سراپا ہوئی۔ یہ کارستانی یقیناً منزل ہی کی تھی۔

اس رات کا ہر ایک لمحہ اس کے لیے بے حد کٹھن تھا۔ وہ کٹھن کی طرح اپنے کٹھنوں میں سر دے کر کانوں پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی۔ اس کے اعضا شل ہو چکے تھے۔ جذبات کی ندی میں طغیانی تھمتے ہی پڑ سکون انداز میں خوابیدہ سفیان اور خدیجہ کا تصور ہی اسے ٹھن میں مبتلا کر رہا تھا۔

اگلی صبح کا آغاز حسب سابق تھا۔ منزل اپنے مقررہ وقت پر ناشتے کے لوازمات تھما کر چلا گیا۔ وہ اس روز قدرے غلٹ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اس کی آنکھ بچا کر برآمدے میں جانا چاہا لیکن منزل نے اسے سختی سے اندر دھکیلا اور دروازہ ایک بار پھر مشغل کر دیا۔ اس وحشیانہ انداز میں دروازہ پیٹنے لگی۔

”مجھے باہر آنے دو۔ اس لہجے میں میرا دم گھٹ جائے گا۔ خدا را! مجھے باہر آنے دو۔“

سفیان کے دل میں تاسف کی ایک لہر اٹھی اور وہ ہچکچاتا ہوا اس کی جانب چلا آیا۔

”کیوں ہلکا ہورہی ہو؟ آؤ ہمارے ساتھ ناشتا کرو۔“ اس نے نرمی سے کہا۔

اسا نے خضر سے اس کی جانب دیکھا اور سر جھکتے ہوئے کہنے لگی۔

”بس یہی تھی تمہاری محبت؟ یہی تھے تمہارے اخلاقیات اور اعلیٰ حسب نسب کے دعوے؟ تمہاری خاندانی شان و شوکت ایک عورت کے سامنے کس قدر آسانی سے ٹکٹ ہو گئی۔ تھ ہے تم پر۔“

سفیان کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا۔ خدیجہ اس کی یہ کیفیت برداشت نہ کر سکی اور اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر ناشتے کی رکابی لے اس کے پاس چلی آئی۔

”خاندانی شان و شوکت، اخلاقیات یا اعلیٰ نسب یہ سب کچھ ہیں کہ فطری تقاضوں کے جبری بند باندھ کر ایک محض زود زعمی بسر کی جائے لیکن خیر، تم ابھی یہ بات نہیں سمجھ پاؤ گی۔ آؤ، ہمارے ساتھ ناشا کر لو۔“ اس نے رکابی اس کی جانب بڑھائی۔

اسانے پیش زدہ ہو کر وہ رکابی دور بھٹکی اور بلا سوچے سمجھے خدیجہ کے چہرے پر تھوک دیا۔ خدیجہ ایک جھگے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر کرب و یکہ کر سفیان کا دماغ الٹ گیا۔ اس نے اس کے رخسار پر ایک ٹھٹھا چیر سید کیا اور غراتے ہوئے کہنے لگا۔

”بہت غرور ہے نا تجھے اپنی پارسائی اور اعلیٰ نسب کا۔ تو یہ بھول گئی ہے کہ ہر غرور کا سر نیچا ہی ہوتا ہے۔ تجھے ایک سبق سکھانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“

”کیا کرنا چاہتے ہو تم؟“ وہ دھشت زدہ ہوئی۔ سفیان نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بازو گرفت میں لیا اور دھشتانہ انداز میں ٹھٹھے ہوئے بستر پر پٹخ دیا۔

”نہیں..... تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ تم تو مجھ سے محبت کرتے ہو نا؟“ اسانے ہر اسان ہو کر دہائی دی۔ سفیان اس کی کوئی بھی دہائی، التجا یا دھمکی سننے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کمرے میں ایک بار بھر سا بھہل کا آغاز ہو چکا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار خدیجہ کی حیثیت تماشا کی تھی۔

جد بات کا طوقان تھا تو غصے سے اس پر غشی طاری ہو چکی تھی۔ سفیان کے وجود کو بھی ایک جالہ خاموشی نے گھیر لیا تھا۔ اسے ایک ملال و غلغلے کا وجہ ہی تانے لگے تھے۔

”تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ اس کے وجود میں برپا انتشار کا خاتمہ کسی اور طرح ممکن نہیں تھا۔ تم نے اسے لذت آشنا کر کے اس کی ذات پر ایک احسان کیا ہے۔“ خدیجہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ملامت سے کہا۔

سفیان کا اضطراب بہر طور کم ہونے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔

”یہ بہت معصوم مفت لڑکی ہے۔ اپنی بے حرمتی برداشت نہیں کر پائے گی۔“ وہ جیز ہوا۔

”تمہاری خام خیالی ہے۔“ خدیجہ نے سر جھکا۔ ”لذت آشنائی کے بعد مرد وزن اس خسار سے گریز نہیں کر سکتے۔“

”لیکن ایک قباحت اور بھی تو ہے۔“ سفیان کو یکدم

یاد آیا۔

خدیجہ سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ ”مجھے منزل سے علم ہوا تھا کہ خرمیہ معاشرے میں دو عورتیں ایک مرد کے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔“

”تم نے بالکل درست سنا تھا۔“ اس نے تائیدی کی۔ ”اگر ایسا ہو تو میرے لیے بہت مشکل صورت حال ہوگی۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں لیکن تمہیں بھی نہیں کھونا چاہتا۔ میرے دل میں تمہارے لیے بھی بے پناہ چاہت پیدا ہو چکی ہے۔“ وہ بے بسی سے بولا۔

”یہ سب باتیں کل ازل وقت ہیں۔“ خدیجہ بھی مضطرب ہوئی۔

”میں با یک خرمی سے التجا کروں گا کہ مجھے کسی طرح اس سے شادی کی اجازت دے دی جائے۔“ سفیان نے کسی خیال کے تحت کہا۔

خدیجہ نے تاسف سے اس کی جانب دیکھا اور تطہیت سے کہنے لگی۔

”بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔ تم اعلیٰ حضرت کو یہ تاثر کیوں دے رہے ہو کہ اس معاشرے کے رسم و رواج کو دلی طور پر قبول نہیں کر پائے ہو۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ یہاں شادی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔“

خدیجہ کی اس بات پر سفیان خشک گیا۔ وہ اسے بھی اپنی اس کھینچ کی بھینک نہیں لگنے دیتا چاہتا تھا۔ خدیجہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر عجیب سے انداز میں پوچھنے لگی۔

”اگر کبھی کوئی ایسا وقت آیا کہ تمہیں ہم دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو تم کیا کر گے؟“

خدیجہ کے اس سوال نے سفیان کو ساکت کر دیا۔ اس کے ذہن میں ایک نئی کشش پیدا ہوئی۔ اسانے اس کا موازنہ از خود ہی کسی شخص حقیقت کی طرح اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ اس کی کم گوئی، سہا سنا انداز، گریز، ہٹ دھرمی، باوقار انداز تو پہلے ہی دل میں گھر کر چکا تھا اور اب خدیجہ کی بے باکی، من زوری، خود پیردی اور دلہانہ پن نے وجود کو ایک عجیب انداز میں جکڑ لیا تھا۔ وہ ایک ہی شب میں خدیجہ کا بے طرح عادی ہو کر اٹوٹے خسار میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس خسار سے دوری کا تصور ہی واضح غلط کشاکش کا رہا تھا۔

”کیا میں نے بہت مشکل سوال کر دیا ہے؟“ خدیجہ کے انداز میں ایک چیخن در آئی۔

”نہیں۔ میں تم دونوں سے ہی محبت کرتا ہوں اور ایسے کسی بھی لمحے میں میرے لیے انتخاب کا مکمل اپنے وجود کا

آخری وار

ایک حصہ الگ کر دینے کے ہی مسادی ہوگا۔“ اس نے بے بسی سے اعتراف کیا۔

”لیکن میں جانتی ہوں کہ اس مرحلے پر کیا ہوگا۔ اسانے خود ہی تمہارے ساتھ رہنے سے انکار کر دے گی۔“ خدیجہ بے ساختہ بولی۔ تاہم اگلے ہی لمحے فوری طور پر سنبھلتے ہوئے کہنے لگی۔

”کیا تم وہی طوڑ پر اعلیٰ حضرت پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو؟“

سفیان کے پاس خدیجہ کے اس سوال کا خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔

”تم اپنی زندگی میں جو بھی فیصلہ کرو لیکن میری ایک بات کبھی فراموش نہ کرنا۔“ خدیجہ نے ہذیانی انداز میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے بے حد محبت کرتی ہوں اور یہ محبت بہت کجبت ہوتی ہے۔ انسان کو ان چاہے کام کرانے پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔“

سفیان اس کے فلسفے پر مزید الجھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

اسانے کا وجود ایک بھیا یک تھیر کی زد میں آچکا تھا۔ اپنی عصمت دری کا احساس ہر لمحہ کچھ لگا یا کرتا۔ سفیان کے لیے بھی اس کی شاک کی نظروں کی تاب لا نامکن نہ ہو رہا تھا۔ اس نے دوبارہ اس کی آبروریزی سے احتراز ہی کیا تھا تاہم خدیجہ سے تعلقات میں مزید شدت آنے لگی تھی۔

اس واقعے کے دو روز بعد خدیجہ اپنا کچھ ضروری سامان لیے منزل کے ہمراہ گھر روانہ ہوئی تو سفیان کی مجرم کی طرح اس کے پاس چلا آیا۔ اسانے نفرت سے منہ موڑ لیا۔

”تمہاری نفرت بالکل بجا ہے اسانے! لیکن ایک بار ٹھنڈے دل و دماغ سے میری بات سن لو۔“ اس نے لجاجت سے کہا۔

”تم اپنے اس کناہ کی کوئی بھی توجیہ پیش نہیں کر سکتے۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

”میں ایسا بالکل نہیں کروں گا۔“ سفیان نے رساں سے جواب دیا۔ ”میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ با یک خرمی کو کسی بھی طرح ہماری شادی کے لیے رضامند کرنے کی کوشش کروں گا۔“

اسانے اس بات پر جو کچھ بغیر نہ رہ سکی۔ اس کے اعصابی تناؤ میں ایک واضح کمی ہوئی۔

”کیا تم واقعی اس شادی کے لیے سنجیدہ ہو؟“ اس کی آواز رندہ گئی۔

”ہاں..... کیونکہ میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔“ وہ بے بسی سے کہنے لگا۔

”یہ کیسی محبت ہے سفیان؟“ اسانے گئی۔ ”یہ کیسی محبت ہے جو ایک عورت کی بے باکی اور بے حیائی کے سامنے فوراً شکستہ ہو جاتی ہے۔“

”کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟“ سفیان نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔

”تمہیں اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ وہ استہزائیہ بنی۔

”تمہارا اعتراف میرا ذہنی بوجھ اور دلی آزار کم کر دے گا اسانے! میں با یک خرمی کے سامنے اپنا مقدمہ بہتر انداز میں لڑ سکوں گا۔“ سفیان کی بے بسی شدید تر ہو چکی تھی۔ اسانے بھر کے لیے خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔ ان آنسوؤں میں کرب، شکستگی، لاچارگی، نسوانی وقار سے محرومی کا دکھ اور کچھ کچھ پندار کے زخم نہاں تھے۔

”ہاں، میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہیں پہلی بار دیکھنے کے بعد میرا دل ایک عجیب انداز میں تمہاری طرف مائل ہوا تھا۔“ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگ گئے۔

”کیا تم اس شادی کے لیے دلی طور پر رضامند ہو؟“ سفیان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اسانے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔ سفیان کو پہلی بار اپنے وجود میں سکون و اطمینان موجزن ہوتا محسوس ہوا۔

☆☆☆

خدیجہ اور منزل کی واپسی نہ پہرڑ ملے ہوئی تو سفیان اسے خالی ہاتھ دیکھ کر خشک گیا۔ خدیجہ کی سنجیدہ صورت بھی اس کے دل و دماغ میں نت نئے خدشات برپا کرنے لگی۔

”تمہارا سامان کہاں ہے؟“ اس نے دریافت کیا۔

”تیار ہو جاؤ تو جوان! تم دونوں کو اعلیٰ حضرت نے اپنے قصر میں طلب کیا ہے۔“ منزل نے سفیان کو مخاطب کیا۔

”صرف ہم دونوں کو؟“ سفیان نے مضطرب ہو کر اس کی جانب دیکھا۔

”اس کے بارے میں حتیٰ فیصلے سے ابھی آگاہ نہیں کیا جائے گا۔“ منزل اس کا مدعا نہایت گیا۔

سفیان نے تنہی انداز میں سر ہلایا اور اسانے کو نظروں ہی نظروں میں دلا سادے ہوئے منزل کے ہمراہ چل دیا۔ اس کے رگ و پے میں شدید اضطراب برپا ہو چکا تھا۔ ہونٹ

مسئل ہے آواز دعاؤں کے لیے حرکت میں تھے۔
بابک خری کے قصر میں اس کے بیروکاروں کا ایک جم
غیر موجود تھا۔ منزل سفیان کو لیے ایک مخصوص گوشے میں چلا
آیا۔ وہ راستے بھر سفیان کے کسی بھی سوال کا جواب دینے
سے گریزاں رہا تھا۔ اسی کے ایما پر خدیجہ نے بھی مکمل
خاموشی اختیار کر لی تھی تاہم اس کے بڑے سے بے بسی اور
بے چینی واضح طور پر جھک رہی تھی۔

سفیان نے زنج ہو کر اس صورت حال کا ذاتی تجزیہ
کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کچھ ہی دیر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ
بابک نے اپنے آپ کی قلعے ”بڑا“ روانگی کا فیصلہ کر لیا ہے۔
وہاں موجود مردوزن اس فیصلے پر بے پناہ جوش و جذبے کا
اظہار کر رہے تھے۔

”ہم آقا بابک کے لیے اپنی زندگی اور خون کا
نذرانہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ ہم بھی اپنے آقا دسولا کے
ہمراہ جائیں گے۔“

عقیدت مندوں کا یہ جوش و جذبہ دیکھ کر بابک خری
کے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے
باوقار انداز میں مجھے سے مخاطب ہو کر کہا۔

”تم سب کی جان و مال میرے لیے بہت قیمتی ہے۔
یہ جذبہ محاذ یونہی برقرار رہنا چاہیے کیونکہ مسادات پر مبنی
ایک سنہری معاشرے کی تشکیل میں یہی جذبہ کارفرما ہوگا۔
تمہاری یہ قربانیاں بھی رانگاں نہیں جائیں گی۔ ان قربانیوں
سے مستقبل میں آنے والی نسلیں مستفید ہوں گی۔ یوں مجھ کو
کہ اس وقت تمہاری حیثیت کسی مجبور کے درخت کی سی ہے
جس سے کئی صدیوں تک نسل انسانی کو استفادہ ہوگا۔“

”ہم آقا دسولا کے لیے ہر حد تک جانے کو تیار ہیں۔“
مجھے میں متفرق شورا بھرا۔

”میں اس جذبے کی بہت قدر کرتا ہوں لیکن عملی طور
پر ایسا ممکن نہیں ہے۔ تم میں سے کچھ افراد کو یہاں رہ کر اس
قلعے کی حفاظت بھی کرنا ہوگی۔ میرے ہمراہ چلنے والے افراد
کو بہر طور بذ کے قلعے کا دفاع کرنا ہوگا کیونکہ بذ ہی وہ مقام
ہے جہاں سے انسانی مسادات اور فطری اصولوں کی کرنوں
سے کھرا سوراخ طلوع ہوگا۔“

سفیان، بابک خری کی اس گفتگو اور مجھے میں کی
جانے والی گروہ بندی کا بہت باریک بینی سے تجزیہ کر رہا
تھا۔ اگلے چند لمحوں میں اسے اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا
کہ اس مجھے کے علاوہ وہاں چار مخصوص گروہ موجود تھے۔
ان گروہوں کا جائزہ لینے کے بعد سفیان کو یہ نتیجہ اخذ کرنا

مشکل نہ ہوا کہ پہلے گروہ میں بابک خری کے مبلغین اور امام
شامل تھے۔ یہ افراد خارجی اور داخلی سطح پر خرمیہ فررتے کے
عقائد کی ترویج کا ذریعہ تھے۔

دوسرا گروہ بابک کے ”فرشیگان“ پر مشتمل تھا۔ ان
افراد کی کارگزاری اور ذمے داریوں کا سفیان نے یہاں
قیام کے دوران بھی کافی جائزہ لیا تھا۔ یہ لوگ نامہ بری کے
علاوہ بابک کی جانب سے تفویض کردہ مخصوص ذمے
داریاں بھی نبھاتے تھے۔

تیسرے گروہ میں سفیان کو ایسے افراد دکھائی دے
رہے تھے جنہوں نے خرمیہ فررتے پر ایمان لانے کا تاحال
باضابطہ اقرار تو نہیں کیا تھا تاہم وہ اس کے عقائد اور اصول
و ضوابط سے کافی حد تک متفق ہو چکے تھے۔

آخری گروہ ایسے افراد پر مشتمل تھا جنہیں بابک کی
جانب سے خصوصی طور پر طلب کیا گیا تھا اور اغلب امکان
یہی تھا کہ بابک انہیں کوئی نہ کوئی اہم ترین ذمے داری
سونپنے والا ہے۔ اس نتیجے پر پہنچتے ہی سفیان کا دل شدت
سے دھڑکنے لگا کیونکہ وہ بھی اسی گروہ کا ہی حصہ تھا۔

”ایسا لگتا ہے بابک خری میری صلاحیتوں اور
شخصیت سے متاثر ہو گیا ہے۔ اسی لیے تو اس نے مجھے کوئی
اہم ذمے داری تفویض کرنے کے لیے بلایا ہے۔ بابک
یقیناً مجھ پر اعتماد بھی کرنے لگا ہے۔“ سفیان کے ذہن میں
ایک خوش گمان سوچ ابھری۔

”میں اپنی باتوں سے اسے شیشے میں اتارنے کی
پوری کوشش کروں گا۔ ایک بار میں اپنے مقصد میں کامیاب
ہو گیا تو اس سے اسامہ اور اپنی شادی کی اجازت لینا مشکل
نہیں ہوگا۔“

اس خوش گمان تصور نے اس کے اعتماد و توانائی میں
خاطر خواہ اضافہ کر دیا۔

انہی سوچوں میں الجھتے اور گرد و لوار کا جائزہ لیتے
ہوئے وقت بیتنے کا اندازہ ہی نہ ہوا اور بابک خری نے
سفیان کو اپنے پاس طلب کر لیا۔ سفیان بردباری اور اعتماد
سے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ بابک کچھ لمحوں تک تیز گہری
نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتا رہا اور پھر سرسراہٹ سے مشابہ لہجے
میں مزل سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

”اس نوجوان کو جو لڑکی سوچنی گئی تھی، اسے میرے
حرم کا حصہ بنایا جائے گا۔ وہ دوشیزہ میرے ساتھ ہی بذ
جائے گی۔“

بابک کے اس حکم پر سفیان کو کسی تازیانے کی سی

ضرب محسوس ہوئی۔ وہ بے اختیار بلبلاتے ہوئے کہہ اٹھا۔
”ایسا کیسے ممکن ہے بھلا؟ آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟“
”خاموش رہو بد بخت!“ مزل نے اسے غصے سے دھکیلا۔
خدیجہ کے چہرے پر بھی سرسراہٹ کی ابھرائی۔

”تم ہمارے آقا دسولا کی بابت ایسا گستاخانہ انداز
اختیار نہیں کر سکتے۔“ مزل کا طیش برقرار تھا۔

”میں نے تو صرف اپنا مدعا بیان کرنا چاہا ہے کہ خرمیہ
دی گئی ایک چیز وہاں لے کر اپنے تصرف میں لے لینا بابک
خری کی ذات کے شایان شان تو نہیں ہے۔“ سفیان نے
قدرے سنبھل کر جواب دیا۔ وہ اس لمبے اپنی کی بھی حماقت
یا جذباتیت سے معاملے میں لگاؤ پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”تم اس قلعے میں ذہن کی حیثیت سے آئے تھے۔
ہم نے تم پر رعایت کرتے ہوئے اس لڑکی کا ہاتھ تھما دیا۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں یہ کہہ کر تمہاری ملکیت پا چکی ہے۔“
بابک نے رکھائی سے کہا۔

”میں اس عنایت پر آپ کا مشکور ہوں۔“ سفیان
نے فوراً جواب دیا۔

”مشکور ہو سکتا ہے اپنی روش ترک بھی نہیں کرنا چاہتے۔
تم لا فانی روح اور خدا کے وجود سے انکاری ہو۔ ایسی
صورت میں ہمارے کسی عہدے کے طالب کیسے بن سکتے ہو؟
تم ایک منکر ہو اور اپنی لا دینی کے ساتھ اس معاشرے میں
زندگی بسر نہیں کر سکتے۔“ بابک پر اس کی عاجزی کا رد نہیں
ہوئی تھی۔

”میں نے تو صرف تمہوڑا مسادقت طلب کیا تھا۔“
سفیان کو اپنے گرد گھیرا تنگ محسوس ہونے لگا۔
”وقت طلب کر کے سوچ بچار میں غرق رہنا منافقت
کی نشانی ہوتی ہے۔ اس کا واضح مطلب یہی ہوتا ہے کہ
انسان کسی سازش کے تانے بانے میں کرا رہے ہے۔“

”بابک نے صاف کوئی سے کہا۔
”میں خرمیہ دین پر ایمان لانے کے لیے تیار ہوں
بلکہ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ مبلغین کے گروہ میں قبولیت
اختیار کر لوں۔“ سفیان نے بات بتانی چاہی۔

بابک کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھرائی۔
”تم نے ہمیں احق سمجھ رکھا ہے شاید؟ مبلغین کے
گروہ میں قبولیت کوئی بچکانہ کھیل نہیں ہے۔ یہ منصب
حاصل کرنے کے لیے ہمارے آئمہ سے ایک سالہ تربیت
حاصل کرنے کے بعد ان کے کڑے امتحانات سے بھی گزرنا

پڑتا ہے۔“
بابک کے اس انکشاف پر سفیان کو اپنا دل ڈوبتا
محسوس ہونے لگا۔ اس کی خوش گمانیوں کا مکمل ایک جھکے سے
زمین بوس ہو گیا تھا۔
”تم لوگ فی الحال ہمارے ساتھ بذ روانہ ہو رہے
ہو۔ جیسی فیصلے بعد میں آگاہ کر دیا جائے گا۔“ بابک نے
سرد مہری سے کہتے ہوئے وہاں موجود چند مبلغین کی جانب
رخ کر لیا۔
سفیان خالی الذہنی کے عالم میں مزل اور خدیجہ کے
ہمراہ چل دیا۔

☆☆☆

اسلمت پر انفرادی سے نیم دراز تھی۔ اس کی نگاہیں
چھت پر مرکوز تھیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی لکیریں بہتی
تھیں۔ جذبہ ہو رہی تھیں۔ ذہنی پرواز سفیان کے کیسے
گئے وعدے کی جانب بھٹکتی تو باپوسی اور انفرادی دہیز تر
ہونے لگتیں۔ وہ اپنی کم سن اور نا تجربہ کاری کے باوجود یہ
حقیقت تسلیم کر چکی تھی کہ خرمیہ معاشرے کے اصول و ضوابط
میں رد و بدل ممکن نہیں ہے۔ بابک خری کے وضع کردہ یہ
قواعد اکل تھے۔ اپنی بے بسی اور آبروریزی کے کرنا تک
لمحات یاد آتے ہی اس کے آنسو فغانی کی حیثیت اختیار
کر گئے۔ اسے اپنا ماضی، گھر بار، والدین شدت سے یاد
آنے لگے۔

”اس گریہ وزاری میں اس پر غشی کی سی کیفیت طاری
ہو گئی۔ اسے سفیان اور خدیجہ کی کمرے میں آمد کا بالکل
احساس نہ ہوا۔ دماغی کیفیت سنبھلتے ہی وہ بستر سے اٹھی تو
اپنی دگرگوں حالت کے باوجود سفیان کے چہرے پر چھایا
تناؤ اور خدیجہ کی آنکھوں میں رشک و حسد کے جذبات محسوس
کیے بغیر نہ رہ سکی۔

”بہت خوش قسمت ہو بھی تم۔ کاش ایسی قسمت مجھے
بھی نصیب ہوئی ہوتی۔“ خدیجہ نے آنکھیں سیکڑتے ہوئے
اسے مخاطب کیا۔

”کیا؟ واقعی؟ بابک خری نے شادی کی اجازت
دے دی ہے؟“ اسامہ سفیان کی جانب متوجہ ہوئی۔ خدیجہ کی
بات سننے کے بعد اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی در آیا تھا۔
”شادی.....؟“ خدیجہ نے بے ساختہ تہقیر لگایا۔

سفیان کی پیشانی بھی عرق آلود ہو گئی۔
”تمہاری خوش بختی کا جواب نہیں اسامہ!“ خدیجہ نے
ایک وقف کے بعد حسرت زدہ انداز میں کہا۔ ”ہمارے آقا

رکنا چاہتا ہوں۔“

”اگر کبھی ایسا وقت آیا تو یہ خوش بختی مجھے ہی حاصل ہوگی۔“ وہ معنی خیزی سے مسکرائی اور سفیان کے چوکنے پر موضوع گفتگو تبدیل کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”مجھے علم ہے تم اساکو تامل کرنے کے لیے تشریف منہ ہو رہے ہو۔ میرے ذہن میں بہر حال ایک منصوبہ موجود ہے۔ تم اسے فی الوقت یہ کہہ کر ٹال سکتے ہو کہ اعلیٰ حضرت نے تمہیں شادی کی اجازت دے دی ہے۔ اب مسئلہ یہ درپیش ہے کہ خرمیہ معاشرے میں نکاح خواں موجود نہیں ہے۔ اس شادی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے تمہیں ایک مختصر سفر کے بعد نکاح خواں کا بندوبست کرنا ہے۔ اس وقت تک اساکو یہاں نہایت صبر و سکون سے وقت گزارنا ہوگا۔“

”کیا تم ہمیں احسن اعظم سمجھے بیٹھے ہو؟“ بابک نے درستی سے جواب دیا۔ ”تمہاری داہنی تک وہ لڑکی یہاں بطور مہمان مقیم رہے گی۔“

سفیان نے چار دن چار اشیات میں سر ملادیا۔

”تمہاری ہم سفر خدیجہ ہوگی۔“ بابک خرمی نے ایک توقف کے بعد کہا۔

”میں دل و جان سے اعلیٰ حضرت کی یہ ذمہ داری نبھائوں گی۔“ خدیجہ نے فرط عقیدت سے جواب دیا۔

خدیجہ کے اس سادہ، مدلل اور جامع منصوبے پر سفیان حیرت و توصیف سے اسے دیکھنے لگا۔

”تم نے تو میری پریشانی ہی حل کر دی۔ مجھے تمہاری محبت اور قربت پر فخر ہے۔“

”وقت آنے پر اپنے ان الفاظ کا بھرم رکھنا سفیان! وہ یکدم سنجیدہ ہو گئی۔

اسا کو قائل کرنے کے لیے الفاظ تراشتے ہوئے سفیان نے اس کی بات ان ہی کر دی۔

☆☆☆
اسا سے ملاقات کے بعد طے شدہ منصوبے کے مطابق قائل کرنا زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا تھا۔ اسما اپنے دل میں پہنچے خدشات سے بے حال رہنے کے باوجود اس حقیقت سے باخبر تھی کہ انہیں اپنے باہمی رشتے کے لیے ایک بار کوئی نہ کوئی خطرہ مول لینا ہوگا۔ تاہم اسے بابک کے خرم میں شمولیت کا دھوکا کاٹھنوتا ہوا تھا۔

کے تحت کہنے لگا۔ ”کیا تم اس سے جدمحسوس کر رہی ہو؟“
 ”کیا میرا ایسا عمل جائز نہیں؟“ وہ برجستہ بولی۔
 ”میں نے تمہیں جسمانی کیف، ذہنی سکون، شہدِ محبت،
 پر خلوص رفاقت، کیا کچھ نہیں دیا لیکن تم ہوز اسی کی طلب
 نہیں دیاؤ گے ہو رہے ہو۔“
 ”تم میری کیفیات نہیں سمجھ پاؤ گی خدیجہ! وہ میرے
 ”بابک خرمی نے مجھ سے عہد کیا ہے کہ وہ ہمیں جبری
 شمولیت کے لیے بالکل مجبور نہیں کرے گا۔“ سفیان نے
 یقین دلایا۔
 ”مجھے اس درندہ صفت انسان پر قطعی اعتبار نہیں لیکن
 میرا دل آس کا جگنو تھا ہے اس اندھیری مسافت کو طے کرنا
 چاہتا ہے۔“ وہ آزر دکی سے کہنے لگی۔

معاشرے کا حصہ ہے۔ اس کی حیا اور گریز میں ہی تو سحر پوشیدہ ہے۔ ”سفیان نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ”لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میرے دل میں جہاد ہی کوئی اہمیت نہیں۔ میں تم دونوں ہی کو اپنی زندگی کا حصہ بنائے

”اتنا فکرمند کیوں ہو رہے ہو سفیان؟“ خدیجہ نے ملامت سے کہا۔ ”اگر اعلیٰ حضرت نے اسے حرم میں طلب کیا تو مجھے یقین ہے کہ یہ دلیری و بے خوفی ہے! اپنی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ آج سے کچھ عرصہ قبل اس کا بیچ بیچ

دھولانے جنہیں اپنے حرم میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔
 کا شہ سے سعادت مجھے نصیب ہوئی ہوئی۔“
 اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچہ ہی رہ گیا۔
 اسے اپنی ساعت پر تعین کرنا دشوار ہو رہا تھا۔
 ”نہیں..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا اور سفیان کو گریبان سے تمام لیا۔ ”تم نے اسے بتایا کہ میں اس کی شرط تو پوری ہو ہی چکی ہے۔ میں اپنی آبرو کے تحفظ سے محروم ہو گئی ہوں۔ تم نے اسے کیوں نہیں بتایا یہ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم میرے ساتھ کوئی دہرا مکمل کھیلنے لگے ہو۔ تم نے اس حرافہ کے ساتھ ہی وقت گزاری کا ارادہ کر لیا ہے اور تم شادی کے بندھن میں بندھنا ہی نہیں چاہتے؟“

اسا کی اس بدگمانی نے سفیان کا دل کسی چمکی میں مل دیا۔
 ”ایسا مت سوچو خدا را!“ اس نے وضاحت دینی چاہی۔
 ”خدا کا نام اپنی زبان سے مت ادا کرو۔“ وہ
 پھنکاری۔ ”اپنے دل میں جھانک کر دیکھو۔ تم اس لادین
 معاشرے کے ہر کار کا شکار ہو چکے ہو۔“
 ”میں تمہاری کیفیت سمجھ رہا ہوں اسا!“ وہ کراہا۔
 ”میں نے بابک خرمی سے تمہارا ہاتھ طلب کیا ہے۔ ہم فی
 الحال اس کے آیا کی فکدہ بند روانہ ہو رہے ہیں۔ بابک وہاں
 پہنچ کر بتی کوئی حتمی فیصلہ سنائے گا۔“

”میں اپنا یہ دعویٰ ثابت کرنے کے لیے ہر استحان
 سے گزرنے کے لیے تیار ہوں۔“ سفیان نے سابقہ انداز
 برقرار رکھا۔
 بابک نے ہنسی لگا ہوں سے سفیان کا جائزہ لیا اور
 مستی خیزی سے کہنے لگا۔
 ”ابھی آزمائے لیتے ہیں۔ میرے قریب چلے آؤ۔
 تمہیں ایک عہد کا مرحلہ عبور کرنا ہوگا۔“
 سفیان بلا تاہل آگے بڑھا اور بابک سے محض دو قدم
 کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔ منزل اور حسن تمہایت ادب سے

سفیان کے اس کول مول جواب پر خدیجہ تادیبی نظروں سے اسے گھور کر رہ گئی۔
 ”جتنی مرضی کوشش کر لو۔ وقت آنے پر یہ لڑکی خود ہی اپنی راہیں جدا کر لے گی۔“ وہ منہ ہی منہ میں بد بدائی۔
 خدیجہ کی اس بد بدابھٹ اور اغازہ دید سے بے نیاز سفیان، اس کو لاسا دینے میں مگن ہو گیا۔
 ☆☆☆

بابک کا قافلہ بڑے لیے روانہ ہوا تو خلافت عباسی کا ایک جرنیل "افطین" اس کی راہ مسدود کرنے کے لیے تیار تھا۔ بابک کو اپنے تجربوں کی جانب سے اس خطرے سے آگاہ ہی ملی تو وہ فوری طور پر ایک مختصر اور چڑھتے خطرہ متبادل راہ اختیار کرتے ہوئے قلعہ تک رسائی میں کامیاب ہو گیا۔

بابک کی کامیابی پر قلعہ بھر میں جشن کا سماں تھا۔ سفیان کا گمان یہی تھا کہ داوینش میں مشغول رہنے کے باعث بابک اس کا معاملہ فراموش کر دے گا لیکن یہ اس کی خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ بابک نے منزل سے تازہ ترین حالات اور سفیان کی مکمل ذہنی کیفیت سے آگاہی کے بعد

سفیان کے وجود میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے بلا توقف کہا:

”مذہبی خاندان جو عباس کے قربات و ارحام کے فرزند سفیان کی حیثیت سے ہے عہدِ کربا ہوں کہ اس کا ساتھ ملے ہی تمہاری کوئی بات رو نہیں کروں گا۔“

”خوب..... بہت خوب۔“ بابک کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ ”تمہیں ”سامرا“ واپس جا کر عباسی خلیفہ ”معتصم بالله“ کا قتل کر کے یہاں واپس آنا ہے۔“

بابک کی اس ”فرمائش“ پر سفیان بھونچکا رہ گیا۔ اسے حشاکہ تو تو قہر مگر بابک اسے خود بخود اختیار

کر رہی کہا کرتی تھی تاکہ اس کی رضامندی کے خلاف کسی نے جسائی تعلق استوار کرنے کی کوشش کی تو خود کشی کر لے گی۔ اس نے اطمینان سے چوٹ کی۔ اس کی رنگت خنجر ہو گئی۔ خدیجہ کی بات کسی تازیانے کی ضرب سی محسوس ہوئی تھی۔

”پروردگار تمہارا ہاکی دنا سر ہے۔“ وہ سفیان سے محض اتنا ہی کہہ سکی۔

اس کی جانب سے تشویش کا خاتمہ ہوا تو سفیان کے ذہن میں خلیفہ کے قتل کی مختلف تراکیب پروان چڑھنے لگیں۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ جتنی منصوبہ تشکیل دیا کہ بڑے سردار کی کے بعد بغداد کا رخ کرے گا۔ بغداد میں جو اسے ملاقات کے بعد بائک خرمی کی قید اور فرار کے سچے چھوٹے واقعات سنا کر خدیجہ سے بھی متعارف کروائے گا۔ بائک کی قید سے فرار میں خدیجہ کے کردار سے آگاہی کے بعد جو اسے یقیناً بہت متاثر ہوگا۔ اس مرحلے سے نشتے ہی وہ جو اس کے ہوا خلیفہ کے دربار کا رخ کرے گا اور خدیجہ کو معتمد باللہ کی خدمت میں پیش کر دے گا۔ خلیفہ کے لیے خدیجہ کے شباب کے سامنے مزاحمت ممکن ہی نہ تھی۔ معتمد باللہ کی خلوت میں خدیجہ کے لیے اس کے کسی شروب یا کھانے میں زہر کی آمیزش چنداں مشکل نہ ہوتی۔ اس کی ہلاکت کے بعد وہ کسی نہ کسی طور بذلوت کر بائک سے اس کی حوالگی کا مطالبہ کر دیتا۔

اس منصوبے کی جزئیات طے کرتے ہوئے سفیان کو خلافت عباسی کے جرنیل افشین حیدر کی اپنی سپاہ کے ہمراہ آمد کی خبر نے مضطرب کر دیا۔ افشین اس بار بھر پور تیاری کے ساتھ میدان میں اترا تھا۔ وہ بائک خرمی سے درپیش سابقہ مہمات میں کی گئی کسی بھی غلطی کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ افشین نے بڑے قریب پہاڑیوں پر پڑاؤ ڈالا اور محاصرے کے انتظامات میں مشغول ہو گیا۔

افشین کی آمد اور ان تیاریوں کی اطلاعات نے بائک خرمی کو بھی مضطرب کر دیا تھا۔ اس اضطراب اور تشویش کی ایک وجہ بہر حال یہ بھی تھی کہ ماضی کے برعکس اس کے تجربہ افشین کی کارکردگی اور منصوبوں کی بابت کوئی بھی اطلاع پہنچانے میں ناکام رہے تھے۔ بڑے کرداروں میں کھودی جانے والی خدوتوں اور پتھروں کی مدد سے استادہ کی جانے والی فصیلیں اسے سخت تشویش میں مبتلا کرنے لگی تھیں۔ بائک نے اپنے شیروں اور آئندہ سے ملاقات کی اور نہایت سوچ بچار کے بعد یہ حکمت عملی طے کی کہ افشین

حیدر کے پاس شہر بردار جانوروں بھیجے جائیں گے۔ طویل محاصرے کے باعث خلافت کی سپاہ ”مستور“ گزراہ کرنے پر مجبور تھی۔ انہیں خربوزے، ٹکڑیاں اور کھیرے ارسال کر کے اخلاقی دباؤ میں لینے کی کوشش کی جائے گی۔ تاہم اس امر کا حقیقی مقصد افشین کے حفاظتی انتظامات کا ہارک بیٹنی سے جائزہ لینا تھا۔ وفد میں شامل افراد کی اکثریت بھی جنگی ماہرین پر ہی مشتمل ہوتی۔ اس منصوبے کی جزئیات طے کرنے کے بعد بائک نے سفیان کو اپنے پاس طلب کیا اور اسے بھی وفد کے ہمراہ روانگی کے لیے ذہنی طور پر تیار بننے کا حکم دے دیا۔

”تمہیں کسی نہ کسی طور کچھ عرصہ وہیں مقیم رہنا ہوگا۔“ بائک نے ایک اور فرمان صادر کیا۔

”میں تم سے بڑے سردار ہوں گا؟“ سفیان الجھا۔

”تم خرمیہ دین کی تبلیغ کرو گے۔ سپاہیوں کو خرمیہ معاشرے کے ذریعہ اصولوں سے آگاہ کر دے۔ مسادات، شخصی آزادی اور فطری بندشوں سے نجات سے آگاہی دو گے۔ یہ کام خوش اسلوبی سے سرانجام دینے پر تمہیں اعزازی طور پر مبلغین کے گروہ میں شامل کر لیا جائے گا اور خرمیہ معاشرے کے اصول و ضوابط کے برعکس ایک سے زائد لڑکیوں کے ساتھ رہنے کی اجازت بھی مل جائے گی۔“

بائک کی اس بات پر سفیان چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ لمحہ بھر میں ہی بھانپ گیا تھا کہ اس کا اشارہ خدیجہ اور اس کی جانب ہے۔ سفیان سخت کھٹکھٹ میں مبتلا ہو گیا۔ دینی حجت سے روگردانی کا احساس شدید کچھ کے لگا رہا تھا تاہم وہ اس امر سے بھی واقف تھا کہ قدرت نے اسے ایک بہترین موقع فراہم کیا ہے۔

”ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔ کیا اسامیرے ہمراہ ہوگی؟“

سفیان کے اقرار پر بائک کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”نہیں..... وہ تمہاری امانت بن کر نہیں رہے گی۔“

اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

☆☆☆

شہر بردار جانوروں اور وفد کی روانگی سے قبل خدیجہ سفیان کے پاس چلی آئی۔

”کیا میری روانگی کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی؟“ وہ آرزو سے گویا ہوئی۔

”نہیں۔ بائک خرمی اس بات کے لیے رضامند نہیں ہے۔“

خدیجہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی اور اپنے آنسو ضبط

آخری وار

کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں سفیان! تمہیں علم ہے کہ خرمیہ معاشرے میں کسی بھی مرد کے ساتھ تعلقات استوار کر لینے کی اجازت ہے لیکن میں تمہارا مقام کسی کو بھی نہ دے پاؤں گی۔ میری خاطر لوٹ آنا۔“

سفیان نے جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر اسے اپنے سینے میں سمیٹ لیا اور عمیق تنفس دینے کے بعد وفد کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔

اس کی توقعات کے عین مطابق افشین حیدر لمحہ بھر میں ہی بائک خرمی کا اصل مقصد بھانپ گیا تھا۔

”تو یہ راہ نکالی ہے بائک نے میرے حفاظتی حصار کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی؟“ اس نے استہزائیہ انداز میں وفد کے سربراہ کو مخاطب کیا۔

”جی نہیں، ہمارے آقا و مولا نہایت اعلیٰ ظرف ہیں۔ انہوں نے سپاہ کی فلاح اور اپنے منصب کی پاسداری کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے۔“ سربراہ نے تسکین سے جواب دیا۔

”اچھا..... تو بدلے میں مجھے بھی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ میں تمہیں اپنے مورچوں کی سیاحت کروائے دیتا ہوں۔“ افشین نے طنز کیا۔

اس کے بعد افشین حیدر کے ایما پر وفد کو دشوار گزار پہاڑی راستوں سے مورچوں اور دیگر انتظامات کی دید کر دادی گئی۔

”اپنے اس خود ساختہ آقا سے کہنا ہے اس کی زندگی کا آخری معرکہ ہے۔ بہتر اسی میں ہے کہ تمہارا ڈال کر امان طلب کر لے۔ اسے کوئی گز نہیں پہنچایا جائے گا۔“

افشین کی اس پیشکش پر وفد کے سربراہ کا چہرہ سیاہ ہی رہا۔ اسی شام حالات نے غیر متوقع موڑ لے لیا۔ افشین کے مصائبین خاص میں سے ایک شخص سفیان کے خیمے میں چلا آیا۔

”مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک روز تجھے ذمہ دہندگانوں کا میرے بچے!“

سفیان اپنے بوڑھے نانا کی دید پر ششدر رہ گیا۔ جو اسے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”میری آنکھیں بھی آپ کو دیکھنے کے لیے ترس گئی تھیں۔“ سفیان گلوں گہرا۔

”اب میں تجھے کہیں نہیں جانے دوں گا۔ میں نے افشین سے بات کر لی ہے۔ تو تمہیں ہمارے پاس رہے گا۔ وفد کے سربراہ کو بھی اس فیصلے سے مطلع کر دیا گیا ہے۔“

جواد کے حتمی انداز میں کہنے پر سفیان نے ایک بوجھل سانس لی۔ وہ اپنے بوڑھے نانا کو کیونکر بتاتا کہ اس کا یہاں قیام تو پہلے سے ہی طے شدہ تھا۔ وفد کی روانگی کے بعد افشین نے سفیان کو اپنے پاس طلب کر لیا۔

”مجھے علم ہوا تھا کہ تمہیں اپنے مرحوم والد کی جگہ قلعہ داری کا منصب سونپا گیا تھا۔ اس کے بعد کیا حالات بیٹے؟ تم قلعہ کیوں نہ پہنچ پائے اور اب اس وفد میں موجودگی کا کیا سبب ہے؟“ افشین نے در یافت کیا۔

سفیان نے اسے مختصراً انداز میں اپنے آغاز سفر، گرفتاری، سپاہیوں کی ذہنی کیفیت اور بائک خرمی کے شب و روز کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ اس نے اسامیرے اور بائک سے ہونے والے معاہدے کا ذکر دانستہ طور پر حذف کر دیا تھا۔

”تو اس وقت قلعہ کی عسکری صورت حال کیا ہے؟“

افشین نے اگلا سوال کیا۔

”اس قلعہ میں آپ کو ہر ایک قدم پر مزاحمت کا سامنا ہوگا۔ وہاں کا ہر ایک بچہ لافانی روح کی حرمت کے لیے کٹ مرنے کو تیار ہے۔“

سفیان کی اس صاف گوئی پر افشین کی پیشانی ٹھن آلود ہو گئی۔

”مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ تم ذہنی طور پر بائک خرمی کے زیر اثر آچکے ہو؟“ اس نے چیختے ہوئے انداز میں کہا۔

”نہیں..... نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے تو صرف ایک حقیقت بیان کی ہے۔“ وہ گڑبڑا گیا اور سنبھلتے ہوئے گویا ہوا۔

”اصول و ضوابط اور اخلاقی حدود و قیود سے ہر اس معاشرے میں بغاوت کی آگ بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ وہ اپنے اس لادین معاشرے کی حفاظت کے لیے آخری حد تک جائیں گے۔“

”اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ بائک خرمی میری پیشکش قبول کر کے قلعہ کے دروازے کھول دے گا۔“

افشین چڑا ہوا تھا۔ ”تم فی الوقت میرے سپہ سالاروں کو قلعہ کے جغرافیہ اور بائک کی رہائش گاہ کے محل وقوع سے آگاہ کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ اس قلعہ کے اندرونی بیچ و خم کا بھرپور نقشہ تیار کر لیا جائے۔“

سفیان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

انہیں نے نہایت ثابت قدمی اور جواں مردی سے ہم کا آغاز کر دیا۔ ابتدا معمولی جہازیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد انہیں نے اپنی روانہ دہانت اور چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت احتیاط سے بذ کے قلعے کی جانب پیش قدمی جاری کر دی۔

اس عمل کے دوران پہلا راکٹ اور تھوڑی سی اس وقت سامنے آئی جب گھڑسوار اپنے گھوڑوں سمیت زمین کے اندر غائب ہونے لگے۔ انہیں کی جانب سے تحقیقات کے حکم پر علم ہوا کہ بابک نے راہ میں ان نکتہ کو بھی گھدوار کے ہیں۔ ان کوڑوں پر گھاس پھوس اور پتے وغیرہ ڈال کر عام انسانی آنکھ سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ انہیں کے حکم پر فوج کا ایک دستہ ان کوڑوں کی تلاش اور پٹائی کے کام میں جت گیا۔ بابک کے پیروؤں کے مکانات کا لمبا اور پہاڑی پتھر نہایت ماہرانہ انداز میں استعمال کیے گئے۔

اس مرحلے سے سننے کے بعد انہیں نے اپنی دیگر سپاہ کے ہمراہ قلعے کی جانب دوبارہ پیش قدمی کا آغاز کیا۔ قلعے میں داخلے کے لیے پہاڑی پر چڑھائی درپیش تھی۔ یہ مرحلہ بھی نہایت مہم آزا ثابت ہوا۔ بابک نے بالائی سمت ایک چرچ نصب کر دیا تھا۔ اس چرچ میں بارشہ بیماری بھرم کھتر سپاہ کی طرف لڑکا دیا گیا۔ پتھر اپنی سمت آتے دیکھ کر شاہی فوج نے منظم انداز میں تہتر ہوتے ہوئے اپنی زندگیوں کی حفاظت کی۔

اس کے بعد کے مراحل بھی آسان ثابت نہ ہوئے تھے۔ بابک خرمی کی سپاہ نے ہر ایک قدم پر مزاحمت جاری رکھی تاہم انجام کار شاہی فوج قلعے میں داخل ہو کر بابکی مملات اور مکانات پر خلافت کے پرچم لہرانے میں کامیاب ہو گئی۔ قلعے میں دخول کے بعد مزاحمت کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انہیں نے اس صورت حال پر براہ فرود نہ ہوتے ہوئے بابک خرمی کے پیروؤں کے قتل عام اور ان کی رہائشی عمارات نذر آتش کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اگلے چند ہی لمحوں میں آبادی وحوش کے بادلوں کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔

انہیں کی ایما پر بابک کے قہر کا گھبراہٹ کرتے ہوئے ہتھیار چھینک دینے کا اعلان ہی بارہرا کیا گیا۔ بصورت دیگر یہ قسمی بلا تامل نذر آتش کر دیا جاتا۔ اس اعلان کے بعد بابک کے کئی عزیز و اقارب صلح کا پرچم تھامے چلے آئے۔

”ان میں بابک خرمی موجود ہے کیا؟“ انہیں نے سفیان سے استفسار کیا۔ اس نے اسی لمحے کے لیے سفیان کو اپنے ہمراہ لیا تھا۔

”نہیں، وہ ان میں موجود نہیں ہے۔ میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔“

سفیان کے انکشاف پر انہیں جھنجھلا کر رہ گیا۔ بابک کے فرار نے اسے شدید ذہنی کوفت میں مبتلا کر دیا تھا۔ انہیں کے حکم پر بذ کے قلعے میں تمام تر عمارتیں ڈھا دی گئیں۔ مملات اور قیدی خالوں سے تقریباً آٹھ ہزار مسلمان مرد و زن قیدیوں کو بازیاب کر دیا گیا۔ انہیں نے ان بازیاب شدگان کو فوج کے دستے کے ہمراہ سامرا روانہ کر دیا۔ ان افراد کے بارے میں اس کی حکمت عملی یہی تھی کہ سامرا پہنچنے کے بعد انہیں ذاتی نگرانی میں اسل وادوں اور متعلقین کے حوالے کر دیے گئے۔ بابک کے تقریباً چار ہزار عقیدت مندوں کی گرفتاری بھی عمل میں لائی جا چکی تھی۔

سفیان کے شب و روز نہایت کھنکھن ہو چکے تھے۔ وہ دیوانہ وار اسامہ اور خدیجہ کی تلاش میں مارا مارا پھرتا لیکن ان کا سراغ مل کے ہی نہ دے رہا تھا۔ اس پر ستر ادایک آزار یہ بھی تھا کہ وہ جواد یاسی اور سے اپنی دلی کیفیت اور تلاش کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

دوسری جانب انہیں کی جانب سے بابک خرمی کی تلاش بھی زور و شور سے جاری تھی۔ کچھ ہفتوں بعد اسے آرمینیا میں بابک کا سراغ مل گیا۔ وہ آرمینیائی حاکم سہل ابن ساباط کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سہل نے اسے بخفا غارت روم پہنچانے کی ذمہ داری لینے کے بعد رازدارانہ انداز میں خلافت عباسی تک اس کی موجودگی کی خبر پہنچادی۔ انہیں حیدر فوری طور پر اسے گرفتار کر کے سامرا لے آیا۔

”ہر قیدی سے اس کی آخری خواہش ضرور دریافت کی جاتی ہے۔ کیا تم یہ رسم پوری نہیں کرو گے؟“ بابک نے انہیں کو طنز پر مخاطب کیا۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہاری آخری خواہش کیا ہوگی؟“ انہیں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں بذ کا آخری دیدار کروانے کے انتظامات مکمل کر رکھے ہیں۔“

بذ آمد کے بعد بابک کو ایک خصوصی فوجی دستے کی نگرانی میں بذ کے قلعے کو چوں کے آخری دیدار کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ بابک سپاٹ چہرہ لیے اپنے سوختہ مملات، نقصان زدہ لاشوں اور عقیدت مندوں کے گھنڈرات میں تبدیل شدہ مکانات دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں ملال یا خلش کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

☆☆☆

آخری وار

بابک خرمی کے سامرا پہنچنے ہی گرد و لوح کی آبادیوں کے مکین اس کی دید کے لیے اٹھ آئے۔ سفیان بھی اس سے ملاقات کا شدت سے خنجر تھا۔ بابک کو خلیفہ کے ایما پر ”قصر مظہر“ منتقل کر دیا گیا۔ سفیان کے لیے اس قصر تک رسائی بالکل مشکل نہ تھی۔ وہ وقت ضائع کیے بغیر وہاں پہنچ گیا۔ سفیان کو دیکھتے ہی بابک کے لبوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”مجھے علم تھا تم سے ایک بار ضرور ملاقات ہوگی۔ تمہاری بے چینی بالآخر میرے پاس پہنچ لائے گی۔“

”اسا کہاں ہے؟“ سفیان نے اس کی ہرزہ سرائی نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”مجھے کیا علم ہو؟“ بابک نے کندھے اچکائے۔ ”سامرا پہنچائے جانے والے قیدیوں میں ہی نہیں شامل ہوگی۔“

”تم انجان بن رہے ہو۔ تمہیں علم ہے کہ وہ کہاں ہے۔“ سفیان سچ گیا۔ وہ اپنے دل پر دھرا بوجھ اٹھائے اب بے حال ہونے لگا تھا۔

بابک چند لمحوں تک سگنی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر پھسکارتے ہوئے کہنے لگا۔

”تیرے بارے میں مجھے روز اول سے ہی کوئی شائبہ نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تیری رگوں میں دوڑتا خون بھی اطاعت قبول نہیں کرے گا۔ تجھے کیا لگتا تھا میں تیرے داؤ بیچ سے انجان تھا؟ خرمیہ دین اختیار کرنے کے لیے وقت کی طلبی اور انہیں کی فوج میں مبلغ بن کر اپنا کردار نبھانے کے دعوے میں نے بھی تسلیم ہی نہیں کیے تھے۔“

”اگر مجھے علم تھا تو انجان کیوں بنارہا؟“ سفیان مزید چٹھا۔ ”آخری وار کے انتظار میں۔ تیرے ہر داؤ بیچ کے نتیجے میں مجھے بس ایک آخری وار کرنا تھا۔“ وہ اطمینان سے کہنے لگا۔

سفیان قید خانے کی سلاخیں میٹھے ایسا اور خدیجہ کی بابت استفسار کرتا رہا لیکن بابک کے ہونٹوں پر کوئی نقل لگ چکا تھا۔ آنکھوں میں سلاخ دینے والی شاطرانہ چمک سفیان کو نہیں زدہ کر رہی تھی۔ وہ تھک ہار کر واپس چلا آیا۔

☆☆☆

اگلے روز جمعرات تھی۔ مقیم باللہ کے حکم پر بابک کو ”دوبا“ کی مخصوص قیاد اور ”مسور“ کی ٹوٹی پہنٹا کر ایک ہانچی پر بٹھا دیا گیا۔ بس ہانچی کو شہر بھر میں گھماتے ہوئے بابک

خری کی خوب تشہیر کی گئی۔ بابک کی اہمیت کٹائی دیکھنے کے لیے ہزاروں شہری سڑکوں پر اٹھ آئے تھے۔ اس کے بعد بابک کو خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ مقیم باللہ کے مرصع و زور نگار عمامہ میں کافی گلی تھی۔ اس کی رنگت سرخ و سفید، آنکھیں شرابی اور لمبی ڈاڑھی سرخی مائل بھوری تھی۔ اس نے اپنا مرصع تاج بابک کے سر پر سجایا اور استہزائیہ کہنے لگا۔

”اسی کی خواہش تھی نا تمہیں؟“

”نہیں، مجھے بادشاہت کی تمنا کبھی بھی نہ تھی۔“ بابک نے بے خوفی سے جواب دیا۔ ”میں تو ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینا چاہتا تھا جہاں مساوات اور آزادی کا بول بالا ہو اور انسان بے جا فطری بندشوں کا نام بھی بھول جائے۔“

”تیری اس خواہش نے ایک فتنہ پروان چڑھا دیا اور اس کی مزا بولناک ہو گئی۔“ مقیم نے سرد مہری سے کہا۔ ”مجھے کسی سزا کا خوف نہیں ہے۔“ بابک کی ہٹ دھرمی اور بے خوفی برقرار تھی۔

ان مناظر کا خاموش تماشا کی حیثیت سے جائزہ لیتے سفیان کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ مقیم باللہ نے ایک مخصوص گوشے میں کھڑے جلاد کی سمت دیکھا اور بے تاثر انداز میں کہنے لگا۔

”اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دو۔“

جلاد نے بابک کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹا اور برق رفتاری سے خلیفہ کے حکم پر عمل کر دیا۔ بابک خرمی کے لبوں سے برآمد ہونے والی جھین نہایت ہولناک تھیں۔

”ذبح کر دو اسے۔“ مقیم باللہ نے اگلا حکم صادر کیا۔ جلاد نے بابک کو اپنے گھٹنے میں دبوچ کر شہر گ پر خنجر پھیر دیا۔ لہو کا ایک فوارہ اٹلا اور بابک کا بدن بے جان ہو گیا۔ جلاد نے اس کا پیٹ چاک کیا اور آتشی نکال کر باہر پھینک دیں۔

”گرفتار شدگان مرد و زن کو ان کے درتھام تک پہنچانے کا مرحلہ جلدی تکمیل تک پہنچاؤ۔“ خلیفہ نے انہیں کو مخاطب کیا۔

”یہ مرحلہ تقریباً طے کر لیا گیا ہے۔ صرف چند ایک خواتین کے درتھام تلاش کرنے ہیں۔“ انہیں نے اطمینان سے اختیار کیا۔ ”بلکہ ایک لڑکی کے وارث تو ہمیں موجود ہیں۔“

انہیں نے اپنے مستر خاص کو اشارہ کیا جسے بھانپ کر وہ دو جواں سال لڑکیوں کو دھان لے آیا۔

مفتی ڈیلگا ڈو ایک چوٹی سی پرائیویٹ الیمنٹری
مکین ایجنسی چلاتی تھی۔ اس کا اس شعبہ تو ڈی پی ڈی یعنی
ڈیپس پولیس ڈیپارٹمنٹ تھا لیکن ایک ناخوشگوار واقعے کے
باعث اسے پولیس ڈیپارٹمنٹ چھوڑنا پڑا تھا۔ جو لوگ
اصولوں پر سودے بازی نہیں کرتے اور اپنے کام میں صد
فیصد دیانت داری دکھانے کے عادی ہوتے ہیں، انہیں جلد
یاد رہے اس ”جرم“ کی سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ اس سے کوئی فرق
نہیں پڑتا کہ وہ دنیا کے کس خطے میں آباد ہیں۔ مفتی کو بھی

دامرز

محمد شاہ زین رضوان

جو لوگ کہہ اور سچے اصولوں پر کام کرنے کے عادی
ہوتے ہیں... انہیں جلد یا بدیر بالآخر اس کا نتیجہ بھی
بھگتنا پڑتا ہے... وہ بھی ایک ایسے ہی جرم بے گناہی کی
بھاری قیمت ادا کر رہی تھی... لیکن اس واقعے کا ذمہ دار
بھی کبھی سکون سے جی نہ سکا... کیونکہ یہ قدرت کے
قانون کے خلاف تھا... اور ایسی سزا دینا جس کا کوئی
گمان بھی نہیں کر سکتا صرف اور صرف اوپر والے کے
اختیار میں تھا۔

دولت کے گھمنڈ میں دوسروں کی زندگی کو کھلوتا بنانے والوں کا قصہ



رہی ہے۔“ افشین کے معتد نے تاسف سے اس کی جانب
دیکھتے ہوئے خدیجہ کی بابت بتایا۔
خدیجہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزتی سفیان کے
سامنے چلی آئی۔
”تم جانتی تھیں؟ تم سب کچھ جانتی تھیں؟“ سفیان
نے بے یقینی سے دریافت کیا۔ اس کے حلق میں کانٹے اگ
آئے تھے۔

”میں مجبور تھی۔ مجھے آقا بابک نے حکم دیا تھا۔“ اس
نے لرزتے ہوئے بتایا۔ ”اور سچ تو یہ ہے کہ میں تم سے بہت
محبت کرنے لگی تھی۔“
”تف ہے ایسی محبت پر۔“ سفیان کی آنکھوں میں
لہو اتر آیا۔
”ایسا مت کہو خدا را! میری محبت پر یوں شک نہ
کرو۔“ وہ رونے لگی۔

”تم نے مجھے حیوان بنا دیا۔ میں نے انسانیت،
اخلاقیات اور مذہب کی سب حد و حدود پا مال کر دیں۔ میں
اپنی ہی بہن کے ساتھ... اوہ خدایا... میں کس قدر حیوان
ثابت ہوا۔“ وہ کراہا۔
”میں تم سے محبت کرتی ہوں سفیان! خدیجہ کے
آنسوؤں میں شدت آئی۔

”میں... حیوان... میری... بہن... حیوان...“
وہ مذہبی انداز میں کہتا پتلا لباس تار تار کرنے لگا۔
جواد لبک کراس کی جانب آیا۔ دربار میں موجود کسی
بھی شخص کے ردعمل سے پہلے سفیان نے اپنے بال نوچے اور
پہچان سے مغلوب ہو کر چوپائے کی حیثیت اختیار کر لی۔
خدیجہ اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ سفیان نے اسے
بھرپور قوت سے پیچھے دھکیلا اور حلق سے حیوانی غراہٹ کی
خصوص آوازیں نکالتے لگا۔

”تیرے ہر داؤ پیچ کے نتیجے میں مجھے بس ایک آخری
دار کرنا تھا۔“ اس کی سماعت میں ایک بار پھر بابک کے
الفاظ گونجنے لگے۔
”کیا ہو گیا ہے میرے بچے؟“ جواد نے اسے اٹھانا
چاہا۔

”میں... حیوان... بہن... حیوان...“ وہ
چوپایوں کی طرح چلتا انجی الفاظ کی گردان کرتے لگا۔

”حضور! یہ بھی اپنے ورثہ کے وہی نام بتاتی ہیں۔“
اس نے فوراً وضاحت دی۔
سفیان کی حیات آنکھوں میں سمٹ آئیں۔ اس کے
سامنے اس کا اور خدیجہ موجود تھیں۔ سفیان کو اپنی بصارت پر
یقین کرنا دشوار ہونے لگا۔
”تیرے والد کا کیا نام ہے لڑکی؟“ معتد نے
تھکاتہ دریافت کیا۔

”حماد... وہ اردبیل قلعے کے منصب دار تھے۔“
اس نے سر آواز بھری۔
سفیان کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ دوسری سمت
جواد کا چہرہ بے یقینی اور جوش کی آماجگاہ دکھائی دینے لگا۔
”اوہ تو تم حماد کی بیٹی ہو۔“ خلیفہ نے چونک کر کہا۔
”تمہارے بھائی کی بونہاری کے بہت چرچے سنے تھے۔“
”اس ظالم درندے نے عراق قان کو میری نظروں کے
سامنے...“ اس کی آواز رندہ گئی۔

”فکر مند نہ ہو۔“ افشین نے اسے شفقت سے
مخاطب کیا۔ ”اللہ نے تجھے چند رشتوں سے محروم کرنے کے
بعد قیمتی متاع سے بھی نوازا ہے۔ تمہارا بھائی سفیان، نانا
جواد اور ان کی اہلیہ ابھی بحیرہ حیات ہیں۔ تمہیں انہی کی تحویل
میں دیا جائے گا۔“

افشین کے لبوں سے برآمد ہونے والے یہ الفاظ
سیکڑوں زہریلے ناگ بن کر سفیان اور اس کے وجود سے
لپٹ گئے۔ اس کے لیے سانس لینا دشوار ہونے لگا۔
”تیرے ہر داؤ پیچ کے نتیجے میں مجھے بس ایک
آخری دار کرنا تھا۔“ سفیان کی سماعت میں بابک کے
الفاظ گونجنے لگے۔

جواد فرط جذبات میں اپنی نشست سے اٹھا اور نہارتی
نظروں سے دیکھتے اس کی طرف بڑھ گیا جس کا وجود
بیمابک ظلم کی زد میں تھا۔ جواد کے قریب آتے ہی اس
نے اس کے پہلو میں جھولنا خنجر کھینچا اور اپنی شہ رگ پر
پھیر لیا۔ اس کی بے نور آنکھوں میں جہان بھر کی وحشت اور
کرب سموئے تھے۔

دربار میں موجود سبھی افراد اس کے اس عمل پر انکشت
بدلتاں تھیں۔ سفیان کے ذہن میں جھگڑواں ہو گئے۔
”یہ لڑکی بھی اپنے ورثہ میں سفیان ہی کا نام لے

ساخذا ت:

ہابلک خرمی، حکیم حسن اسحاق، تیسری صدی ہجری کا فتنہ عظیم، محمود علی

ایسے ہی ایک جرم ہے جس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی اور اب وہ مجبوراً ایک پی آئی اے (پرائیویٹ الویٹی گیکٹ ایجنسی) کھولنے بیٹھی تھی۔

یعنی اپنے آفس میں بیٹھی کسی کیس کی فائل رپورٹ تیار کر رہی تھی کہ ایک ضرورت مند اس سے ملنے آیا۔ مذکورہ شخص پر نظر پڑتے ہی اس کے رگ و پے میں ناگواریت سی دوڑ گئی تاہم اس نے ایک خوش اخلاق ایجنٹ ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

آنے والا ایک اویسز عمر اور اچھی صحت کا مالک صاحب ثروت شخص تھا۔ یعنی اسے اچھی طرح جانتی تھی اور اسے سخت پابند بھی کرتی تھی اسی لیے اس پر نگاہ پڑتے ہی یعنی کا خون کھول اٹھا تھا۔ مرد مذکور کا نام جبو جاسن تھا اور وہ ڈیس کا ایک معروف "سپورٹس اوز" ارب پتی تھا۔ جبو کی ایک ذاتی فٹ بال ٹیم تھی۔ وہ اس پرائیویٹ فٹ بال ٹیم کے ٹورنامنٹس سے ہزاروں، لاکھوں ڈالر کماتا تھا۔ یہی اس کا بزنس تھا جسے وہ بڑی کامیابی اور شان سے چلا رہا تھا۔ "کیا تم مجھے جانتی ہو؟" جبو نے بیٹھنے کے بعد یعنی سے استفسار کیا۔

"مستر جبو! میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں؟" یعنی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "میں تمہاری ہی وجہ سے پولیس ڈیپارٹمنٹ سے نکالی گئی تھی۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔" جبو نے عداوت کا اظہار کیے بغیر کہا۔ "تمہارے سینئر نے تمہیں جیل بھیجی تھی کہ تم میری ٹیم کے کھلاڑیوں کو ہراساں کرنا چھوڑ دو ورنہ تم اپنی ضد پر قائم رہیں۔ نتیجاً ڈیپارٹمنٹ نے تمہیں گھر بھیج دیا اور اب تم ایک تفتیشی ایجنسی چلا رہی ہو۔"

"کسی کو بھی ہراساں کرنا میرا مقصد نہیں تھا۔ میں تو بس اپنا کام کر رہی تھی۔" یعنی نے تحمل لہجے میں جواب دیا۔ "میرے سینئر لیفٹیننٹ نے مجھے اس نائٹ کلب میں تفتیش کرنے بھیجا تھا جہاں ایک نوجوان عورت پر خطرناک حملہ ہوا تھا اور حملہ آور تمہاری فٹ بال ٹیم کا ایک کھلاڑی تھا۔ اگر تم پیسے خرچ کر کے کسی کو دباؤ دے سکتے ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم شک ہو۔ اس نائٹ کلب میں ایک سنگین جرم تو ہوا تھا تا۔ اس بچاری بد قسمت عورت کا جیڑا اپنی جگہ سے ال گیا تھا اور یہ سب تمہاری ٹیم کے ایک درندہ صفت کھلاڑی نے کیا تھا۔"

یعنی ڈیلگا ڈڈنے بمشکل تمام اپنے جذبات اور حواس پر قابو رکھا ہوا تھا اور یہ اس کے پروفیشنل ہونے کی شہس

دلیل تھی ورنہ اس کا جی تو چاہا کہ وہ ٹیبل سے اسٹیمپل اٹھا کر جبو جاسن کے سر پر دے مارے۔

جبو چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے یعنی کو دیکھتا رہا پھر عام سے لہجے میں بولا۔ "میں سمجھتا ہوں تم غلط نہیں تھیں۔" "تو اب کیا؟" یعنی نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا تم اپنی اس زیادتی کا کفارہ ادا کرنے آئے ہو؟" "ایک طرح سے تم اسے کفارہ بھی کہہ سکتی ہو۔" جبو نے معتدل انداز میں کہا۔ "میں ایک ذاتی کام کے سلسلے میں تمہاری خدمات حاصل کرنے کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ تمہاری جو بھی ٹیم ہے، میں اس سے دس گنا رقم تمہیں دوں گا۔ اس طرح تمہارے ساتھ ہونے والی اس زیادتی کی سزا دی جائے گی اور میرا کام بھی مکمل آئے گا۔" وہ لمبے بھرور کا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"دس گنا زیادہ رقم دینے کی میری پیشکش کوئی حتی بات نہیں ہے۔ اگر تم میرا کیس لینے کے لیے تیار ہو جاؤ تو اس رقم میں تمہارے حسب منشا اضافہ ہو جائے گا۔ تم جانتی ہو میرے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہے۔"

"ہاں، میں تمہاری توانگری اور اختیار کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔" یعنی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اپنی دولت کے بل پر تم مجھ سے کوئی غلط یا غیر قانونی کام کروالو گے تو یہ تمہاری بھول ہے مسٹر جبو جاسن!"

"اگر مجھے کوئی بخرمانہ نہ کرانا ہوتا تو میں تمہارے پاس ہرگز نہ آتا۔" جبو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے مزاج، فطرت اور عادت سے اچھی طرح واقف ہوں یعنی ڈیلگا ڈڈو..... کیا تم میری اکلوتی بیٹی کو جانتی ہو؟"

"میں جاسن ماہونی!" یعنی نے جبو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "جسے کچھ عرصہ پہلے تمہاری فٹ بال ٹیم کے ایک سابق سپر اسٹار کھلاڑی کیلون ہیرس نے شوٹ کر دیا تھا اور یہی کی چلائی ہوئی گولی نے کیلون کا کام بھی تمام کر دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان دونوں کے انجیڑ میں ایک بے گناہ شخص بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا جس کا اس معاملے سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رک بھراں الفاظ میں بات مکمل کر دی۔

"ڈیلگا اور اس کے قرب و جوار میں رہنے والا ہر شخص تمہارے قتل کی اس واردات کے بارے میں جانتا ہے۔ صاف اور سیدھے الفاظ میں بتاؤ، آخر مجھ سے کیا

چاہتے ہو؟"

"میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی تمام تر ذہانت کو استعمال کر کے پتا لگاؤ کہ کیلون نے یہی کیوں مکمل کیا؟" جبو نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اور اس سلسلے میں مجھے.....!" اس نے یعنی کی میز پر پھیلے ہوئے درجنوں پیپرز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنے کام کے جواب میں پیپرز کا پلندا نہیں چاہیے۔ صرف ایک لائن..... جس میں تم مجھے بتاؤ کہ کیا وجہ تھی کہ کیلون کو بھیسی کی جان لینا پڑی۔ میرا خیال ہے تم میرا مقصد سمجھ گئی ہو۔"

"پولیس اس کیس پر اپنا کام مکمل کر چکی ہے۔" یعنی نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔ "تمہیں ان کے پاس جانا چاہیے تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ تمہارے دیرینہ تعلقات بھی ہیں۔"

"پولیس نے اس معاملے کی گہرائی میں جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔" جبو، یعنی کے طنز کا بڑا سناٹے بغیر معتدل انداز میں بولا۔ "اسی لیے مجھے تمہارے پاس آنا پڑا۔ تم بہت ہی قابل اور مستعد الویٹی گیکٹر ہو۔ مجھے یقین ہے تم اس محرک کو کھوج نکالو گی جس نے کیلون کو بھیسی پر گولی چلانے کے لیے مجبور کیا تھا۔"

"پولیس کو کیلون کے لاکر میں سے ایک شیپ بھی..... تو.....!" وہ بولتے بولتے اس طرح رک گئی جیسے اس کے منہ سے کوئی غلط یا نامناسب بات نکلنے جا رہی تھی۔

یہ سچ ہے کہ پولیس کو کیلون ہیرس کے ذاتی لاکر میں سے اس کی مختلف تصاویر کے علاوہ ایک کیسٹ بھی ملی تھی۔ وہ ایک ویڈیو ریکارڈنگ تھی جس میں کیلون اور فیسی عریاں حالت میں اپنے جذبات اور خواہشات کی اندھا دھند تکمیل کرتے دیکھے جاسکتے تھے۔ ان دونوں کے سچ قربت اور الفت کے جو بھی معاملات رہے تھے، ان کا ذکر فیسی کے باپ جبو سے مکمل کر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسی لیے یعنی نے فی الفور اپنی زبان کو بریک لگا دیا۔

"میں نے اپنی زندگی میں ایک بھی دوسرے فیصلہ نہیں کیا۔" وہ شیپ والے ایٹھو کو دیکھ کر نظر انداز کرتے ہوئے بوجھل آواز میں بولا۔ "لیکن وہ ایسی بدترین موت کی تھی جس میں میں نے کم از کم مجھ سے پہلے تو نہیں مرنا چاہیے تھا۔" پھر وہ یعنی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدرے شرمندہ انداز میں گویا ہوا۔ "میں جانتا ہوں، تم مجھ سے، میری آرگنائزیشن سے حتی کہ فٹ بال کے کھیل ہی سے نفرت کرتی ہو۔ اس کے باوجود بھی تمہاری قابلیت، اہلیت اور

بیشہ دہی مجھے کھینچ کر تمہاری ایجنسی کے دروازے تک لے آئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر تمہاری تفتیش کے راستے میں ہزاروں اور لاکھوں رکاوٹیں بھی آئیں گی، تم تب بھی اس وجہ تک پہنچ ہی جاؤ گی جس نے کیلون کو بھیسی کی جان لینے پر مجبور کر دیا تھا۔"

یہ ایک شکستہ دل آور دہی باپ کی طرف سے دیا جانے والا ایک جائز اسائنمنٹ تھا لہذا یعنی نے اس کا کام کرنے کی ہائی بمر نے کے ساتھ ہی کہا۔

"میں سوکر (فٹ بال) کو پسند کرتی ہوں۔" برطانیہ اور اس کے زیر نگین رہنے والے تمام ممالک میں جس کھیل کو "فٹ بال" کہتے ہیں، امریکا میں اسی کھیل کو سوکر (Soccer) کہا جاتا ہے۔

ارب پتی جبو جاسن کے چہرے پر پہلی مرتبہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر سو ڈالرز والے لوٹوں کی اچھی خاصی تعداد یعنی کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے فراخ دل سے بولا۔

"یہ کسی حساب میں نہیں ہے۔ بس، تم آج ہی سے میرے کام پر لگ جاؤ۔ میں تمہارے پچھلے تمام گلے شکوے دور کر دوں گا۔"

یعنی نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

یعنی، جبو کی بیٹی فیسی کے قتل کے بارے میں کافی کچھ جانتی تھی لیکن اب چونکہ اسے اس پروجیکٹ پر باقاعدہ تفتیشی کام کرنا تھا اس لیے اس نے خود کو اپ ڈیٹ کرنے کے لیے مختلف ذرائع سے مزید معلومات حاصل کیں جس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

بائیس اپریل کی دوپہر گیارہ بج کر دو منٹ پر فیسی جاسن ماہونی اپنے عظیم الشان گھر "ہائی لینڈ پارک میوشن" سے نکلی تھی۔ اس کی کار دو ہزار پندرہ کا ماڈل "آئشن مارٹن" تھی جس کا نمبر "ڈی بی۔ تائن" تھا۔ ایک سفید رنگ کے فورڈ ٹرک نے ڈیس رینجی ہوٹل تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

یہ تمام ریکارڈنگ سیکورٹی کیمرز نے کی تھی۔ فیسی مذکورہ ہوٹل میں گیارہ بج کر تیس منٹ پر پہنچی تھی۔ اس نے اپنی کار کو ہوٹل ڈیس رینجی کے پارکنگ ایریا میں پارک کیا تھا جبکہ سفید فورڈ ٹرک ہوٹل کے سامنے رکھا تھا۔ اس ٹرک میں ایک سابق فٹ بال کھلاڑی کیلون ہیرس سوار تھا۔ اس نے تیس بال ریڈ کیب اور ہڈی پکڑ رکھی تھی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہڈی کی جیپوں میں کھسار کئے تھے۔ ایک

چہرہ لٹات کی پر اسرار خاموشی کے بعد اسے بی نے جواب دیا۔ ”صرف تیس ہزار ڈالر..... دس ہزار نقد اور بیس ہزار مختلف داد پر ہاری جانے والی رقم۔ جب اس کی جیب خالی ہوتی تھی تو وہ ادھار میں بھی جو اکیل لیا کرتا تھا۔“

”جب تم نے کیلون کی موت کی خبر سنی تو تمہیں کیسا محسوس ہوا تھا؟“ بیٹھی نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”ظاہر ہے اس کے اس دنیا سے اٹھ جانے پر تمہارے تیس ہزار ڈالر تو ڈوب ہی گئے تھے۔“

”مجھے کیلون کی موت کا انسوس ہوا تھا اور اپنی رقم ڈوب جانے کا دکھ بھی۔“ اسے بی نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔ ”ظاہر ہے، میں اپنی رقم وصول کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیلون اس دنیا سے جا چکا تھا اور اس کی بیوہ سوئٹرا پہلے ہی اس قدر مشکلات کا شکار ہے کہ میں اس کے مسائل میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سو، میں نے سب کچھ ادا کر دیا۔ پر چھوڑ کر خاموشی اختیار کر لی۔“

”حالانکہ اگر تم چاہتے تو کیلون کی زندگی ہی میں اپنا نقصان پورا کر سکتے تھے۔“ بیٹھی نے اندھیرے میں ایک تیر چھوڑا۔

”وہ کیسے؟“ اسے بی نے محتاط انداز میں سوال کیا۔

بیٹھی نے پہلے تیر کے اثرات کو دیکھتے ہوئے اندھیرے میں دوسرا تیر بھی چھوڑ دیا۔ ”میں نے سنا ہے شہر میں ایک شخص کیلون کے اینٹکس (Antics) میں گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے کیلون کی زندگی میں تم سے ضرور رابطہ کیا ہوگا۔“

”اینٹکس“ برے مفہوم کے لیے استعمال کیا جانے والا ایک مخصوص لفظ ہے۔ آپ اسے ایک ”نرم“ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہاں پر بیٹھی نے ”اینٹکس“ کا استعمال کیلون کے ”قرض چات“ کے لیے کیا تھا۔ امریکا میں بعض جرائم پیشہ افراد کی شخص کے مختلف ادھار کو خرید کر اس بندے کو اپنا مقروض بنالیتے ہیں۔ اب اس مجبور بندے نے کسی ایک ہی شخص کا ہماری قرضہ ادا کرنا ہوتا ہے جو کہ ظاہر ہے ایک ناممکن بات ہے۔ سو، وہ جرائم پیشہ شخص اس پسینے ہوئے بے بس اور لاچار آدمی سے اپنی مرضی کے کرائم کرانا شروع کر دیتا ہے۔ کیلون نے جس طرح بیٹھی کو شہوت کیا تھا، اس سے بیٹھی کے دماغ میں یہ بات آئی تھی کہ کہیں کیلون اپنے بے تحاشا ادھار کی وجہ سے کسی بڑے شخص کے چنگل میں تو نہیں پھنس گیا تھا؟ اسی سوچ کے تناظر میں بیٹھی نے اسے بی سے اینٹکس کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

”ہاں، ایک شخص نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔“ اسے بی نے صاف کوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ گویا بیٹھی کا اندھیرے میں چھوڑا ہوا تیر جا کر نشانے پر بیٹھا تھا۔ ”اور میں نے اس بندے سے کہہ دیا تھا کہ کیلون کی طرف میرا ایک سینٹ بھی نہیں نکلتا۔“

”تو تم نے اس شخص سے غلط بیانی کی تھی؟“

”ہاں، میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔“ اسے بی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”دراصل میں کیلون کو کسی بڑی مصیبت کے منت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔“

”اسے بی ا“ بیٹھی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہزار خرابیوں کے باوجود بھی تم ایک رحمدل اور خدا ترس انسان ہو۔“

”اور تم ایک ہوشیار اور ذہین پولیس والی۔“ اسے بی نے ستائشی نظر سے بیٹھی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں واپس ڈی بی ڈی میں چلے جانا چاہیے۔ تمہاری اصل جگہ وہی ہے۔“

بیٹھی نے اپنی تعریف کو نظر انداز کرتے ہوئے بوجھا۔ ”تمہارے تجربے اور محتاط اندازے کے مطابق کیلون پر قرضوں کا کتنا بوجھ تھا؟“

”کم از کم دو سو ہزار اور زیادہ سے زیادہ پانچ سو ہزار یعنی نصف ملین ڈالر۔“ اسے بی نے جواب دیا۔

”اوہ.....!“ بیٹھی ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے پرمشوش آواز میں بولی۔ ”اتنی بڑی رقم کسی بھی شخص کو قاتل بننے پر مجبور کر سکتی ہے۔“

”تو تم یہ سمجھتی ہو کہ کسی نے بیٹھی جاسن کو قتل کرانے کے لیے کیلون ہیرس کو استعمال کیا تھا؟“

”کیا تمہارے خیال میں یہ کوئی ناممکن بات ہے؟“ بیٹھی نے تڑکی بہ تڑکی سوال کیا۔

”نہیں..... ایسا ہو سکتا ہے۔“ اسے بی تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یہ کیسے پتا چلے گا کہ کیلون کو ایسے قاتلانہ اقدام پر کس نے مجبور کیا تھا؟“

”ابھی شخص نے جس نے کیلون کے تمام قرضے خرید لیے تھے۔“

”ہو سکتا ہے وہ بندہ کسی اور کا نمائندہ ہو اور اس کے پیچھے کوئی اور ہی بیٹھا ہو۔“ اسے بی نے ایک امکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”عموماً یہ معاملات اسی طرح چلا کرتے ہیں۔“

”میں اگر اس بندے تک پہنچ گئی جو کیلون کا قرضہ خریدے تمہارے پاس آیا تھا تو پھر اس کے عقب میں چھپے

ہوئے کسی پردہ نشین تک رسائی حاصل کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، وہ شخص تم سے ملنے کب آیا تھا؟“

”کیلون کی موت سے گگ بھگ ایک ماہ پہلے۔“ اسے بی نے جواب دیا۔

بیٹھی نے سوال کیا۔ ”میں اس کے علیے، عمر اور قد کاٹھ کے بارے میں سب کچھ جانتا چاہوں گی۔ تمہیں جتنا بھی یاد ہے، مجھے بتاؤ، میں نوٹ کر رہی ہوں۔“

آئندہ چندہ منٹ میں اسے بی نے بیٹھی کو اس کی مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔ بیٹھی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ڈونٹ این پور ریم سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

وہ سہ پہر کا وقت تھا۔ بیٹھی ڈیلگا ڈوائپے آفس میں بیٹھی اب تک کی کارگزاری پر غور کر رہی تھی۔ اس کی تفتیش کے نتیجے میں اس کیس کے کئی ایک پہلو اجاگر ہوئے تھے اور وہ ان میں سے ہر ایک کو باری باری چیک کر رہی تھی۔

اس بات کا امکان بہر حال موجود تھا کہ اسے بی نے اپنے تیس ہزار ڈالر وصول نہ کرنے کے حوالے سے جھوٹ بولا ہو۔ بہر حال، اس نے کیلون کے قرضے خریدنے والے شخص کی شناخت ظاہر کر کے بیٹھی پر ایک طرح سے احسان کیا تھا۔ اس لیڈ کے بعد وہ بہ آسانی اپنے کام کو آگے بڑھا سکتی تھی۔

ایک پہلو کیلون کے حسد، نفرت اور انتقام کا تھا مگر بیٹھی کو اس میں جان نظر نہیں آئی۔ یہ درست ہے کہ کیلون کو پیسوں کی شد ضرورت تھی لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ وہ بیٹھی کو بلیک میل کرنے ڈیلر رجسٹری ہوں پہنچا تھا تو یہ بات جتنی نہیں تھی کیونکہ وہ بیٹھی کا تعاقب کرتے ہوئے مذکورہ ہوئے تو پہنچا تھا لیکن وہاں پر اس کی مصروفیات اس امر کی گئی کرتی تھیں جیسا کہ وہ لفٹ کے ذریعے فوراً فلور پر پہنچا تھا اور ایک بار بھی اس نے مزید اوپر جانے کی کوشش نہیں کی جبکہ بیٹھی لابی کے ریسپشن سے اپنے کمرے کی چابی حاصل کرنے کے بعد سیدھی ایٹھ فلور پر پہنچی تھی۔ بیٹھی کو یارے فریڈ فرینکلن بلٹر ہوئے کے سامنے والے دروازے سے داخل ہو کر لفٹ کے ذریعے بیٹھی کے کمرے واقع ایٹھ فلور میں گیا تھا یعنی کیلون نے فرینکلن کو آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ تو فوراً فلور پر تھا۔ جب کیلون کو معلوم ہی نہیں تھا کہ بیٹھی کا ہوا ہے فریڈ اس کے کمرے میں موجود ہے تو پھر حسد اور نفرت کیسی؟ علاوہ ازیں کیلون لفٹ پکڑ کر فوراً فلور

بہترین تحریریں، لا جواب رد و اد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت ماہنامہ

شمارہ اکتوبر 2024ء کی جھلکیاں

مرد کوہستان

زویا صفوان کے قلم سے ایک اہم شخصیت کا زندگی نامہ جس کے کارناموں سے پاکستانی کم کم واقف ہیں

لٹل ماسٹر

محمد سجاد خان سنار ہے جس کرکٹ کے حباد و گر کی داستان

جام جم

ندیم اقبال کی شہکار تحسیر، سینما سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے

آخری فیصلہ

مہم جوئی پسندوں کے لیے اے آر اوجیوت کالا جواب تحفہ

زمزمیور

شبابین کمال لائی ہیں ایک سو دکھ بھری سچ بیانی جسے پڑھتے ہی آنکھیں کھجواں گیں

ایک لمحہ عوالم

متبول سلسلے وار سرگزشت ”سیر جنون“ مہمات کی دلچپ داستانیں، شکار کھا، جرم و سزا کی کہانیاں

ہر شمارہ خاص شمارہ

نزدیکی بک اسٹال پر شمارہ مختص کرالیں

سے نیچے لابی میں آگیا تھا اور وہاں بار میں بیٹھ کر برگر اور دہی کے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ ٹیسی نے کم و بیش چار گھنٹے اپنے روم میں گزارے تھے اور اس دوران میں کیلون بار میں بیٹھا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اگر وہ حد نفرت اور انتقام کے جذبے سے مغلوب ہوتا تو اسے چار گھنٹے بار میں صانع کرنے کے بجائے سیدھا بیٹھ کر پورے ٹیسی کے کمرے میں پہنچ جانا چاہیے تھا۔

یہ سوچتا بھی ٹیسی اور منٹک سے خالی تھا کہ کیلون پیسوں کے لیے ٹیسی کو بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ وہ مختلف شرمناک تصاویر اور ویڈیو ٹیسی کے شوہر اسٹیو ماہونی یا اس کے باپ جو جانسن کو دکھا کر ان سے کوئی ٹکڑی رقم ایشیے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگر واقعتاً ایسا کچھ ہوتا تو پھر وہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی (ٹیسی) کو موت کے گھاٹ کیوں اتارتا؟

ان حالات و واقعات سے ٹیسی ثابت ہوتا تھا کہ کیلون ہر قیمت پر ٹیسی کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایسا کیوں چاہتا تھا، اسی سوال کا جواب تو ٹیسی کو تلاش کرنا تھا۔

ٹیسی نے بڑی رنگین زندگی گزار دی تھی۔ وہ کیلون کے علاوہ بھی فٹ بال کے متعدد کھلاڑیوں کے ساتھ سوٹی رہی تھی اور اب اس کی شادی ہو چکی تھی۔ دیکھنا یہ تھا کہ ڈیس میں ٹیسی کا ایسا کون سا دشمن تھا جس نے کیلون کا لاکھوں ڈالرز کا قرض خرید کر اسے ٹیسی کو ہلاک کرنے کا کام سونپا تھا؟

اس روش پر سوچ کے گھوڑے دوڑانے کے دوران میں درجن بھر نام اس کے دماغ کی اسکرین پر نمودار ہو گئے۔ وہ ایک ایک نام کو باریک بینی سے چیک کرتی چلی گئی پھر ایک نام پر اس کی نگاہ جم کر رہ گئی۔
”یہ خرام زادہ ہو سکتا ہے۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

اگلے ہی لمحے اس کے ذہن میں ماری گراہم کا نام چکا۔ اس نے سوچا۔ ”مجھے آج ہی جا کر ماری گراہم سے بات کرنا چاہیے۔“

ماری گراہم ایک نائٹ کلب میں ویٹر ٹیسی تین سال پہلے جو جانسن کی فٹ بال ٹیم کے ایک کھلاڑی نے ماری پر بری طرح تشدد کر کے اس کے جڑے کو ٹیڑھا کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں اس کے کئی دانت بھی ٹوٹ گئے تھے۔ ان دنوں ٹیسی اسی معاملے کی تفتیش کر رہی تھی لیکن جو جانسن نے اپنے تعلقات اور اختیارات کا استعمال کر کے ٹیسی کو نہ صرف اس کیس سے ہٹا دیا تھا بلکہ اسے پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہی نکلوا دیا تھا۔

ٹینسی اپنے آفس سے نکلی اور ماری گراہم کی جانب روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

تین سال پہلے جب ٹیسی ماری گراہم پر ہونے والے تشدد کے معاملے کو دیکھ رہی تھی تو ان دنوں ماری ایک چھوٹے سے فلیٹ میں کسی لڑکی کے ساتھ رہ رہی تھی لیکن اب وہ ایک کوئڈو (سپر کٹوری اپارٹمنٹ) میں رہائش پذیر تھی۔ ٹیسی یہ شانہ لائف اسٹائل دیکھ کر حیران رہ گئی۔

رہی ملک ملک کے بعد ٹیسی نے اس سے پوچھا۔ ”صرف تین سال میں ایسی شاندار ترقی..... کیا تمہاری لوٹو (امریکی لٹری جس کی رقم ملین ڈالرز میں ہوتی ہے) لگ گئی ہے؟“

”میں نے کبھی لوٹو میں حصہ نہیں لیا۔“
”پھر یہ ٹھاٹس باٹ؟“ ٹیسی نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

تین سال پہلے ماری پر ہونے والے ظلم کے خلاف ٹیسی نے آواز بلند کی تھی اور ذاتی حیثیت سے بھی اس کی حتی المقدور اخلاقی اور مالی مدد کی تھی وہ اس صدمے سے نکل پائی تھی۔ اس سب کے لیے ماری، ٹیسی کی ممنون احسان تھی اور ان دنوں ان کی اکثر ملاقات بھی ہوتی رہتی تھی لیکن پھر ٹیسی کو ڈیپارٹمنٹ سے نکال دیا گیا اور ان کے میل ملاپ کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔

”میں دنیا کے ہر شخص سے جھوٹ بول سکتی ہوں مگر تم سے نہیں کیونکہ تم نے انتہائی بُرے حالات میں میرا ساتھ دیا تھا۔“ ماری نے ٹیسی کے لیے جواب دیا۔ ”اس کوئڈو کی قیمت تین سو پچاس ہزار ڈالرز ہے۔ ایک نائٹ کلب ویٹریس ایسا پیش قیمت اپارٹمنٹ خریدنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ سمجھ لو، یہ کسی کی عنایت ہے۔“

ماری نے ذہنی انداز میں بات مکمل کی تو ٹیسی یہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ ”اس دنیا میں کوئی کسی پر خواہ مخواہ اتنی عنایت کی گئی بھاری قیمت چکانی ہے۔ تم مجھے سب سچ بتاؤ گی..... ہیں؟“

”ایک سودا۔“ وہ معتدل انداز میں بولی۔ ”ایک ایگریمنٹ پر دستخط۔ پس!“

”کیسا سودا اور کون سا ایگریمنٹ ماری؟“ ٹیسی نے دوبارہ اس کی تفتیش کر دی۔
”ڈان بندری کا سودا اور اپنے ساتھ ہونے والی

زیادتی پر داغی خاموشی اختیار کرنے کا ایگریمنٹ۔“
”کیا تم سے یہ سب کچھ جو جانسن نے کرایا ہے؟“ ٹیسی نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ”کیونکہ اسی کی فٹ بال ٹیم کے ایک کھلاڑی نے تمہارے ساتھ وہ بدترین سلوک کیا تھا۔ جو نہیں چاہتا تھا کہ یہ معاملہ زیادہ اچھے اور اس کی ٹیم کی بدنامی ہو۔ اسی لیے اس نے اپنی طاقت کا استعمال کر کے مجھے ڈی پی ڈی ہی سے نکلوا دیا تھا کیونکہ میں جو جانسن کے زیر اثر اپنے سینئر کی بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔ میں جبوی کی اصلیت کو عوام کے سامنے لانا چاہتی تھی۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہاری پولیس کی نوکری چلی گئی۔“ ماری گراہم نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”دیسے تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ مجھ سے وہ ایگریمنٹ جو جانسن نے نہیں بلکہ اس کے داماد اسٹیو ماہونی نے سائن کرایا تھا۔“

”ایک ہی بات ہے۔“ ٹیسی نے سرسری انداز میں کہا۔ ”ماہونی، جو کارائٹ پیٹ ہے۔ جو کہ تمام قانونی اور غیر قانونی معاملات کو وہی ڈیل کرتا ہے۔“ لہذا ہی توقعہ کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارے پاس اس ایگریمنٹ کی کاپی تو ہوگی۔ میں دیکھنا چاہوں گی اس کے اندر کیا کیا لکھا ہوا ہے۔“

”سوری ٹیسی! میرے پاس کوئی کاپی نہیں ہے۔“ ماری نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”وہ ایگریمنٹ کئی صفحات پر مشتمل تھا اور اس میں اسٹیو ماہونی نے کئی جگہ پر مجھے سے سائن کرائے تھے اور مجھے سمجھ کی گئی کہ اگر میں نے اس ڈیل کے بارے میں کسی کو بتایا تو پھر میری جان کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔ ٹیسی! میں نے تمہیں اپنا سمجھ کر سب کچھ سچ بتا دیا ہے۔ پھر میرے اس راز کو کسی اور کے ساتھ شیئر نہیں کرنا۔“

”ڈونٹ وری ماری!“ ٹیسی نے گہری تنبیہ کی۔
”میں اپنی باتوں کو سنبھالنا چاہتی ہوں۔“

ماری تشکرانہ نظر سے اسے دیکھنے لگی۔
ٹیسی اسے تسلی بخشی دینے کے بعد عالی شان کوئڈو سے باہر نکل آئی۔ اس کی اگلی منزل کیلون ہیرس کی بیوہ سوئڈرا کا سخت حال تھا مگر جس کے ہاں وہ نے اس نے جی ایم سی (جنرل موٹرز کارپوریشن) کی ایک بیوہ برائنڈین پوڈی گاڑی ”ڈینیال“ خریدی تھی۔ ڈینیال بھی سوئڈرا کی

موجودہ کیفیت سے میل نہیں کھاتی تھی۔ جہاں پر صبح شام کھانے کے لالے پڑے ہوں، وہاں ستر ہزار ڈالر مالیت کی گاڑی کسی بھی طور فٹ ان دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس سستی خیز خیال نے ٹیسی کو ایک مرتبہ پھر سوئڈرا کی طرف جانے پر مجبور کر دیا تھا کہ..... ”میں سوئڈرا نے بھی وہ ایس پوڈی گاڑی کسی ایگریمنٹ کو سائن کرنے کے بعد تو حاصل نہیں کی تھی؟“

سورج غروب ہونے میں ابھی کافی وقت باقی تھا۔ ٹیسی نے ایک اسٹور سے کیلون کے بچوں کے لیے ڈونٹ، چاکلیٹ، آئس کریم اور کھلونے وغیرہ خریدے اور ایک دفعہ پھر سوئڈرا کے دروازے پر پہنچ گئی۔

اس بار ٹیسی کو سوئڈرا کے کمرے کے اندر رسائی حاصل کرنے میں کمی دقت یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ٹیسی کے چہرے پر کئی ہوئی دوستانہ مسکراہٹ اور اس کے ہاتھوں میں ایک معروف اسٹور کے چار پانچ بیگ دیکھ کر سوئڈرا دروازہ کھولنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

”یہ سب تمہارے بچوں کے لیے ہے۔“ ٹیسی نے وہ تمام بیگز سوئڈرا کو کھاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ ہمارے درمیان جو بھی گفتگو ہوگی، وہ اس کمرے سے باہر نہیں جائے گی۔ مجھ پر بھروسہ کرو سوئڈرا! میں صرف تمہارے شوہر کیلون کی موت کے ذمے داروں کو کڑی سزا دلوانا چاہتی ہوں۔“

”مگر میں ایسا نہیں چاہ سکتی۔“ سوئڈرا نے بے بسی سے کہا۔

سوئڈرا کے لہجے سے جھلکتی لاچاری اور لفظ ”سکتی“ نے ایک مرتبہ پھر ٹیسی کو گھٹا دیا۔ سوئڈرا پچھلی دفعہ بھی ایسی ہی بے بسی کا اظہار کر چکی تھی۔

”میں چاہ سکتی کا کیا مطلب ہوا سوئڈرا؟“ ٹیسی نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔ ”کیا تم پر کسی قسم کا باؤ ہے؟“

سوئڈرا کوئی جواب دینے کے بجائے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ ان لحاظ میں وہ کسی خوفناک تذبذب کا شکار نظر آتی تھی۔

”دیکھو، میں نے اپنی کوشش سے پتا لگایا ہے کہ کسی شخص نے کیلون کے لوٹ خرید کر اسے اپنا غلام بنالیا تھا۔“ ٹیسی نے بڑے احماد کے ساتھ کہا۔ ”کیلون نے ٹیسی جانسن کے ساتھ جو کیا، اس میں کیلون کی مرضی شامل نہیں تھی۔ میں بس یہ چاہتی ہوں کہ تم اس سچائی کی تصدیق کرو۔ اس کے بعد میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

سوئڈر ایسٹ پڑی۔ ”تمہاری ریسرچ بالکل درست ہے۔“ اس نے لمبی کی ہمدردانہ اور مخلصانہ باتوں سے متاثر ہوتے ہوئے گویا آواز میں کہا۔ ”کیلون مجبور ہو گیا تھا اور میں بھی مجبور ہوں کیونکہ میں نے ایک ایگریمنٹ سائن کیا ہے۔ میں اس ایگریمنٹ کے خلاف نہیں جاسکتی ورنہ میرے دونوں بچوں کو لکڑیا جائے گا۔“

”تو باہر مال دے میں کھڑی دینا اسی ایگریمنٹ کے بدلے میں تمہیں دی گئی ہے؟“ لمبھی نے ایک فوری خیال کے تحت سرسراہٹ ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ”تا کہ تم کیلون کے اس مجرمانہ عمل کے حوالے سے اپنی زبان پر تالا ڈال کر رکھو۔“

”ہاں۔“ سوئڈر نے اثبات میں جواب دیا۔ ”کیلون کے بعد میں اپنے بچوں کو بے دردی سے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی اس لیے میں نے وہ کئی صفحات پر مشتمل ایگریمنٹ سائن کر دیا تھا۔“

”تمہارے پاس اس ایگریمنٹ کی کاپی ہے؟“ لمبھی نے اس کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔

سوئڈر کا جواب ماری گرام سے مختلف نہیں تھا۔ ”اس نیو براؤن ایس یووی دینا کے علاوہ تمہیں اور کیا دیا گیا ہے؟“ لمبھی نے پوچھا۔

”کیلون کے تمام کوڑے (قرضہ جات) معاف کر دیے گئے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ رقم آدھے ملین ڈالرز سے کچھ زیادہ تھی۔“

”کیا وہ ایگریمنٹ سائن کرانے کے لیے ٹیسی کا شوہر اسٹیو ماہونی تمہارے پاس آیا تھا؟“ لمبھی نے ایک اہم سوال کیا۔

”نہیں، وہ کوئی اور شخص تھا۔“ سوئڈر نے جواب دیا۔ ”میں جبو جانسن اور اسٹیو ماہونی کے چہروں کو پہچانتی ہوں۔ میں نے انہیں ٹی وی پر اور اخبارات میں دیکھا ہے۔ جس شخص نے مجھ سے ایگریمنٹ سائن کرایا، وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔“

لمبھی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوئڈر کو اس بندے کے لیے، قد کاٹھ، جسامت، عمر اور بالوں کے رنگ و اسٹائل کے بارے میں تفصیل سے بتایا جو اسے بی (ایڈریو یورس) کے ہیرو میں کیلون کا قرضہ خریدنے آیا تھا۔ سوئڈر نے پوری توجہ اور دلچسپی سے اس کی بات سنی اور لمبھی کے خاموش ہونے پر اس کے شک کی تصدیق کر دی۔

لمبھی نے سوئڈر کے دونوں بچوں کو پیار کیا اور یہ دل سے اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ وہاں سے نکل آئی۔

☆ ☆ ☆

آئندہ روز لمبھی ڈیلگا ڈونے ایک آرٹسٹ کی خدمات حاصل کر کے اپنی فراہم کردہ تفصیلات کی بنا پر اس شخص کا اچھا تیار کرایا جو اسے بی سے کیلون کا قرضہ خریدنے اور سوئڈر سے ایگریمنٹ سائن کرانے آیا تھا۔ مذکورہ اچھا کو اپنے سسٹم میں ڈال کر جب لمبھی نے اس کے ”میج“ تلاش کرنے کی کوشش کی تو ڈیس میں اس سے ملتی جلتی شکل کے بارہ افراد مل گئے جن میں سے ایک کا نام کونر تھا اور وہ جبو جانسن کے اسپورٹس پیلیس کا سپروائزر تھا۔

لمبھی نے کونر پر فوکس کر کے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو پتا چلا وہ اسٹیو ماہونی کی ماتحتی میں کام کرتا تھا اور بڑی خبر یہ تھی کہ ٹیسی اور کیلون کی موت کے چند روز بعد ہی کونر کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔ کونر سڑک پار کر رہا تھا کہ ایک گاڑی سائڈ اسٹریٹ سے نکلے اور اسے چلتے ہوئے یہ جا دہ جا۔

اب لمبھی کے پاس اتنا مواد جمع ہو گیا تھا کہ رات کو دیر تک جاگ کر اس نے پچاس صفحات پر مشتمل اپنی کارکردگی کی تفصیل رپورٹ تیار کر ڈالی۔ حالانکہ جبو نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ اسے کاغذ کا پلندہ نہیں بلکہ ایک سٹوری رپورٹ چاہیے۔ لمبھی نے جبو جانسن کی خواہش کے مطابق ایک مختصر سی ایک سٹوری رپورٹ بھی تیار کر دی تھی۔ اگرچہ وہ سطر خاصی طویل تھی جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔

”اسٹیو ماہونی نے کیلون ہیرس کے تمام قرضے خرید کر اسے ٹیسی کو قتل کرنے کے لیے مجبور کیا تھا کیونکہ وہ جبو جانسن کی ساری دولت و جائداد اور اسپورٹس کے بزنس پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ٹیسی کو راجے سے ہٹانا ضروری تھا کیونکہ ماہونی کئی وجوہ کی بنا پر ٹیسی اور اس کے بوائے فرینڈز سے شدید نفرت کرتا تھا۔“

لمبھی کی تیار کردہ وہ دونوں چھوٹی بڑی رپورٹس کسی ایٹم بم سے کم نہیں تھیں اور اس ایٹم بم کو ماہونی کے سر پر پھونکنے کے لیے وہ ان کی سب سے قیمتی چیز تھی اور وہ بھی ناقصانہ اعتبار کے ساتھ۔

جنو اپنے خوشدلی اور گہری سنجیدگی سے اس کا استقبال کیا اور اس کے چہرے پر نگاہ جم کر معتدل انداز میں کہا۔

”اگر میں غلط نہیں تو تم نے میرا کام کر دیا ہے؟“

”تمہارا اندازہ درست ہے جبو جانسن!“ لمبھی جوش بھرے لہجے میں بولی۔ ”یہ رہی میری رپورٹ۔“

بات کے اختتام پر اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے مذکورہ رپورٹ نکال کر جبو کے سامنے رکھ دی۔

”میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ مجھے کاغذات کے ڈھیر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ جبو جانسن بڑا سانسہ بتاتے ہوئے بولا۔ ”تم پھر بھی یہ پلندہ اٹھالائی ہو؟“

”یہ پلندہ اور اصل ایک ریٹرنس ریکارڈ ہے۔“ لمبھی نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تا کہ آپ خود رت موسوس کریں تو میری رپورٹ کے مختلف پوائنٹس کو بہ آسانی چیک کر سکیں۔“

”تو اصلی رپورٹ کہاں ہے؟“ جبو نے اضطرابی لہجے میں استفسار کیا۔

لمبھی نے اپنے بیگ کی فرنٹ پاکٹ میں سے وہ لفافہ نکال کر جبو کی جانب بڑھا دیا جس کے اندر الفاظ کے یورنیم سے تیار کیا جانے والا ایٹم بم رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹھوس انداز میں کہا۔

”یہ رہی تمہارے حسب فشار رپورٹ..... مختصر، موثر اور سوچ میں بیوقوفانہ پیدا کردینے والی رپورٹ۔“

جبو جانسن نے اس ایک سٹوری رپورٹ کو بڑے اشتہاک کے ساتھ پڑھا پھر تحسین آمیز نظر سے لمبھی کو دیکھ لگا۔

”اگر میرا اندازہ غلط نہیں مسٹر جبو!“ لمبھی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم یہ بات پہلے سے جانتے تھے۔“

”ہاں..... مگر میں تمہارے جیسی ذہین، شاطر اور تجربہ کار انوسٹیگیٹر سے اس کی تصدیق چاہتا تھا۔“ جبو نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے میرا کام اچھے سے کر دیا ہے۔“

”اب آگے کیا...؟“ لمبھی نے پوچھا۔

”تمہاری جاب ختم ہو گئی ہے۔“ جبو نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ”آج کی تاریخ میں میرے ایک آف شور اکاؤنٹ سے تمہارے اکاؤنٹ میں فنڈز ٹرانسفر ہو جائیں گے، تمہاری محنت کی فیس کے طور پر۔“

لمبھی نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک اہم سوال کر دیا۔ ”اب تم اپنے داماد اسٹیو ماہونی کا کیا کرد گے؟“

”یہ جانتا تمہارے لیے ضروری نہیں ہے۔“ جبو نے خشک لہجے میں کہا۔ ”میرے خیال میں تمہیں یہاں سے جانا

چاہیے۔“

اس کے بعد لمبھی نے ایک لفظ نہیں کہا اور اپنا بیگ اٹھا کر جبو جانسن کے آفس سے باہر نکل آئی۔

ایک گھنٹے کے بعد اس کے کل فون پر فنڈز ٹرانسفر کا نوٹیفکیشن موصول ہوا۔ جبو نے اپنے ایک غیر ملکی اکاؤنٹ سے دن ملین ڈالرز ٹرانسفر کر دیے تھے۔ اتنی بڑی رقم کی بھی صورت میں اس کی فیس تو ہو نہیں سکتی تھی۔ لمبھی نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر دیا کہ..... جبو جانسن نے تین سال پہلے اس کے ساتھ جو زیادتی کی تھی، یہ جبو کی حیثیت کے مطابق اس کا کفارہ تھا۔

☆ ☆ ☆

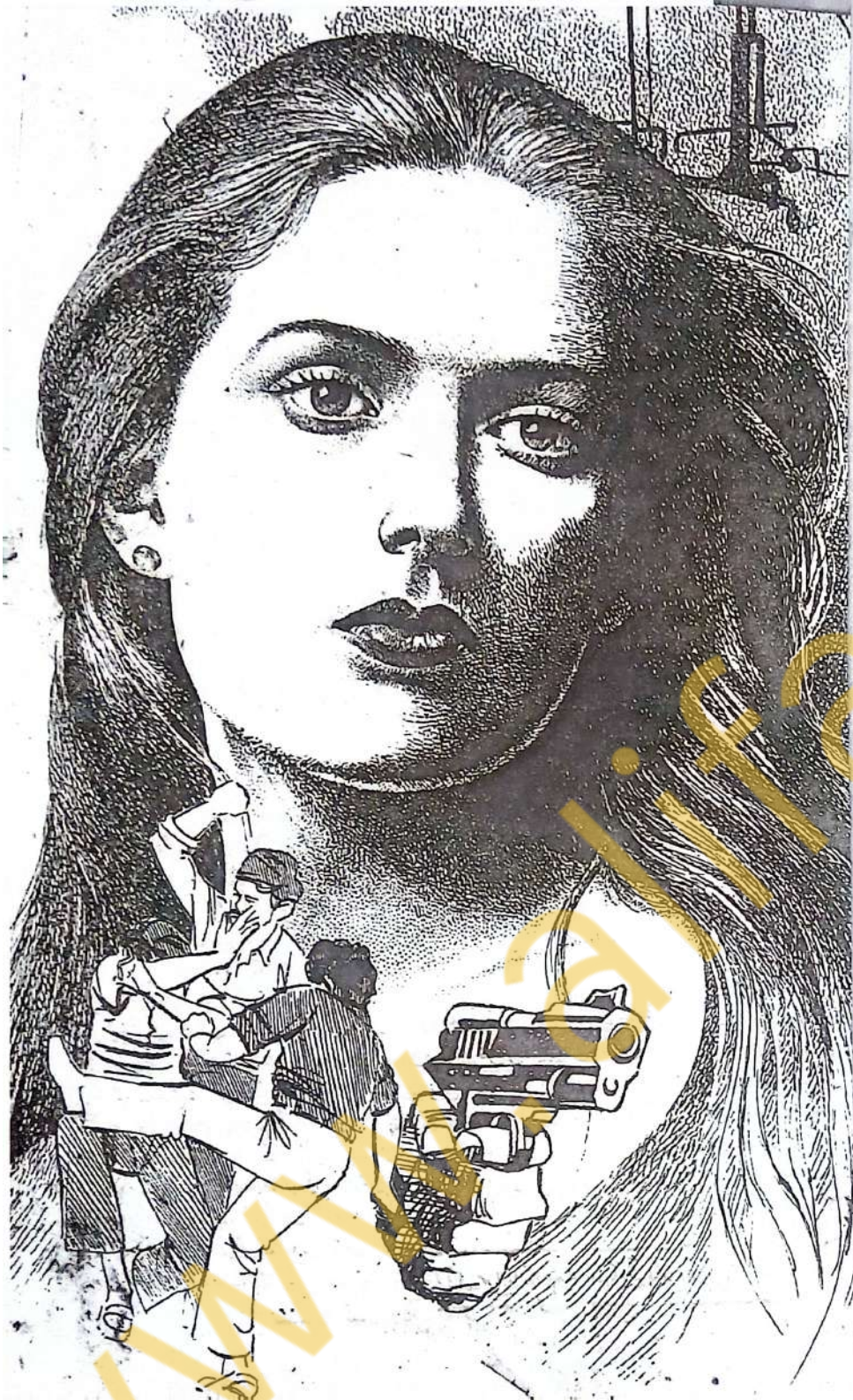
چند روز کے بعد ایک سنسنی خیز خبر نے پورے ڈیس کو ہلا کر رکھ دیا۔ ارب پتی اسپورٹس اور جبو جانسن نے اپنے داماد اور مستند خاص اسٹیو ماہونی کو قتل کرنے کے بعد خود کو گولی مار کر ہلاک کر لیا تھا۔ ان دونوں کی لاشوں کے نزدیک ہی جبو کا یہ ٹوٹ بھی ملا تھا۔

”میں ایک جان لیوا مرض میں کافی عرصے سے مبتلا تھا لیکن اس میوزی بیماری کے بارے میں میرے ڈاکٹر کے سوا اور کوئی شخص کچھ نہیں جانتا تھا۔ اب ڈاکٹر نے مجھے بتایا ہے کہ میرے پاس صرف ایک مہینہ ہے۔ میں اس سے زیادہ جی نہیں پاؤں گا۔ میں تو اسی وقت مر گیا تھا جب میرے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ٹیسی کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ میں چند ماہ صرف اس لیے زندہ رہا کہ ٹیسی کی موت کے احکامات صادر کرنے والے شخص کو ڈھونڈ کر عبرتناک سزا دے سکوں۔ یہ نیک کام میں نے کر دیا ہے۔ میرے ٹھک حرام داماد اسٹیو ماہونی کے جرائم کے تمام ٹھوس ثبوت میری دراز میں رکھے ہیں۔ میں نے اپنی تمام دولت، جائداد اور بزنس کے حوالے سے وصیت تیار کرانے کے بعد اسے اپنے وکیل کے پاس محفوظ کر دیا ہے۔ میری موت کے بعد میرے وکیل مسٹر ہیئر سے رابطہ کیا جائے..... ایک دن کی باپ، جبو جانسن!“

لمبھی ڈیلگا ڈونے کے ہاتھ سے اخبار پھیل کر دوڑ جا کر۔

فرط جذبات سے اس کی آنکھیں چمک آئی تھیں۔ ان لمحات میں لمبھی کو محسوس ہوا کہ جبو اتنا بھی بڑا انسان نہیں تھا، جتنا وہ اسے سمجھتی تھی۔

دام زرا سی طرح انسان کو حیوان بنا دیتا ہے، پھر بتائی اور بربادی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔



زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی یہ قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تاریک عبوت نے طاقت اور گھمٹ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ پروار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قربان کرنا زل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحریر انجمن داستان

مرحلے سے گزرنے کے بعد معاذ نے دلی جذبات کے ساتھ یہ ہلکا داکیا۔

”میری خواہش ہے کہ یہاں سے واپسی تک یہ خوشی قائم رہے۔“ ابو حمزہ نے کہا اور ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ فرشتی قالین پر بٹھالیا۔ بیٹھے پر معاذ کو سکون سا محسوس ہوا۔ وہ جن راستوں سے گزر کر آیا تھا اور اب جس کمرے میں موجود تھا، ان سب جگہوں کی چھتیں بہت چمکی تھیں۔ اگرچہ اتنی چمکی نہیں تھیں کہ جبکہ کل چلنا پڑتا لیکن سر سے بس چداچ ہی اوپر ہوں گی۔ اپنی اچھی قسمت کی وجہ سے وہ ان چھتوں کے نیچے بلاوجہ ہی کاٹھنٹس ہوا جا رہا تھا۔

”جس دوست نے آپ کا حوالہ دیا تھا، اس نے بہت امید لائی تھی کہ آپ مجھے انکار نہیں کریں گے۔ بھول اس کے انکار کا جواز ہی نہیں بنتا۔ ہمارا دشمن بھی ایک ہے اور مقصد بھی۔“ اس نے وقت ضائع کیے بغیر اصل مسئلے پر گفتگو شروع کر دی۔

”تمہارا بہت مجھے بریف کیا گیا ہے۔ باقی تفصیل تم بتاؤ۔“ ابو حمزہ نے نرم لاش کی۔ ان کی اس گفتگو کے دوران ارتضیٰ ایک جانب سر جھکا کر خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا جبکہ خود ابو حمزہ کا سامنے دروازے کے قریب موجود تھا۔ اپنے محفوظ ترین ٹھکانے پر ہوتے ہوئے بھی اس کی نظریں یوں اتر کر منزلہ لاری تھیں جیسے کسی دشمن کو کھوج رہی ہوں۔ ہتھیار کے دستے پر جہاں ہاتھ بھی کسی بھی لئے فائز تک کے لیے تیار تھا۔

”تفصیل زیادہ طویل نہیں۔ بات بس اتنی ہی ہے کہ اسرائیل نے ضرورت سے زیادہ پر پزے لگانا شروع کر دیے ہیں۔ فلسطین پر قبضہ کرنے کے بعد اب یہ دنیا پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں ان کے اس خواب کو سبوتاژ کرنا ہے اور انہیں ایسی زک پہنچانی ہے کہ ان کی کمر ٹوٹ جائے اور بہت طویل عرصے تک یہ اپنے ایسے کسی خواب کو تعبیر دینے کا سوچ بھی نہ سکیں۔ ہم اپنے منصوبے پر کام کرنے کے لیے بنیادی معلومات حاصل کر چکے ہیں اور اپنا لائحہ عمل بھی تیار کر لیا ہے لیکن اسلحہ، افرادی قوت اور دیگر کچھ معاملات میں ہمیں آپ کی مدد درکار ہے۔“ اس نے کچھ اور تفصیلات بھی ابو حمزہ کے گوش کر رکھیں۔

”ہوں.....“ سن کر اس نے ایک زوردار ہنگامہ بھرا ہر جیب سے لہجے میں بولا۔

”ہم جو ستر برس سے زیادہ عرصے سے اسرائیلی قلم و جبر کی چکی میں پھنس رہے ہیں، اس سارے مدے میں کہیں

اندازہ قائم کرتے ہوئے ارتضیٰ سے سوال کیا جس کے جواب میں اس نے محض گردن کو اٹھاتے میں جنبش دی اور اس ہال نما کمرے کے دائیں گوشے میں موجود ایک دوسرے دروازے پر دستک دی۔ دستک کے ساتھ ہی اس نے بلند آواز میں اپنا تعارف بھی کر دیا۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور ایک بارش جوان کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس جوان نے باری باری ان دونوں سے مصافحہ کیا اور پھر اطلاع دی۔ ”ابو حمزہ ملاقات کے لیے منتظر ہیں۔“ یہ نام سن کر معاذ کے سارے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ وہ ابو حمزہ سے ملے ہی یہاں تک آیا تھا لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ چند لمحوں میں وہ ایک ایسے شخص کے دربرو ہوگا جس کی شخصیت اسرائیل کے پردوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ جسے سب جانتے تھے لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ مشکل سے ہی منظر عام پر آتا تھا۔ بس اس کے پٹیاں، تھیں، احتیاجی بیان یا دنیا کی غیرت کو جھجھونے کی پکاریں ہی تھیں جن کی بازگشت دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ سے سنائی دیتی رہتی تھیں۔ وہ ایک چھلواوا تھا جسے گرفتار کرنے کی آرزو اسرائیل کے خفیہ اداروں سمیت ان کے بہت سے حواری اپنے دل میں لیے پھرتے تھے لیکن کامیابی نے آج تک کسی کے قدم نہیں چومے تھے۔ چنانچہ آج اگر اس شخص کے دربرو ہونے کے خیال سے اس کا دل دھڑک رہا تھا تو یہ کچھ انوکھا نہیں تھا۔

مصافحہ کرنے والا جوان انہیں اپنے سنگ ایک اور اندرونی کمرے میں لے گیا۔ یہاں ایک شخص فرشتی میز کے پیچھے بیٹھا اپنے آگے ایک بڑا سا نقشہ پھیلانے ہوئے اٹھا۔ اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ آہٹ پر وہ ان کی طرف متوجہ ہوا اور خوشدلی سے مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہ دبلا پتلا اور قدرے پست قد تھا اور اس کی عام سی شخصیت کو دیکھ کر یقین نہ کرنا مشکل تھا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے اسرائیل سمیت دنیا کی بڑی بڑی خفیہ ایجنسیوں کو مشکل میں ڈالا ہوا ہے۔

”السلام علیکم!“ اس نے سلام میں پہل کر کے ہوئے ان کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کی نظریں براہ راست آپس میں ٹکرائیں اور معاذ نے ان نظریں کی تیزی و طراری کو محسوس کیا۔ یہ نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ ایک بے پناہ انرجیٹک، ہوشیار، معاملہ فہم اور موقع شناس شخص ہے اور شاید اس شخص کی یہی خصوصیات تھیں جنہوں نے اسے ایک نمایاں مقام دلایا ہوا تھا۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“ سلام دعا کے

واقعی متاثر تھا اور اسے یقین تھا کہ ایسے راستے سے گزر کر خفیہ ٹھکانوں پر چھپے اہم افراد تک پہنچنا ہر کس و نا کس کے بس کی بات نہیں ہو سکتی۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ارتضیٰ اس کی بات سن کر دھیرے سے ہنسا پھرتا نہ لگا۔

”پہلی بار میں، میں بھی خاصا الجھ گیا تھا بلکہ کئی بار یہاں آنے کے بعد بھی کچھ سمجھ نہیں آئی تھی کہ کب کس سمت میں مڑوں گا تو اپنی منزل پر پہنچ جاؤں گا پھر یہاں موجود دوستوں نے مدد کی اور ان بھول بھلیوں سے گزر کر سیدھے منزل پر پہنچنے کی تکنیک سمجھائی۔ بس کچھ اشارے اور نشانیاں ہیں جنہیں ذرا حساب کتاب سے یاد رکھنا ہوتا ہے پھر بندہ بھٹکا نہیں ہے لیکن آپ ان مسئلوں میں الجھ کر کیا کریں گے؟ آپ کو تو بس ایک ملاقات کرنا ہے، اپنا کام بتانا ہے اور بس اپنی راہ چلنے لگتی ہے۔ یہ سب تو ہم جیسوں کو یاد رکھنا ہوتا ہے جو مقامی سطح پر کام کرتے ہیں۔“ ارتضیٰ اس کا ایسا سادہ سادہ جواب سنا کہ اس نے غصے سے کہنے لگا کہ اس نے اپنے دوست ملک کی طرف سے کچھ باتوں کو چھپائے جانے کی وجہ سے وہ ان کی طرف سے بھی احتیاط برت رہے تھے اور کچھ ضروری معاونت کے علاوہ ان سے سب کچھ شہر نہیں کر رہے تھے۔ دلائی لاما سے ربط ضبط بھی اسی پالیسی کا ایک حصہ تھا اور اب پھر وہ ایک اہم ملاقات کے لیے ایک انتہائی خفیہ مقام پر موجود تھا۔ یہ جگہ مرکزی شہر سے بہت دور تھی اور ارتضیٰ اسے سیر کروانے کے بہانے یہاں لایا تھا۔

”مہمان۔“ بھول بھلیوں کے اختتام پر وہ ایک بھاری دروازے کے سامنے رو کر ارتضیٰ نے دروازے کے آگے موجود پھریداروں سے جو کچھ کہا اس میں سے اسے خود صرف یہی ایک لفظ سمجھ آیا۔ دروازہ البتہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی شور و غل اور موسیقی کی آوازیں باہر کی طرف لپکیں۔ وہ ارتضیٰ کے پیچھے پیچھے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا تو کچھ جوان لڑکوں کو رقص کے انداز میں جھومتے اور گھومتے ہوئے پایا۔ وہ سب چڑچوش اور خوش دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے ذرا دھیان لگا کر ان کے گائے جانے والے گیت کے بول سنے۔ وہ کسی کی جنت کی طرف روانگی اور مجرموں کو انجام تک پہنچا دینے کا قصہ تھا جسے بیان کرتے ہوئے عہد کیا جا رہا تھا کہ پیچھے رہ جانے والے بھی جلد اس پرانے پرگامزن ہوں گے اور اپنے پیشرہ کی طرح جنت لے باغوں میں خودوں کے سنگ موجود ہوں گے۔

”کیا یہ کسی قسم کا جشن منانے کا ہے؟“ اس نے

میڈیم ایکس اور سونا اسرائیل میں ہونے والے بم بلاسٹ کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں۔ میڈیم ایکس کا خیال تھا کہ اس کا ردوائی میں لپٹی وہی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تربیت تو اس کی لپٹی نے ہی کی ہے اس لیے اسے اس کے ہر عمل کا جواب دینا ہوگا۔“ میڈیم ایکس نے جوش سے کہا۔

”ضرور لیجیے گا، اگر وہ آپ کے ہاتھ آگئی۔“ اس نے ہانک چکی لی۔

”ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ اتنی آسانی سے ہم سے بچ نہیں سکتی۔“ میڈیم ایکس نے بھی گویا چیلنج قبول کر لیا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ بروقت خطرے سے آگاہ ہوجانے کے باعث لپٹی کے ہمدردوں نے بہت تیزی سے حرکت کی تھی اور اب تک وہ اسرائیل کی حدود سے باہر نکل چکی تھی۔

”موجودہ حالات میں، ہم سب کوئی بہت زیادہ چونکا اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اب مجھے تمہارے کسی ایڈووکیٹ کے مطلق کوئی اطلاع نہ ملے۔ نہ صرف اپنے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا کرنے ہیں بلکہ اپنے بارے میں بھی اپنی فہم کو باخبر رکھنا ہے تاکہ غیر معمولی حالات میں ایک دوسرے سے رابطہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔“

میڈیم ایکس کے سلی فون پر کوئی پیغام آیا تھا جسے پڑھ کر اس پر وہاں سے روانگی کی غلت طاری ہوئی تھی۔ اس لیے اس کی غوثی کا پروگرام مختصر کرتے ہوئے آخر میں محض ایک سنجیدہ کی اور فوری طور پر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ سونیا کرسی کی پشت سے ٹپک لگائے اسی اطمینان سے بیٹھی رہی۔ وہ اپنی راہ کا یقین کر چکی تھی اور اب اسے کسی بھی قسم کے نتائج کی کوئی پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

”آئیے، آجایے معاذ بھائی! یہ ادھر سے دائیں طرف۔“ ارتضیٰ اس کے آگے آگے چلتا ہوا اس کی راہنمائی کرتا جا رہا تھا اور وہ نہایت دلچسپی سے زیر زمین واقع ان بھول بھلیوں جیسے راستے کو دیکھ رہا تھا جن سے گزر کر اسے ایک اہم ترین ملاقات کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ راستے میں کئی جگہ ان کا سلا پھریداروں سے بھی سامنا ہوا جو ارتضیٰ کی زبان سے محض ایک کوڈ ورڈ سن کر سکون سے پیچھے ہٹ جاتے تھے اور انہیں آگے جانے کا راستہ دے دیتے تھے۔

”یہ بہت شاندار انتظام ہے۔ مجھے یقین ہے کہ محض دو چار بار میں تو کسی کو یہ راستہ یاد بھی نہیں ہوگا۔“ وہ

دکھا کی نہیں دے رہے۔ ہمارے لیے پریشانی کی بات یہ نہیں ہے کہ اسرائیل دنیا کے کس کس کوٹے میں اپنے بچے گاڑ چکا ہے یا گاڑنے جا رہا ہے۔ ہمیں تو اپنے ان لوگوں کی فکر ہے جنہیں ان کے گھروں سے نکال کر ایک مختصر سی پٹی پر دھکیل دیا گیا ہے۔ ہمارے جوان آئے دن موت کی آغوش میں بیچ دیے جاتے ہیں۔ ہمارے بچوں کے پاس کل غذا اور تعلیم کی سہولت موجود نہیں ہے اور ہم سے انسانوں کے بجائے جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے اور اس سارے ظلم کے جواب میں تم سمیت دنیا بھر کے ممالک سے دے دے سے مذمتی بیانات کے سوا اور کچھ بھی نہیں کیا جاتا۔ ایسے میں تمہارے خیال میں ایسی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ہم تمہاری مدد کریں؟“ وہ ایک ایسی تلخ حقیقت بیان کر رہا تھا جس پر معاذ شرمندہ ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کے لیے اپنے منہ سے پیچھے ہٹنا بھی ممکن نہیں تھا اس لیے کچھ نہ کچھ تو بولنا ہی تھا چنانچہ شرمندگی سے بولا۔

”آپ کا ہر شکوہ بجایا ہے۔ واقعی ہم نے مسئلہ فلسطین پر وہ کردار نبھی ادا نہیں کیا جو ہمیں ادا کرنا چاہیے تھا۔ ہم اپنی کمزور پالیسیز، معاشی مسائل، سیاسی عدم استحکام اور غلط فیصلوں کے ہاتھوں ہمیشہ دوسروں کے ہاتھ کا کھلوتا بنے رہے ہیں لیکن اب جبکہ ہم نے ہمت کی ہے اور ایک بڑے فتنے کا سد باب کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ہمارا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اس سے آپ کو کوئی اور فائدہ ہو یا نہ ہو، یہ فائدہ تو ضرور ہوگا کہ آپ کے دشمن کو ایک زبردست زچہ پیچھے کی اور آپ اسے کمزور کر سکیں گے۔“ اس نے بڑی سادگی سے اپنی صفائی پیش کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ ابو حمزہ اس کی بات سن کر مسکرایا اور خوشگوار مود میں بولا۔

”عام حالات میں شاید تمہارے دلائل مجھے قائل نہیں کر پاتے لیکن تمہاری خوش قسمتی ہے کہ آج یہاں خوشی کا موقع ہے اور ہم اپنی خوشی میں تمہیں شامل کرنے کے لیے تمہاری خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بس اس کے لیے تمہیں تمہارا انتظار کرنا پڑے گا۔ مناسب وقت پر سارا انتظام ہو جائے گا۔“ ابو حمزہ کا جواب اس کے لیے خاصا حوصلہ افزا تھا لیکن پھر بھی اس نے صورت حال کو واضح کرنا چاہا اور بولا۔

”آپ کے اس تعاون کے لیے میں بے حد شکر گزار ہوں لیکن میری خواہش ہے کہ آپ مجھے کوئی نہ کوئی ٹائم فریم ضرور دیں کیونکہ میرے لیے بھی لا محدود مدت کے لیے خود کو چپا کر رکھنا ممکن نہیں ہے۔ اس سے قبل میری ذات پر شک

کی پرچھائیاں پڑیں، میں اپنا فرض انجام دے ڈالنا چاہتا ہوں۔“ وہ کشمیر میں اپنے پیچھے بڑا پھیلاوا چھوڑ کر آیا تھا۔ اگرچہ وہ جے کی موت نے بہت سی باتوں پر پردہ ڈال دیا تھا لیکن اسے اندازہ تھا کہ اگر ذرا گہرائی میں جا کر تحقیق کی گئی تو اس کی شخصیت سامنے آجائے گی۔ بھارت اور اسرائیل کے تعلقات اس نوعیت کے تھے کہ بھارت کی طرف سے مطالبہ ہوتے ہی اسرائیلی حکام خود اسے دیوبند کر بھارت کے حوالے کر دیتے اس لیے مناسب یہی تھا کہ وہ کم سے کم وقت میں اپنا ٹارگٹ حاصل کر لے۔

”تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ بہت جلد یہاں بڑی تبدیلی رونما ہونے والی ہے۔ اس تبدیلی کا اثر ساری دنیا پر پڑے گا۔ تم بھی اس کے ثمرات سے فائدہ اٹھا لیتا۔“ رواں انگریزی میں گفتگو کرنے والے ابو حمزہ کا انداز واعتماد دیدنی تھا۔ معاذ تھا بھی سے اس کی صورت دیکھتا رہا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ابو حمزہ کی بات کا کیا مقصد ہے۔

”خود کو الجھاء مت اور یقین رکھو کہ بہت جلد تمہارے اور ہمارے مسائل حل ہونے والے ہیں۔“ ابو حمزہ نے شفقت سے اس کا شانہ چھتھ پایا پھر ارضی کی طرف رخ کر کے بولا۔

”آج یہاں خوشی منائی جا رہی ہے۔ اپنے دوست کے ساتھ یہاں سے کھانا کھا کر رخصت ہونا۔“ یہ جملہ ایک طرح سے ملاقات ختم ہو جانے کا بھی اشارہ تھا۔ وہ دونوں ابو حمزہ سے الوداعی مصافحہ کر کے واپس پلٹ گئے۔ اس بار ابو حمزہ کا سامنی بھی ان کے ساتھ تھا۔

”یہاں کس چیز کا جشن منایا جا رہا ہے؟“ وہ جب واپس اس کمرے میں پہنچے جہاں نو جوان لڑکے گانے کے ساتھ ساتھ دھن دھن بھی کر رہے تھے تو اس نے اپنے میزبان سے پوچھا۔

”آج ہمارا ایک مجاہد اپنے فرض کی ادائیگی میں سرخرو ہو کر جنت کی طرف گامزن ہو گیا ہے۔ ہم اس کی کامیابی کا جشن منا رہے ہیں۔“ زبان مختلف تھی لیکن وہ اس سے پہلے بھی اس سے ملنے جلتے الفاظ سن چکا تھا۔ اس کے دماغ میں بہت زور سے کچھ کلک ہوا۔

”کون؟ کس کی بات کر رہے ہو تم؟“ چونک کر پوچھا۔ اس کی جس نے جب کہہ کر رکھ دیا ہے اور بڑے بڑے اسرائیلی عہدیداروں کی دوڑیں لگوا دی ہیں۔ ”تم شاید لیلی وہی کے بیٹے الیاس عرف ایلی کی بات

کر رہے ہو؟“ اسے اندازہ لگانے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی۔ ”وہ لیلی وہی کا نہیں، فلسطین کا بیٹا تھا جس نے اپنی جان قربان کر کے برسوں پہلے قتل ہونے والے اپنے خاندان کا بدلہ لے لیا۔“

”لیلی نے اسے بہت محبت اور محنت سے پالا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بچہ جسے وہ برسوں پہلے موت کے ہتھوں سے نکال کر لے گئی تھی، خود کش دھماکے کے نتیجے میں کئی حصوں میں تقسیم ہوا ہوگا تو لیلی کا دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہوگا۔“

”یہ لیلی کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ایک مجاہد کی خدمت کا موقع ملا۔ اب وہ مجاہد بنی زندگی کا اصل مقصد پورا کر کے اللہ کے حضور حاضر ہو گیا ہے تو لیلی کا فرض ہے کہ خود پرنا ز کرے۔“

”وہ کیسے کر سکتی ہے؟ کیا اس سے پوچھا گیا تھا کہ اس نے جس بچے کو اپنی محنت سے پالا تھا، اس کا جسم ایک خود کش دھماکے میں فنا ہونے جا رہا ہے تو اسے کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟“ کوشش کے باوجود دھیرے دھیرے اس کے شمع کا اظہار ہونے لگا تھا۔ ارضی نے غیر محسوس طور پر اس کا ہاتھ تھام کر آہستہ سے دیا یا۔

”الیاس ایک بالغ جوان تھا۔ اس نے اپنی مرضی سے اپنی راہ کا یقین کیا۔ اس لیے لیلی سمیت کسی کے بھی اس کے عمل پر اعتراض کی گنجائش نکلتی نہیں ہے۔“ اس شخص نے ناگواری سے جواب دیا۔ معاذ اس کی اس بات کے جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بس اتنا ہی کہہ سکا۔

”اس قسم کی کارروائی کے نتیجے میں بے گناہ افراد بھی مارے جاتے ہیں۔ تم لوگوں کا اصل نشانہ میسر تھا لیکن ساتھ میں بہت سے ایسے بچے، عورتیں اور بوڑھے بھی ہلاک ہو گئے جن کا اس سب سے کوئی لینا دینا نہیں تھا اور وہ بے ضرر اور بے گناہ لوگ تھے۔“

”نہیں تھے وہ بے گناہ۔ ان میں سے اکثریت وہ تھی جنہوں نے خود یا ان کے آباء اجداد نے ہماری زمینوں سے ہمیں بے دخل کر کے بنے گھر کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ لوگ جو دوسروں کے گھروں پر قبضہ کر لیں اور ان کی پلٹ سے بے حس سے کھاتے رہیں، ہرگز بھی بے گناہ اور مظلوم نہیں ہو سکتے۔ اگر اتفاق سے کوئی مظلوم زد میں آیا بھی ہے تو اللہ اس کے ساتھ انصاف کرے گا اور جنت کے باغوں میں اس کی میزبانی ہوگی۔“ اس شخص کی بلند آواز اور الفاظ اس ذہن سازی کا ثبوت تھے جو برسوں سے کی جاتی رہی تھی۔ الیاس عرف ایلی بھی شاید ایسے ہی کسی گروپ کے ہاتھ لگ گیا تھا پھر وہ تھا بھی ستم زد یہ تو اس نے تیزی سے

اس سب کو قبول کیا ہوگا اور اپنی زندگی کی ساری نعمتوں کو بھلا کر انتقام کی راہ پر چل نکلا ہوگا۔ حالانکہ اگر وہ اپنی تعلیم مکمل کرتا اور بین الاقوامی فورم پر اپنی قوم کے لیے آواز اٹھاتا تو خود کو ایک ہم دھماکے میں اڑا لینے سے زیادہ بہتر نتائج حاصل کر سکتا تھا۔ جیسے کہ اس کی منہ بولی ماں لیلی وہی اب تک کرتی رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنی قوم کی بہت زیادہ مالی اور اخلاقی مدد کی تھی اور ہر جگہ فلسطینیوں کے حق میں کھل کر بولی تھی۔ اس واقعے کے بعد لیلی کی راہیں بند ہو گئیں اور وہ خود پر شک کی مہر لگا کر آئندہ کچھ بھی کر سکنے کے قابل نہیں رہی تھی بلکہ وہ تو شاید خود بھی محفوظ نہیں تھی۔

”لیلی وہی کہاں ہے؟“ اس نے ہر بات کو چھوڑ کر لیلی کی خیریت جانتا چاہی۔

”الیاس کو یانے کے صلے میں اسے یہ جہالت یہاں سے نکال دیا گیا۔ کچھ عرصہ اسے روپوش رہنا پڑے گا پھر حالات سازگار ہونے پر منظر عام پر آ سکتی ہے۔“ اس نے بتایا پھر زرا طنز بے لچک میں بولا۔

”میرے خیال میں تم لوگ یہاں ہونے والی دعوت میں شریک ہونا پسند نہیں کرو گے اس لیے تمہارے لیے اب واپسی ہی بہتر ہے۔“

”ہمارے پیٹ بھرے ہوئے ہیں اور شہر کی فضا بھی مخدوش ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم جلد از جلد واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں۔“ اس نے اپنے وطن میں جنت کے لالچ میں اتنے خود کش دھماکے دیکھے تھے کہ اب کسی بھی قسم کی صورت حال میں اس بارے میں سن کر مطمئن نہیں ہو پاتا تھا لیکن یہاں اس موضوع پر اس سے زیادہ گفتگو ممکن نہیں تھی اس لیے بہانہ بنا کر وہاں نہ رہنے کا جواز تلاش کر ہی لیا۔

”کچھ معاملات میں بحث مناسب نہیں ہوتی۔ آپ ان جیسے حالات میں نہیں رہے، آپ نے ان کے جیسی مشکلات نہیں دیکھیں، اس لیے آپ ان کے جذبات کو مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ جو معاملات مکمل طور پر سمجھ میں نہ آئیں، ان میں خاموشی اختیار کر لینا ہی مناسب ہوتا ہے۔“ واپسی کے راستے میں ارضی نے اسے ٹوکا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں آئندہ احتیاط کروں گا۔“ اس نے بغیر بحث کے اپنی غلطی بان لی اور خاموشی سے چل رہا۔ کہنے کو وہ ایک کامیاب ملاقات کر کے وہاں سے جا رہا تھا لیکن اس کے دل پر بوجھ سا آ گیا تھا۔

☆☆☆

”یہ غلط ہے۔ یقیناً تم لوگوں نے کوئی بے

ایمانی کی ہے۔ یہ مسلسل تیسری بار تھا کہ شوگ نے انتخاب کا موقع ملنے پر شکی کو ہی چنا تھا اور پروفیسر اینڈریو کی برداشت جواب دے گئی تھی۔

”کیسی بے ایمانی؟ ہمارے درمیان شروع سے ہی یہ بات طے تھی کہ شوگ کو سماجی کے انتخاب کی آزادی حاصل ہوگی۔ اس نے ہم سب کی نظروں کے سامنے بغیر کسی دباؤ کے کبلی کو منتخب کیا ہے تو اسے کوئی بھی شخص بے ایمانی قرار نہیں دے سکتا۔“ شوگ کے رکھوالے ڈاؤ شوٹی نے پروفیسر کے احتجاج کا سرد دلچہ میں جواب دیا۔

”نہیں، تم لوگوں نے کوئی نہ کوئی گڑبڑ کی ہے۔ شوگ تمہارا تربیت یافتہ ہے۔ اسے تم لوگوں نے کسی طرح یہ ذہن نشین کروادیا ہوگا کہ وہ سماجی کے طور پر کبلی ہی کا انتخاب کرے۔ تم جانتے ہو کہ کبلی تمہاری ہے اور اگر وہ حاملہ ہوگئی تو اس سے ہمیں ہی فائدہ پہنچے گا۔“ پروفیسر براخروختہ ہو رہا تھا اور کچھ ایسی ہی کیفیت شکی کی بھی تھی۔ ایک طرف ہر جائیداد کی طرح اس کے جسم کے فطری تقاضے تھے تو دوسری طرف عام حیوانات کے مقابلے میں ذہنی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے اس کے اندر بھی انسانوں والی وہ جس موجودگی جو خود کو نظر انداز یاد رکھے جانے پر بے عزتی کے احساس سے دوچار کرتی ہے۔ شوگ کے رویتے نے اسے باپوی اور طیش، دونوں میں جلا کر دیا تھا اور وہ اپنے لیے مختص میل میں کسی پھری ہوئی شیرنی کی طرح دیوانہ وار ادھر سے ادھر چکر لگا رہی تھی۔ اگر میل کا مضبوط دروازہ غوری طور پر بند نہ کر دیا گیا ہوتا تو ممکن تھا وہ احتجاجاً باہر آ کر کسی سوتلی طرح کیلی سے اپنے حق کے لیے بھڑ جائی۔ فی الحال پروفیسر اینڈریو اور ڈاؤ شوٹی آپس میں اٹھے ہوئے تھے۔

”تم ایک احمقانہ بات کر رہے ہو۔ ہمارے پاس کیلی کا کسی قسم کا ڈیٹا، ڈی این اے یا کوئی بھی ایسی شے موجود نہیں تھی جس کی مدد سے شوگ کے اندر کوئی پروگرام فیڈ کیا جاتا۔ یہ صرف ایک فطری انتخاب ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انسان کرتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ بے شمار مردوزن سے بھری اس دنیا میں بس کوئی دو افراد ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے لیے ایسے دیوانے ہو جاتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے کے سوا کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔ شوگ اور کیلی بھی اسی تجربے سے گزر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آہستہ آہستہ اس رویے میں تبدیلی آئے گی اور شوگ شکی کی طرف بھی توجہ دے گا۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو ہم کیلی کو منظر سے بھی ہٹا سکتے ہیں۔ کیلی سامنے نہیں ہوگی تو لازماً فطری تقاضا

شوگ کو شکی تک لے جائے گا۔“ ڈاؤ شوٹی کا لہجہ سرد لیکن بات مدلل تھی۔ اینڈریو کو باکل ہونا پڑا لیکن یہ حقیقت تھی کہ ایک طرف اس کی انا کوٹھیں پھینکی تھی تو دوسری طرف اسے یہ علم کھائے جارہا تھا کہ شکی جو کہ اسرائیل کے حصے میں آئی تھی، شوگ کی قربت سے محروم رہ جانے کے باعث بار آور بھی ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اب تک جتنی تحقیق اور تجربات کیے تھے، ان کے مزید آگے بڑھنے کا دار و مدار ان بچوں کی آمد پر تھا جو شکی کے بطن سے جنم لیتے لیکن یہاں حالات بتا رہے تھے کہ کیلی، شکی پر سبقت لے جائے گی اور کیلی کے سبقت لے جانے کا مطلب تھا چین کا سبقت لے جانا جو اسے کسی طور منظور نہیں تھا۔ وہ بہت جھنجھلایا ہوا اپنی خواب گاہ میں واپس آیا لیکن ایسے میں نیند کے مہربان ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کا شاطر دماغ کوئی ترکیب لڑانے میں مصروف ہو گیا۔ آخر کار ایک حل بھائی دے ہی گیا۔

”کل کیلی اور شکی کو کھانا فراہم کر دو کیلی کی غذا میں یہ اور شکی کی غذا میں یہ دو اضاف کر دینا۔“ اس نے اپنی ترکیب پر تجزی سے عملدرآمد کے لیے اسی وقت نگران کو طلب کر لیا۔

”لیکن سر! ان دونوں کو تو ایک ساتھ کھانا فراہم کیا جاتا ہے۔“ نگران نے یاد دلایا۔

”کل سے نہیں کیا جائے گا۔ کہہ دینا کہ ساتھ کھانے میں ایک مادہ کہ جبکہ دوسری زیادہ غذا استعمال کر رہی ہے اس لیے آئندہ انہیں الگ الگ حساب کتاب سے کھانا دیا جائے گا۔“ وہاں حل پہلے ہی سوچ لیا گیا تھا لیکن ایسی ترکیبیں اور تدبیریں لڑانے والوں کو اندازہ نہیں ہوتا کہ وقت کی بساط پر کچھ مہرے ان کی بے خبری میں بھی چلائے جارہے ہوتے ہیں۔ دلائی لاما کی زیر سرپرستی وہ مہرے چلائے جا چکے تھے۔ تاریخی لباس والے ٹیکشو دلائی لاما کی روحانی طاقت کے سامنے میں پورے اسرائیل سے نکل کر اور کچھ دنیا کے دوسرے خطوں سے بھی سفر کر کے اپنے مقدمات کے تحفظ کے لیے اکٹھے ہو چکے تھے اور آہستہ آہستہ اینڈریو کی اس راجدھانی میں نقب لگانے کے لیے آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

☆☆☆

لائگ اسکرٹ کے ساتھ سر پراسکارف لیے بہائی گارڈن کی بیڑھیاں چڑھتی لڑکی کے بازو کے ساتھ سہارے کے لیے اسٹک جڑی ہوئی تھی۔ اسٹک کو زمین پر

شہ زود

یک کر وہ جس آہستہ روی کے ساتھ ایک ایک بیڑھی چڑھ رہی تھی، اسے دیکھتے ہوئے اندازہ ہو رہا تھا کہ ٹانگ کے تھپس یا کسی تکلیف کے باعث اسے چلنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ وہ بہائی گارڈن کی خوبصورتی سے بے نیاز بیڑھیوں پر نظر میں جمائے بے حد سنجیدگی کے ساتھ جیسی رفتار لیکن مستقل مزاجی کے ساتھ بیڑھیاں اٹے کرتی جا رہی تھی۔ اس کی پشت پر دونوں شانوں سے لڑکا ایک درمیانے سائز کا بیگ جھول رہا تھا۔ وہ دائرہ پروف اور خاصی مضبوط سلائنیوں والا بیگ تھا اور جس طرح لڑکی کے شانے آگے کی طرف قدرے جھکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اس سے بیگ کے وزن کی بوجھ کا بھی اندازہ ہو رہا تھا۔

”ایکسیکو زمی!“ اچانک ہی لڑکی کے عقب سے چست جینز اور ٹی شرٹ میں بلبوس ایک جوان العمر آدمی نمودار ہوا اور اسے مہذبانہ لہجے میں مخاطب کیا۔

”میں!“ اپنی چپٹی لڑکی قدرے چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنا بیگ مجھے پکڑا سکتی ہیں۔“ مرد نے مسکرا کر اسے پیشکش کی۔

”آپ کا شکر ہے لیکن میرے خیال میں آپ کو اس زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔“ لڑکی کے الفاظ مناسب لیکن لہجہ روکھا سا تھا۔

”زحمت کی کوئی بات نہیں۔ میں بھی اوپر ہی جا رہا ہوں اور آپ کے اس بیگ کو بہت آسانی سے اوپر پہنچا سکتا ہوں۔“ اس کی رکھائی کے باوجود مرد کے ہونٹوں کی مسکراہٹ برقرار رہی۔

”میرے لیے بھی یہ کوئی خاص مشکل کام نہیں ہے۔ آج شاید میری معذوری پر ترس کھا کر یہ پیشکش کر رہے ہیں لیکن یقیناً جا میں کہ مجھے خود پر ترس کھائے جانے سے شدید نفرت ہے۔“

”نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو بس انسانیت کے نام سے آپ کی تھوڑی سی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔ انسان کا انسان پر اتنا حق تو ہوتا ہے نا۔“ اس کی نرمی برقرار تھی۔

”میرا انسانیت پر بے یقینان اٹھ چکا ہے۔“ مرد لہجے میں جواب دے کر لڑکی نے اپنا قدم اگلی بیڑھی پر رکھا۔

”لیکن کیوں؟“ پشت پر سے استفسار ہوا۔

”کیونکہ میں حقیقت پسند ہوں اور اس حقیقت کو بہت پہلے سمجھ چکی ہوں کہ انسانیت وغیرہ کسی چڑیا کا نام نہیں۔ یہاں ہر شخص کو اپنی زندگی خود جیٹا ہے اور اپنا بوجھ خود اٹھانا

ہے۔ اس لیے میں نہ تو کسی سے مدد لینا پسند کرتی ہوں اور نہ ہی کسی سے ایسی امید رکھتی ہوں۔“ اس نے پلٹ کر اپنے انہی ہندو کو جواب دیا اور ایک قدم مزید اٹھایا۔

”لیکن یہ ایک اپنا بل ٹرویتے ہے۔“ وہ بھی اس کے پیچھے ایک اسٹیپ چڑھا۔

”میرا تمہاری سوچ سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے البتہ یہ ضروری ہے کہ میرے انکار کے بعد تم میرا پیچھا چھوڑ دو اور مجھے میری مرضی سے مکمل کرنے دو۔“ لڑکی نے چہ چڑے پن کا مظاہرہ کیا اور ذرا تیزی دکھاتے ہوئے جلدی چلی دو۔

اسٹیپ اٹے کر گئی۔ اس کی ٹانگ کا نقص اس تیزی کا متحمل نہ ہو سکا اور وہ ذرا سا لڑکھائی۔ مرد بھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ہی جست میں اس کے قریب پہنچا اور دونوں بازو

تھام کر اسے سہارا دیا لیکن اس کی گرفت میں کسی عام سہارا دینے والے شخص کی سی نرمی نہیں تھی۔ اس نے اپنی طاقت سے لڑکی کے بازوؤں کو تھما تھا کہ اسے اس کی انگلیاں اپنے گوشت میں گڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ اس نے متوجہ

ہو کر خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرانا چاہا لیکن اسے اس کا موقع نہیں دیا گیا اور اس کے بازو کے ساتھ بندھی اسٹک کو ایک جھٹکے سے بچنے لیا گیا۔ یہ ساری کارروائی چند سیکنڈوں میں ہی ہو گئی اور اس سے قبل کہ لڑکی جتنی چلائی یا کوئی واضح رد عمل دیتی، آس پاس سے پانچ چھ مضبوط اور توانا مرد لپکتے ہوئے آئے اور اسے پھیرے میں لے کر سب سے پہلا کام

اس کی پشت پر موجود بیگ کو جھینسنے کا کیا۔

اس سارے منظر نے وہاں موجود سیاحوں اور زائرین کو گھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ نے اسے ایک لڑکی کے ساتھ ہونے والی ہرسانی تصور کرتے ہوئے ذہل اندازی کی کوشش بھی کی لیکن سب سے پہلے لڑکی سے مخاطب ہونے اور پھر اسے گرفت میں لینے والے نے ایک کارڈ نفا میں

لہرایا اور بلند آواز میں بولا۔

”پولیس۔ آپ سب لوگ دور رہیں۔ یہ آپ ہی کے تحفظ کے لیے کی جانے والی ایک کارروائی ہے۔“

”ہونہ۔۔۔ طاقت کے تل پر مجبوروں پر ظلم کرنے کو یہ لوگ سیکھ پوری کا نام دے کر دنیا کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔“ جہوم میں موجود ایک فلسفی عورت اس کی

بات سن کر بڑبڑائی اور ہمدردی سے اس معذور لڑکی کو دیکھا جسے وہیں گھنٹوں اور گھنٹیوں کے تل بیٹھے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس عورت کے ساتھ ساتھ جہوم میں شامل دوسرے بھی

کئی افراد لڑکی کے ساتھ ہمدردی محسوس کر رہے تھے۔ عوامی

جذبات سے بے نیاز وہ سارے لڑکی کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے اور ان کے ہتھیار ان کے ہاتھوں میں آچکے تھے۔ لڑکی سے چھینا گیا بیگ وہاں سے کافی دور لے جا کر کھولا جا رہا تھا اور ہم ڈسپوزل اسکواڈ کے دو افراد مخصوص لباس میں کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ اچانک ہی کسی گھوڑے کی طرح خنوں اور کہنوں کے بل بے بس کھڑی لڑکی کا توازن بگڑا اور وہ سیزجوں سے رول ہوتی ہوئی نیچے لڑکتی چلی گئی۔ لڑکتے ہوئے وہ اپنے راستے میں کھڑے ایک پولیس والے کو بھی ساتھ لے کر گری گئی۔ اس منظر کو دیکھ کر جہاں کئی لوگوں کے منہ سے چیخ نکلی، وہیں پولیس والے بھی بھڑکے اور اس بات کی خبر کے بعد تیزی سے اس کے پیچھے لپکے لیکن اگلے ہی لمحے گونجنے والی کان بھاڑ دھماکے کی آواز ہر ایک شے پر حاوی ہو گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ دھماکا خیز مواد اسی بیگ میں تھا جسے زبردستی لڑکی سے چھینا گیا تھا۔

☆☆☆

”یہ مطالبہ میری سمجھ سے باہر ہے ارنلٹی! مجھ سے ایک ایسی لڑکی کی رہائی کے لیے خود کو خطرے میں ڈالنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جو ایک دہشت گرد کا زور دانی کرنے کی کوشش میں رہے گا۔ ہاتھوں پکڑی گئی ہے۔ اسراٹکی تو اسے مجرم ڈیکلر کر ہی رہے ہیں، میرے نزدیک بھی وہ بے قصور نہیں ہے۔“ معاذ کے چہرے پر غمی تھی اور وہ قدرے تیز لہجے میں پیغام لے کر آنے والے ارنلٹی سے بات کر رہا تھا۔

”اگر آپ طیبہ کے حالات زندگی جان لیں تو اسے اس عمل میں اتنا غلط تصور نہیں کریں گے جتنا اس وقت محسوس کر رہے ہیں۔“ وہ بھی سادہ دانا کہ میں مان سکوں کہ کسی پبلک پلیس پر بے قصور انسانوں کو پرنچوں میں تبدیل کر دینے کا بھی کوئی جواز ہوتا ہے۔“ معاذ کے انداز میں واضح بیزاری تھی۔

سپنس ڈائجسٹ 68 اکتوبر 2024ء

باوجود امریکا میں اپنی بہترین ملازمت چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ وہ ایک کوالیفائڈ ڈاکٹر تھا جس نے اپنے پیشہ ورانہ فرائض انجام دیتے ہوئے ہر اس شخص کا علاج کیا جو اس تک پہنچا اور اس کی یہی فرض شناسی اس کا جرم ٹھہری۔ اس فلسفین مجاہدین سے تعلق کا الزام لگا کر عین اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب وہ طیبہ سے نکاح کے بندھن میں بندھنے جا رہا تھا۔ آپ تصور کریں، ماضی میں اپنے سینے پر اپنے پیاروں کی جدائی کے گہرے گھاؤ کھانے والی لڑکی کو ایک بار پھر خوشیوں کی راہ گزر پر قدم رکھنے سے محروم کرنے والوں کے لیے اس نے کتنی شدید نفرت محسوس کی ہوگی۔ اس نفرت میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب کئی لڑکیاں کے لیے کی گئی ہر کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ اسے کسی عدالت میں پیش کر کے اسے پروردگار عائد کرنا تو دور کی بات، ظالم اس کی گرفتاری سے ہی انکار ہی ہو گئے اور پھر.....! ارنلٹی نے جملہ مکمل کرنے کے بجائے ایک سر آدھا بھری۔

”اور پھر؟“ معاذ نے سوال ضرور کیا لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ اس سوال کا جواب جانتا ہے۔

”بس پھر ایک دن ڈاکٹر کئی کئی بچٹی تشدد شدہ لاش دریافت ہوئی اور طیبہ صدمے سے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ بہت دن بعد جب اس نے اپنے ساتھ ہونے والے ایسے کو قبول کر لیا تو وہ، وہ طیبہ نہیں رہی جو پہلے بھی ہوا کرتی تھی۔ اس نے قبول کر لیا کہ ہم فلسطینیوں کو اگر اسراٹکی ظلم و ستم سے بچنا ہے تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ضروری ہے۔ میں نے اسے یہاں تک کہتے ہوئے سنا کہ اس روپے سے اور کوئی فائدہ ہونہ ہو، کم از کم سینے سے جلتی آگ پر پانی کے چند چھینٹے ضرور پڑ جاتے ہیں۔ اپنے سینے کی آگ پر پانی کے چھینٹے ڈالنے ڈالنے وہ اپنے دامن میں ہی آگ لگوا بیٹھی ہے لیکن ہم میں سے کوئی بھی اسے ڈاکٹر کئی والے انجام تک پہنچنے سے روک نہیں دیکھتا جاتا۔ ہم نہیں چاہتے کہ ایک دن ہم ڈاکٹر کئی کی طرح اس کی بھی کئی بچٹی لاش وصول کریں بلکہ ایک عورت ہونے کے ناتے یقیناً وہ ڈاکٹر کئی سے بھی زیادہ سخت امتحان سے گزرے گی۔“ ارنلٹی نے اس لمحے کی تکلیف کے تصور سے ہی آنکھیں میچ لیں۔ معاذ بھی کچھ لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔ یہ ساری صورت حال اس کے لیے کچھ نئی تو نہیں تھی۔ وہ ابھی ماضی قریب میں کشمیر میں یہی سب کچھ دیکھ کر آیا تھا۔

سپنس ڈائجسٹ 68 اکتوبر 2024ء

کسی انجینیر کی بات نہیں ہوتی۔ طیبہ کے ساتھ بھی بس ایسا ہی ہوا ہے۔“ ارنلٹی کی طرف سے مسلسل طیبہ کی وکالت کا سلسلہ جاری تھا۔

”مجھے طیبہ کی کہانی سن کر اپنے دل میں اس کے لیے شدید دکھ محسوس ہو رہا ہے لیکن میں اب بھی اپنے اس موقف پر قائم ہوں کہ کسی پبلک پلیس پر عام لوگوں کو اپنے انتقام کی لپیٹ میں لے لینا کسی طور جائز تصور نہیں کیا جاسکتا۔“ معاذ کی طرف سے سچائی کا مظاہرہ کیا گیا۔

”اس کا نشانہ عام لوگ نہیں تھے۔ وہ صرف اس ظالم شخص کو کیفر گزار تک پہنچانے کی گئی تھی جس نے اس سے زندہ رہنے کی واحد وجہ چھین لی۔ وہ میجر اس روز بھائی کا روڈن میں موجود تھا جس نے ڈاکٹر کئی کو گرفتار کرنے کے بعد اسے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا اور پھر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پکڑے جانے پر جب طیبہ نے غصے میں ہم بلاسٹ کیا تو وہ بلاسٹ بہت محدود تھا جس کی اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی تو مذکورہ میجر کے علاوہ کسی دوسرے فرد کو نقصان پہنچنے کا بہت ہی کم امکان تھا۔“ ارنلٹی بہت مدلل طریقے سے طیبہ کا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ اس بار معاذ کو بھی قائل ہونا پڑا۔

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو اور مجھے خوشی ہے جذبہ انتقام کے جنون کے باوجود طیبہ نے اس بات کا خیال رکھا۔“ وہ بہت اچھی، بہت حساس لڑکی ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ اس کے ساتھ جتنا برا ہو چکا ہے، اس کے بعد مزید کچھ برا ہو۔ اسے ان بھیڑیوں کے زرخے سے نکالنا بہت ضروری ہے معاذ بھائی!“ اس کے رویے میں پلک دیکھ کر ارنلٹی نے مزید زور لگا یا پھر ذرا اچھٹکے ہوئے بولا۔

”آپ یہ بھی تو غور کریں کہ آپ کو ابوجہ سے ایک بڑی مدد ملنی ہے اور ان حالات میں ہم آپ کی انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“

”ہوں۔“ معاذ نے ہنگامہ بھرا۔ ”کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ میں سوچتا ہوں اس پر۔“ اس کے لہجے میں موجود نیم رضامندی ارنلٹی نے بھی محسوس کر لی۔

☆☆☆

”تم نے کبھی سوچا ہے کہ اگر ہمارے ہاں اولاد ہوئی تو تم اسے کیا نام دو گے؟“ وہ دونوں میاں بیوی بہت خوشگوار موڈ میں مسائل کے کنارے چھل قدمی کر رہے تھے جب آمنہ نے تک سے یہ سوال کیا۔

”نہیں، میں نے نہیں سوچا اور نہ ہی میں سوچنے کا

سپنس ڈائجسٹ 69 اکتوبر 2024ء

ارادہ رکھتا ہوں۔“ تک کا جواب آمنہ کے لیے بہت غیر متوقع تھا۔ وہ ہل بھر کے لیے ششدری رہ گئی پھر پریشانی سے بولی۔

”کیوں؟ میرا مطلب ہے تم کیوں سوچنا نہیں چاہتے؟ کیا تمہیں بچوں کی خواہش نہیں ہے؟“

”اوہ تو تم غلط سمجھ رہی ہو امی! ڈارلنگ! مجھے تو بچے بہت پسند ہیں اور میں اس بات کا قائل ہوں کہ اس دنیا کی ساری رونق بچوں کے دم سے ہے۔ اگر بچوں کو مانس کر دیا جائے تو دنیا کے وجود کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔“

”تو پھر تم نے اپنے بچوں کے متعلق کیوں نہیں سوچا؟“ آمنہ نے ناگہی سے استفسار کیا۔

”یہ کس نے کہا کہ بچوں کا نہیں سوچا؟ میں نے تو صرف نام کے بارے میں کہا ہے کہ نہ سوچا ہے اور نہ ہی سوچوں گا۔“

”وجہ؟“ اس بار آمنہ کے لہجے میں تجسس تھا۔

”وہ اس لیے مائی ڈارلنگ کہ.....“ تک نے اس کے دونوں شانوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں لیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پیار سے بولا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ بچے کی پیدائش اور پرورش کے لیے جتنی محنت ماں کرتی ہے، دنیا کا کوئی اور فرد نہیں کرتا اس لیے بچے پر سب سے زیادہ حق بھی ماں کا ہی ہوتا ہے۔ میں ماں کی اس عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے بچوں کے نام رکھنے کے سلسلے میں تمہارے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔“

”اوہ، تک! تم کتنے اچھے اور حساس انسان ہو۔“ آمنہ خوش ہو کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

”مجھے لگتا ہے کہ تم نے ہمارے مستقبل کے بچوں کے کوئی نہ کوئی نام سوچ رکھے ہیں۔“ تک نے جوابی کر بھٹی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اندازہ لگایا۔

”بچوں کے تو نہیں، بس ایک بچے کا نام سوچا ہے۔“ آمنہ نے دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے اعتراف کیا۔

”وری گڈ! اور اچھے بھی تو ہوتے ہیں کہ وہ نام کیا ہے اور بیٹے کے لیے سوچا گیا ہے یا بیٹی کے لیے؟“ تک نے دلچسپی سے پوچھا۔

”بیٹا ہو یا بیٹی، نام ایک ہی ہوگا۔“

”ایسا کون سا نام ہے؟“ آمنہ کے جواب نے تک کا تجسس بڑھایا۔

”امن..... بیٹی ہو یا بیٹا، میں اپنے پہلے بچے کا نام امن رکھوں گی۔ امن کا مطلب ہوتا ہے سلامتی، بے

سپنس ڈائجسٹ 69 اکتوبر 2024ء

خونی..... میرا کچا اس دنیا میں ایسا فرد بن کر آئے گا جس سے دنیا کے دوسرے انسانوں کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ آمَنہ روائی میں یوٹی جابری کی لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ تک کا چہرہ یکدم ہی بجھ گیا۔

”کیا ہوا نک؟ کیا تمہیں یہ نام پسند نہیں آیا؟“
”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بہت اچھا نام ہے۔“
”بس.....“ تک نے اپنا جملہ ادھر اُدھر چھوڑ دیا اور بچے ہوئے انداز میں مسکرایا۔

”کیا بس؟ پیلیاں کیوں بھجوا رہے ہو؟“ آمَنہ ہلکا سا جھجھلائی۔
”بھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم مجھے ایک ظالم، جابر اور قاتل کے طور پر دیکھتی ہو۔“ تک نے اپنے دل کی بات بیان کر دی۔

”ایسا بالکل نہیں ہے بک! میری نظر میں تم ایک بہت اچھے انسان ہو۔ اگر میں تمہیں غلط انسان سمجھتی تو کبھی تمہارے ساتھ شادی نہیں کرتی۔ مجھے بس تمہارے کام کی نوعیت کے حساب سے کچھ تحفظات تھے جنہیں میں تم سے ڈسکس کر چکی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم اس بارے میں کوئی بہترین فیصلہ ہی لو گے اس لیے مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ تمہیں کسی بہانے سے کچھ بھی بتاؤں۔“ آمَنہ نے فوراً ہی وضاحت دی پھر اس کا ہاتھ تمام کر لا ڈے ہوئی۔

”چھوڑو اس موضوع کو جس کی وجہ سے ہمارا اتنا خوبصورت وقت برباد ہو رہا ہے۔ جہنم میں جائیں ایسے بچے جو میرے تک کو اداس کر دیں۔“

”خبردار! جو تم نے میرے بچوں کو جہنم میں ڈالنے کی بات کی۔ میں انہیں جہنم میں زندگی دینے کا سوچتا ہوں اور تم ہو کہ انہیں جہنم میں ڈالنے کی بات کر رہی ہو۔“ تک نے فوراً اسے ڈنکا۔

”اللہ اللہ..... وہ بچے جن کا ابھی دور تک کوئی نام و نشان بھی نہیں ہے، ان کے لیے ایسی حساسیت کہ اپنی اتنی پیاری بیوی کو ڈانٹا جا رہا ہے۔“ آمَنہ نے فحشی ضبط کرتے ہوئے اسے چیخاڑا۔

”وہ اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ میرے بچے“ میری اتنی پیاری بیوی“ جتنے ہی پائے ہوں گے۔“ تک کے برجستہ جواب پر آمَنہ کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔ تک کی فحشی بھی اس کی فحشی کے ساتھ شامل ہو کر مسائل پر دور رسک پہنچتی چلی گئی۔

☆☆☆

”بہت عجیب۔“ سونیا کی بات سن کر وہ فقط ہلکا دو

لفظ ادا کر سکا۔

”عجیب تو ہے پر حقیقت پر مبنی ہے اور ہماری مجبوری ہے کہ ہمیں یہی راستہ اختیار کرنا ہوگا کیونکہ یہ تو ہمارے بس میں نہیں ہے کہ ہم سخت سیکھو رٹی کو تو ذکر طیبہ کو ہاں سے نکال سکیں۔ یونہی کہہ دوں کہ کوئی انڈین مووی نہیں ہے جس میں ہیرو آگے کے دریا میں سے گزر کر بھی ہیرو کو نکال لاتا ہے۔ یہ حقیقی زندگی ہے اور تم اس وقت اسرائیل جیسے ملک میں موجود ہو جہاں کا سارا سسٹم لے حد جدید ہے۔ اس جدید سسٹم سے مقابلہ کرنے کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہے، وہ ہمیں دستیاب نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارے پاس اتنا وقت ہے کہ ہم ان وسائل کے حصول کی کوشش کر سکیں۔ اس لیے میں نے تمہیں سب سے زیادہ آسان راستے سے آگاہ کر دیا ہے۔“ سونیا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اسے حقائق سمجھانے کی کوشش کی۔

”قابلِ نفرت۔ میں نے تو کبھی خواتین کو بھی اس طرح استعمال کیا جانا پسند نہیں کیا چاہے خود اس گند میں اتر جاؤں۔“ معاذ نے منہ بتایا۔

”ضروری نہیں کہ گند میں اتر کر تم خود بھی گندگی میں لٹ پٹ ہو جاؤ۔ میں تمہیں کنول کے پھول والی پرانی مثال دوں گی کہ جیسے کنول کا پھول کچھو میں اگلے کے باوجود اپنی خوبصورتی اور پاکیزگی پر ادراغ نہیں کتنے دیتا، تم بھی خود کو محفوظ رکھ سکتے ہو۔“ سونیا اسے ہر حال میں قابل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اچھا تو یہ بتاؤ کہ تمہاری اس کرل جینتھر تک رسائی کی ترکیب کا کیا ہوگا؟ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں جا کر اس کی ڈور تیل بجاؤں اور انہیں بیلو میڈیم! میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ کیا آپ مجھے شرفِ قبولیت عطا کرنا پسند کریں گی؟“ وہ سمجھتا تھا کہ اگر کوئی اور راہ ہوتی تو سونیا اس کو اس کے مزاج کے برخلاف آئیڈیا پر گزرنے کی تدبیر اس لیے مجبوراً اس کے مشورے پر عمل کرنے کے لیے راضی تو ہو گیا لیکن چڑچڑے پن کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

”میں نے سارا انتظام کر لیا ہے۔ اتفاق سے ایک موقع بھی نکل آیا ہے اور وہ ذریعہ بھی جو تمہیں کرل جینتھر تک پہنچا دے گا۔ آگے تمہاری قسمت اور کارکردگی دونوں پر ہے کہ تم اسے متاثر کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔“ سونیا نے اسے آگاہ کیا تو وہ بس منہ بنا کر رہ گیا۔ آگے راہ تو جگجگ کوئی نہیں تھی۔

”ایڑی معاذ! سب ٹھیک ہو جائے گا اور ایسا کچھ

نہیں ہوگا جو تمہیں تمہاری نظروں میں شرمندہ کر دے۔“ سونیا نے اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تو وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ سونیا وہی آواز میں اسے اہم تفصیلات سے آگاہ کرنے لگی پھر استفسار کیا۔
”کوئی سوال؟“

”نہیں۔“ معاذ نے لٹنی میں سر ہلایا۔
”اوکے، تو پھر میں چلتی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ موجودہ حالات میں میرے لیے اپنی جگہ چھوڑ کر ادھر ادھر جانا کتنا مشکل ہو چکا ہے۔ فوراً اور پر پورٹ کی جاتی ہے اور مجھے وضاحت پیش کرنا پڑتی ہے۔“

”شکر یہ سونیا! مجھے اندازہ ہے کہ میری خاطر تمہیں بہت زیادہ آؤٹ آف داوے جا کر کام کرنا پڑتا ہے۔“ معاذ نے ممنونیت کا اظہار کیا۔

”ان فارملیٹیز میں مت پڑو معاذ! مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بھیگی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی اور معاذ بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ ناشی کی سونیا اور موجودہ سونیا میں اتنا فرق آگیا تھا کہ کبھی کبھی حیرت ہوتی تھی کہ کیا یہ وہی خطرناک حسینہ ہے جو میڈم ایکس کے حکم پر سر دھڑکی بازی لگا دیتی تھی اور اس کے لیے دشمنوں کی صف میں شامل ہوتی تھی۔ سونیا کی کیا پلٹ اسے اللہ کا ایک احسان محسوس ہوتی تھی۔ وہی تو تھا جو اس طرح دلوں کے حال بدلنے پر قدرت رکھتا تھا کہ بدلنے والے کو خود پتا نہیں چل پاتا تھا کہ وہ کیسے بدل گیا ہے۔

☆☆☆

”میں نہیں جانتی کہ جینتھر تک پہنچنے کے پیچھے تمہارے کیا مقاصد ہیں۔ مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے اس لیے کہ مجھے تمہارے کسی بھی عمل سے زیادہ اس بیماری معاذ سے غرض ہے جو سونیا نے اس کام کے بدلے میں میرے اکاؤنٹ میں ترانسفر کیا ہے۔ میں اس پارٹی میں تھوڑی دیر شرکت کرنے کے بعد سیدھی اتر پورٹ جاؤں گی اور ہمیشہ کے لیے اس ملک کو چھوڑ دوں گی۔“ گھٹرا لے بالوں والی روزی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کر رہی تھی۔ وہ ایک فری لانسر صحافی تھی جس کا سوشل گید رنگز میں شرکت کرنا ایک معمول تھا چنانچہ سونیا کی فرمائش پر اس نے پارٹی میں شرکت کی راہ ہموار کر لی تھی جس میں کرل جینتھر نے شرکت کرنا تھی۔

”تمہارا ملک سے جانا طے تھا یا تم نے سونیا کی

پیشکش کے بعد یہ پروگرام بنایا ہے؟“ معاذ نے اس سے دریافت کیا۔

”تم یقیناً خوش قسمت ہو لاؤ گے کہ میرا آج کا جانا طے تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں سونیا کی طرف سے اتنی بڑی آفر کے باوجود کوئی رسک لینے سے پہلے سو بار سوچتی۔ دوسرا اتفاق یہ ہے کہ آج کے دن ایک ایسی سوشل گید رنگ بھی تھی جہاں جینتھر کو آنا تھا۔ بس اس گید رنگ کا دعوت نامہ حاصل کرنے کے لیے مجھے تھوڑے سے ہاتھ پیر چلانا پڑے۔ تو ابھی جو کچھ سونیا نے مجھے آفر کیا تھا، اس کے لیے اتنی محنت کرنا تو جتنا تھا۔“ اپنی بات کے اختتام پر روزی نے ایک مسرت سے ہمر پور قبہدہ کیا۔

”اتنے بڑے عہدے پر فائز ہوتے ہوئے جینتھر عام سوشل گید رنگز میں شرکت کی فرصت کیسے نکالتی ہے؟“ معاذ نے حیرت کا اظہار کیا۔

”صرف فرصت نہیں نکالتی، تو اتر سے ایسی گید رنگز میں شرکت کرتی ہے۔“ روزی نے اسے اطلاع دی پھر ایک آنکھ کا کونا دباتے ہوئے معنی خیر لہجے میں ہوئی۔ ”ایسی گید رنگز میں شکار آسانی سے مل جاتا ہے؟“ اس کی یہ بات سن کر معاذ کا چہرہ خیالت سے سرخ پڑ گیا۔

”خوبصورت اور جوان مردوں کا ہولناکے اس عورت کو۔ حالانکہ خود بڑھی گھوڑی ہو جیسی ہے مگر الال گم کا شوق ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔“ روزی نے ایک اور بلند قبہدہ کیا لیکن معاذ مسکرا بھی نہیں سکا اور موضوع بدلنے کے لیے سپاٹ لہجے میں بولا۔

”میں حیرت منی دیر لگی منزل پر پہنچنے میں؟“
”بس سمجھو بیچہ کچھ۔“ روزی اس کی ناگواری کو محسوس کرتے ہوئے سنجیدہ ہو گئی اور ایک مونڈ کاٹنے ہوئے بتانے لگی۔
”میں نے پارٹی ارنج کرنے والی خاتون کو بتا رکھا ہے کہ میں اپنے سنے بوائے فریڈ کے ساتھ پارٹی میں شرکت کروں گی۔ امید ہے کہ تم اس بات کا برا نہیں مانو گے کیونکہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کا اس کے علاوہ کوئی جواز نہیں ہو سکتا تھا۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ معاذ نے اس بار قدرے نرمی سے جواب دیا۔

”مجھے ہوتا پھر میرے ساتھ مغل میں شریک ہوتے ہوئے اسی طرح بی بی ہو کرنا جیسے ایک بوائے فریڈ کو کرنا چاہیے۔ میں تمہیں اس مفت مشورے سے صرف اس لیے نوازی رہی ہوں کہ سونیا نے مجھے بہت ظہیر معاذ سے ادا کیا ہے

اور میری دلی خواہش ہے کہ تمہارا جو بھی مقصد ہے، اس میں ناکام ہو کر اس کی رقم ضائع نہ کرو ورنہ میرا کیا ہے، میں تو جو حاصل کرنا تھا، حاصل کر چکی ہوں۔

”ٹھیک ہے۔ جیسے تم کہو گی، میں دیا ہی کروں گا۔“

”سب سے پہلے تو تھوڑا سا مسکرا دو۔“ اس نے گاڑی کو بریک لگاتے ہوئے کچھ ایسے انداز میں جواب دیا کہ اس کے ہونٹوں پر بچ بچ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”گڈ بوائے! اب آؤ اور ذرا میری بانہوں میں بانہیں ڈال کر اندر چلو۔“ اس نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا اور جیسے ہی معاذ دروازہ کھول کر باہر نکلا، خود ہی آگے بڑھ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ اپنے کردار میں جنگ بھرنے کے لیے معاذ کو بھی طوا کر ہاس کی تھلید کرنا پڑی۔

”تھوڑا آخر ہے تم میں لیکن آئی سمجھ دار ہو۔“ روزی نے تہرہ کیا جس کا جواب اس نے شخص ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دیا۔

وہ دونوں قدم سے قدم ملا کر چلتے ایک شاندار گھر میں داخل ہوئے۔ گھر کے گیٹ پر باوردی ملازمین نے ان کا استقبال کیا اور ایک بڑے سے ہال کی طرف راہنمائی کی۔ ہال سے باہر ہی تیز موسیقی کی آواز آنے لگی اندر کے ماحول سے آگاہ کر دیا۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی رنگ و بو سے انی فضا نے ان کا استقبال کیا۔ بلند موسیقی کے ساتھ بلند آہنگ تہنوں اور گفتگو کا استخراج بھی تھا اور فضا میں نشہ آور اشیا کی بو بھی۔ اس لیے فضا خاصی کثیف تھی لیکن وہاں موجود افراد اس سب سے بے نیاز نظر آ رہے تھے۔

روزی اسے سب سے پہلے میزبان کے پاس لے گئی اور اس کا اپنے بوائے فرینڈ کی حیثیت سے تعارف کروایا۔ وہ کوشش کے باوجود اس کے شکلیں اور بے باکی کا مظاہرہ نہیں کر سکا جو روزی کے بوائے فرینڈ کی حیثیت سے اس کے روپے میں دکھائی دینی چاہیے تھی۔

”بڑا شرمیلا بے بی ہے۔“ میزبان نے اس کے رخسار پر چمکی کاتے ہوئے تہرہ کیا تو اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

”ہاؤ کیوٹ! اسے سنبھال کر رکھنا روزی اور نہ تمہیں پتا ہے کہ یہاں کچھ شکاری بھی گھوم رہے ہیں۔“ میزبان نے آنکھ کا کونا دباتے ہوئے روزی کو متنبہ کیا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ روزی کو کون سا کوئی کی ہے۔“ روزی نے بے نیازی کے اظہار کے لیے شانے اچکائے۔

”اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔“ میزبان نے

خوبصورت خند و خال والی روزی کو سرابھی نظروں سے دیکھا۔ عمر کی تین دہائیاں طے کر چکنے کے باوجود وہ بچ بچ خوبصورت تھی۔

”آؤ۔ میں تمہیں باقی لوگوں سے ملواتی ہوں۔“ روزی اس کا بازو دھام کر اسے دوسری طرف لے گئی۔

”وہ جو بار کاؤنٹر کے پاس گرے اینڈ ریڈ اسکرپٹ میں لمبی سی عورت دکھائی دے رہی ہے، وہ جینتیر ہے۔“ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے روزی نے آنکھ کے اشارے سے اسے بتایا۔ معاذ نے دیکھا کہ چالیس سال کے لگ بھگ والی اس عورت نے خود کو خوب سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ شکل و صورت کے معاملے میں تو وہ بس مناسب ہی تھی لیکن اس کا خاص سانچے میں ڈھلا ورثی جسم اور لمبا قد اسے خاص کشش عطا کر رہا تھا۔

”اس کی طرف توجہ مت دینا۔ اس کی تم پر نظر پڑے گی تو خود ہی تمہاری طرف کھینچی چلی آئے گی۔“ روزی نے سرگوشی میں اسے ہدایت کی اور چند افراد سے ملاتی ہوئی ایک میز پر لے گئی۔

”ہائے۔ روزی!“ انہیں وہاں بیٹھے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ جینتیر آگئی۔

”اوہ، ہیلو۔ آپ بھی ہیں یہاں۔ سوری! میں نے دیکھا نہیں تھا۔“ روزی نے چونکنے کی اداکاری کی۔

”جب انسان اپنی بغل میں ایسا ہینڈ سمسٹا لیے پھر رہا ہو تو پھر کہیں اور دیکھنے کی فرصت کہاں ملتی ہے۔“ جینتیر نے معاذ کو بے باکی سے ٹھوڑتے ہوئے اسے جواب دیا تو روزی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ معاذ نے بھی کوشش کر کے اپنے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ سجائی۔

”آپ کی تعریف میرے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ میں اپنے امیدواروں میں سے اسے فائصل کرنے پر غور کروں گی۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا روزی کہ تم اتنی بدذوق ہو کہ ایسے ڈشنگ مین کو ابھی تک ”قابل غور“ کی لسٹ میں رکھا ہوا ہے۔ میں ہوتی تو اب تک سارے مراحل طے ہو چکے ہوتے۔“ جینتیر کی بے باکی معاذ کو جینتیر پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ جس ماحول میں بل بڑھ کر جوان ہوا تھا، وہاں تو مرد بھی اتنا کھلا اظہار نہیں کرتے تھے چہ جائیکہ ایک عورت۔

”تعارف تو کرواؤ اپنے ہینڈ سمسٹا بوائے فرینڈ کا۔“ جینتیر نے اب اسی میز پر ایک کرسی سنبھال لی تھی اور معاذ پر نظریں جمائے روزی سے پوچھ رہی تھی۔

اس کی نظریں اور اطوار دیکھتے ہوئے سونیا کی اس سے متعلق فراہم کردہ معلومات کی تصدیق ہو رہی تھی۔ جینتیر کو ”مردوں کی شکاری“ کے نام سے پکارا جاتا تھا تو یقیناً یہ غلط نہیں تھا۔ خوبصورت اور اسرار مبر مرد واقعی اس کی کمزوری تھے جب ہی تو معاذ پر نظر پڑتے ہی وہ وہاں نازل ہو گئی تھی اور اس کے روزی کا بوائے فرینڈ ہونے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس میں اپنی بھرپور دلچسپی کا اظہار کر رہی تھی۔

”اس کا نام..... عم..... مار..... ہے۔“ روزی نے سنبھل کر قدرے مشکل کے ساتھ عمار لفظ کی ادا کی۔

”یہ کشمیر، آئی مین، ہندوستان سے آیا ہے اور کسی اسپاٹس اور ڈرائی فروس وغیرہ کے ایکسپوٹر کا نمائندہ ہے۔“ میری اس سے چند دن پہلے ہی اتفاقاً ملاقات ہوئی تھی۔ اچھا لگا تو دوستوں کی لسٹ میں شامل کر لیا۔ ویسے بھی ایڈیم کے جانے کے بعد اس کی جگہ خالی تھی۔ ”روزی نے اپنے سابقہ بوائے فرینڈ کا حوالہ دیتے ہوئے بے نیازی سے بتایا۔

”مڈل!“ جینتیر نے سن کر مختصر تہرہ کیا اور پھر براہ راست اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کی رہائش کہاں ہے مسٹر عمار؟“ یہ وہ پہلا سوال تھا جس کے بعد وہ ایک کے بعد ایک کئی سوال کرتی چلی گئی۔ اس قسم کے عمومی سوالوں کے جواب معاذ نے بھارت کی سرزمین کو چھوڑتے ہوئے ہی سوچ لیے تھے اس لیے اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

”میں کرل جینتیر ہوں۔ میرے فادر اور گرینڈ فادر بھی آری میں تھے بلکہ چچا اور کزن بھی۔ یوں سمجھ لو کہ ہماری فیملی نسل در نسل عظیم اسرائیل کی خدمت گزار رہی ہے اور اس خدمت گزاری کی وجہ سے ہی ہماری ہر جگہ بے حد عزت کی جاتی ہے۔ میرا اپنا ایک ٹیک اور دیگر ریکارڈ ہمیشہ شاندار رہا ہے اور میں نے اپنے کویکٹر کے مقابلے میں بہت تیزی سے ترقی کی منازل طے کی ہیں۔“

”دیری امپرینگ۔“ وہ اسے متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی تو اس نے تسلیم کر لیا کہ وہ اس سے متاثر ہو رہا ہے۔

”تم دونوں باتیں کرو، میں ذرا دوسرے دوستوں سے مل کر آتی ہوں۔“ روزی موقع دیکھ کر وہاں سے اٹھ گئی۔

”تمہیں اس سچ میں کیا پسند آگیا؟ صرف چہرہ خوبصورت ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ بھرپور جسم کے بغیر تو عورت اور مرد کا تعلق ہی بے لطف ہے۔“ روزی کے جانے کے بعد اس نے منہ بناتے ہوئے اس کے چھوٹے قد اور قدرے فرجہ کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میں نے اس سے دوستی اس کی خوبصورتی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے سمانی ہونے کی وجہ سے کی ہے۔“

”کیا تمہیں سمانی پسند ہیں؟“ معاذ کا جواب سن کر جینتیر نے پوچھا تو وہ ہنس پڑا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ بات بس اتنی سی ہے کہ میں جانتا ہوں کہ سمانی خود چاہے کتنا بھی پتھر ہو، اس کا اٹھنا بیٹھنا اونچے لوگوں میں ہوتا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ میں اس کے ذریعے ہائی سوسائٹی میں جگہ بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ معاذ نے ایسی وجہ بیان کی جس سے اس کا لالچا اور مطلب پرست ہونا ظاہر ہو۔ اس نے دیکھا کہ یہ جواب سن کر جینتیر کی آنکھیں چمکنے لگی ہیں پھر بھی اس نے تجاہل سے پوچھا۔

”تم ہائی سوسائٹی میں تعلقات کیوں بنانا چاہتے ہو؟“

”ظاہر سی بات ہے اپنی کلاس بدلنے کے لیے۔ ویسے بھی میں نے ایک چیز نوٹ کی ہے کہ ہائی سوسائٹی کی عورت بہت پُر اعتماد، ریفاقتی اور پھوڑ ہوتی ہے۔ نڈل کلاس کی عورت کو آپ جتنا چاہے پالش کر لیں، اس کی باڈی لیکوئج بنا دیتی ہے کہ وہ کہاں سے ہے۔ میں اپنے لیے ایک شاندار عورت کا متلاش ہوں۔ اسی لیے روزی کو میزگی بنایا ہے۔“ شاندار عورت کے الفاظ ادا کرتے ہوئے اس نے جینتیر کو بہت غور سے دیکھا تھا اور جینتیر نے اس کا دیکھنا محسوس کیا تھا اس لیے خاصی خوش نظر آ رہی تھی۔

”مجھے تمہاری صاف گوئی پسند آئی۔ یہاں بہت سے لوگ تمہارے انداز میں سوچتے ہیں لیکن اس بات کو دوسروں سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”میں نہیں چھپاتا۔ میں روزی سے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہماری ریلیشن شپ لاگ ٹرم ہونے کے امکانات کم ہیں اور جب بھی مجھے اس سے بہتر عورت ملی، میں اس سے الگ ہو جاؤں گا۔“

”واؤ..... امیزنگ۔“ جینتیر نے اسے سراہا پھر بولی۔

”مجھے عرصے بعد کوئی اپنا ہم خیال اور ہم مزاج شخص ملا ہے۔“

”اور یقیناً میری طرح تمہیں بھی اس ملاقات سے خوشی ملی ہوگی۔“

”بالکل۔“ جینتیر نے کسی نوجوان لڑکی کی طرح کھلکھلاتے ہوئے تائید کی۔ اسی وقت روزی وہاں واپس لوٹ آئی۔

”ایکسپریز عمار! مجھے ایک ارجنٹ کام کے لیے

نے اس ہوٹل میں مستقل کمرہ کر دیا تھا۔ وہ ہوشیار عورت تھی جو اپنی گند اپنے سر کے اندر نہیں لے کر جاتی تھی۔ معاذ کو بھی اس کے گھر سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو بس جلد از جلد اپنا کام ختم کر اس آوارہ عورت کی قربت سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ انہی ہوئی سوچوں کے ساتھ وہ اس کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گیا۔

”تم بے شک ساتھ نہ دو لیکن میرے لیے شراب کے بغیر سب کچھ بے لطف ہو جائے گا اس لیے میں تو دو تین جام ضرور لوں گی۔“ کمرے میں پہنچتے ہی جینتھر نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا اور فرنگی کی طرف لپکی۔

”دو تین کیا، آٹھ دس جام پی لیتا۔ میں خود اپنے ہاتھ سے جھینس جام بنا کر دوں گا۔“ معاذ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے برف کی ٹرے لے لی اور کمرے میں موجود بار کاؤنٹر سے سب سے تیز شراب کی بوتل منتخب کر کے لے آیا۔

”اچھا آئیڈیا ہے۔ ویسے تو ایسے مواقع پر دنیا بھر میں عموماً سانی گری کا فریضہ خاتون انجام دیتی ہیں لیکن مجھے بہت اچھا لگے گا کہ میرے لیے یہ کام ایک مرد انجام دے۔“ جینتھر کی حاکمیت پسند طبیعت کو معاذ کی بات پسند آئی تھی۔ وہ بڑی لگاؤ سے معاذ کا ہاتھ تمام کر ایک ٹو سینٹر صوفے پر آئی تھی اور اپنا اچھا خاصا بوجھ اس پر ڈال دیا۔

معاذ ناگواری کے باوجود چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے اسے برداشت کرتا رہا اور پہلا جام تیار کر کے اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ وہ بھی تریگ میں آکر کئی جام چڑھا گئی۔ جوں جوں نشہ بڑھتا گیا، اس کی وحشت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا اور ایک مقام ایسا آیا کہ معاذ نے محسوس کیا کہ بات دست درازی سے بہت آگے نکلے گی ہے۔ اس نے فوراً ہی اپنی جون بدلی اور جینتھر کا سر اپنی مضبوط گرفت میں پکڑ کر انگوٹھوں کی مدد سے کنپٹیوں پر مخصوص انداز میں دباؤ ڈالا۔

وہ جو شراب نوشی کے باعث پہلے ہی مجوم رہی تھی، نشہ کشی کی کیفیت میں دیکھائی دینے لگی۔ معاذ نے اسے ذرا سا ہلکا کر اپنی طرف متوجہ کیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ کام شروع کر دیا جسے انجام دینے کے لیے اب تک خلاف مزاج بہت کچھ برداشت کرنا پڑا تھا۔

جینتھر کو ٹرائس میں لینے کا نتیجہ تھا کہ کچھ دیر میں وہ طبیعت کی رہائی کے لیے جانے کے لیے تیار تھے۔ بس روادگی سے گلے اس کا فہم کرنے کے لیے کچھ ٹوٹے آزمائے پڑے تھے۔ ان ٹوٹوں کے اثر سے وہ کھڑی ہونے اور چلنے پھرنے کے لائق تو ہوئی تھی لیکن ذہن معاذ کے حکم کا

بے راہ روی کے باوجود اس کا سر دس ریکارڈ بے حد عمدہ تھا اس لیے ٹھکانے سطح پر اس کی بہت عزت تھی۔ عمدہ سر دس ریکارڈ کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ وہ اس حد تک سفاک اور بے رحم تھی کہ اسرا علی مفاد کے آگے انسانیت اور اخلاقیات کی دیوہیاں اڑانے میں ڈرا نہیں کھینچتی تھی۔

”ڈرائیونگ کے دوران پیار محبت کی باتیں شروع کر دیں تو حادثے کا خطرہ بڑھ جائے گا۔“ معاذ نے اسے طرح دی۔

”او میں..... تم ضرورت سے زیادہ محتاط ہو۔“ وہ لگاؤ سے بولی۔

”کیونکہ میں تم جیسی رفاقتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے بہت لمبی عمر جیننا چاہتا ہوں۔“ معاذ نے برجستگی سے جواب دیا۔ وہ اس کی برجستگی سے لطف اندوز ہو کر زور سے ہنسی پھر بولی۔

”میرا دل چاہتا ہے کہ ہم کسی شراب خانے پر درک کر واپس کے خوبصورت ماحول میں ساتھ لکرے نوشی کریں لیکن یہاں بھی تمہاری احتیاط پسندی آڈے آرہی ہے۔“

”مجبوری سے ڈرائنگ! میں نے تمہیں بتایا ہے تاکہ میرے ساتھ جگہ کے کچھ مسائل چل رہے ہیں اور ڈرائنگ کرنے شراب نوشی پر پابندی لگا دی ہے۔ شراب فوٹ بے ہر محنت اور زندگی سے بڑھ کر تو نہیں۔“ اس نے پارٹی میں ہی شراب نوشی سے گریز کا بہانہ تراش لیا تھا۔

”مجھے اس جوانی میں تمہاری ایسی پیچیدگی زندگی پر افسوس ہو رہا ہے۔“ جینتھر نے افسوس کا اظہار کیا۔

”اب ایسی بھی پیچیدگی نہیں میری زندگی۔ شراب نہ سہی، شباب سے تو پوری طرح لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔“

”میرا وعدہ ہے کہ اس بار کا لطف تمہیں سارے پچھلے تجربے بھلا کر ایسی پھر پور یاد سے نوازے گا کہ آنے والی زندگی میں بھی تم جیسی اسی فراموش نہیں کر سکو گے۔“ جینتھر کی آنکھوں سے ایسی وحشت بھری ہوس نکلتی تھی جس نے معاذ کو کراہت کے احساس سے بھر دیا لیکن وہ مجبور تھا کہ اسے ابھی مزید کچھ وقت اس عورت کے ساتھ گزارنا تھا۔ فی الحال وہ خاموش بیٹھا رہا۔

”لو بھئی، ہم پہنچ گئے اپنی منزل پر۔“ خاموشی کو جینتھر کی آواز ہی نے توڑا۔

”ہوٹل..... میں تو سمجھا کہ ہم تمہارے گھر جا رہے ہیں۔“ معاذ ہوٹل کی عمارت کو دیکھ کر چڑکا۔

”اپنے خاص دوستوں کی مہمان نوازی کے لیے میں

کی فرمائش پر دوسری بار ڈرائنگ فلور پر موجود تھا تو جینتھر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر جھومتے ہوئے جذبات سے بوجھل لہجہ میں اس کے کان میں سرگوشی کی۔ معاذ کو اس لمحے کا شدت سے انتظار تھا۔ اس کے باوجود اپنے اندر اٹھتی ناگواری کی لہر پر قابو پانے کے لیے خاصی جدوجہد کرنا پڑی اور دل پر جبر کرتے ہوئے بولا۔

”اگر ایسا ہو تو میری رات امر ہو جائے گی۔“

”بس تو پھر چلتے ہیں۔“ ذیہ بھی اب یہاں یوریت ہو رہی ہے۔ اس نے فوراً وہاں سے روانگی کا فیصلہ کر لیا۔

”تم اپنے ساتھ سیکورٹی نہیں رکھیں؟“ وہ جینتھر کے ساتھ اس کی شاندار گاڑی میں روانہ ہوئے تو آگے پیچھے کوئی دوسری گاڑی نہ دیکھ کر اس نے استفسار کیا۔

”مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں خالی ہاتھ بھی ہوں تو بڑے بڑوں کے ہوش ٹھکانے لگانے کی صلاحیت رکھتی ہوں لیکن پھر بھی احتیاطاً اپنے ساتھ اپنی یہ پیاری گن رکھتی ہوں جس نے بھی کسی موقع پر مجھے دھوکا نہیں دیا۔“ اس نے گلو کمار ٹمنٹ میں سے ٹیوک نکال کر اسے دکھایا پھر اسے واپس رکھتے ہوئے مزید بتانے لگی۔

”میری گاڑی بلٹ پروف ہے اس لیے اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں کہ کوئی راستے میں مجھے ہر جگہ کر کے مجھے نشانہ بنا سکے۔ اس سب کے باوجود میری سیکورٹی پر مامور عملہ ہر لمحے میری لائش سے آگاہ رہتا ہے۔ میری سیکورٹی دیکھ رہے ہو؟“ اس نے اپنی لاکھائی معاذ کے سامنے کی۔

”اس پر ایک ایسا مین موجود ہے جسے دباتے ہی میرے سیکورٹی اسٹاف کو خطرے کا سگنل مل جائے گا اور وہ فوری طور پر حرکت میں آجائیں گے لیکن کیا تم یقین کر دے گے کہ میری اب تک کی زندگی میں ایک بار بھی اس بات کی نوبت نہیں آئی ہے۔“ وہ بڑی تریگ میں اسے سب کچھ بتاتی چلی جا رہی تھی۔

”پھر بھی تمکے کے اپنے پروڈکٹز تو ہوتے ہیں نا۔ تمہیں فوج سے کسی پابندی کا سامنا نہیں؟“

”اوہ۔ تم تو میری سیکورٹی کے مسائل میں ہی الجھ کر رہ گئے ہو۔ چھوڑو اس پورے گفتگو کو اور کچھ پیار محبت کی باتیں کرو۔“ وہ اسے ریشہ کشی ہونے والی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ سونانے جینتھر کے بارے میں اسے یہی بتایا تھا کہ وہ کسی آوارہ کتا جیسی فطرت رکھنے والی عورت تھی جو ہر خوبصورت مرد کو دیکھ کر رال پٹانے لگتی تھی اور اسے اپنے ساتھ خلوت میں لے جائے بغیر جین سے نہیں بچتی تھی۔ اس

فوری لکھنا ہوگا۔ تم اگر یہاں رکنا چاہو تو رک سکتے ہو لیکن پھر تمہیں کنوینس پر اہم ہوگا۔“ وہ غلت میں دکھائی دے رہی تھی اور کچھ پریشانی سے یہ الفاظ ادا کیے تھے۔

”اوہ..... یہ تو بہت مسئلہ ہو جائے گا۔ میں یہاں انجوائے کر رہا تھا لیکن میرے خیال میں مجھے تمہارے ساتھ چلنا چاہیے۔“ وہ دونوں ہی اصل میں ایک طے شدہ اسکرپٹ کے مطابق اداکاری کر رہے تھے اور معاذ نے اپنے چہرے پر ایسے تاثرات سجالیے تھے جیسے وہ شدید مجبوری کی حالت میں یہ فیصلہ کر رہا ہو۔

”تم چاہو تو رک جاؤ، میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔“ اس کے سین مطابق جینتھر نے اسے پیشکش کر دی۔

”او ٹھیکس ڈیزیز تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔“ روزی نے اس کا شکریہ ادا کیا پھر معاذ کی طرف دیکھتے ہوئے غلت میں بولی۔

”او کے ڈرائنگ..... سی یو لیٹر!“ اس نے معاذ کے رد عمل کا بھی انتظار نہیں کیا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے وہاں سے نکلی چلی گئی۔

”لگتا ہے قدرت مجھ پر مہربان ہے۔ میں نے جب جینتھر روزی کے ساتھ اس ٹیکل پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا تو سوچا تھا کہ اس پنڈم بوائے کو میرے ساتھ ہونا چاہیے اور دیکھو، قدرت نے خود ہی میری راہ کا کاٹنا کال دیا۔“ جینتھر کی خوش چہانے نہ چھپ رہی تھی۔

”یو میری خوش قسمتی ہے کہ اتنی شاندار خاتون نے میرے ساتھ کی خواہش کی۔“ معاذ نے بھی اسے شیشے میں اتارنے کی کارروائی شروع کر دی۔

”یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں ایک بہت اعلیٰ اور صاحب اختیار خاندان کی فرد ہوں اور مجھے تک رسائی کی صرف ایک صورت ہے کہ میں خود اس شخص کو پسند کر لوں۔“

جینتھر کے لہجے میں ایک خاص احساس تھا۔ اس احساس کا قافریں ہر وہ بیرونی جلال نظر آتا تھا جسے اپنے اعلیٰ نسل سے تعلق رکھنے کا زعم تھا۔ معاذ دل ہی دل میں اس کی سوچ پر لغت سمجھتے ہوئے بظاہر خوشدلی سے اس کے ساتھ خوش گپوں میں مصروف رہا۔ جینتھر کی فرمائش پر اسے اس کے ساتھ رقص بھی کرنا پڑا۔ کچھ مزید لوگوں سے ملاقات بھی ہوئی۔ اس نے نوٹ کیا کہ اس سارے عمل کے دوران جینتھر مختصر وقتوں کے ساتھ مسلسل بے نوشی میں مصروف رہی۔ اسے نوشی سے وہ بالکل ہنسی تو نہیں لیکن سرور میں دکھائی دینے لگی۔ ساتھ چہرے پر لگائی سرنی بھی جھٹکنے لگی۔

”آج کی رات میرے ساتھ گزارو۔“ جب وہ اس

دو بچوں کے غائب ہوجانے کے بعد پتھر پر ماں کے ساتھ بچ جانے والے دونوں بچے اس کی ناگوں سے یوں لپٹ گئے تھے جیسے انہیں امید تھی کہ ماں انہیں اس ظالم پانی کے چھڑوں سے بچا سکتی تھی۔ بے بس ماں نے اپنے بازوؤں میں موجود تیسرے بچے کو اس زور سے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا کہ لگتا تھا کہ اب موت بھی بچے کو اس سے جدا نہیں کر پائے گی لیکن موت کی سٹاک کی سٹا کے پر بچے اڑانے کی بھی صلاحیت رکھتی تھی۔ اگلی بار جو ریل ادا وہ اتنا بلند اور تیز تھا کہ ان ماں اور بچوں سمیت وہ چٹائی پتھر کی نظروں سے اوجھل ہو گیا جو نہ جانے کتنی دیر سے اس بد قسمت خاندان کو پناہ دیے ہوئے تھا۔ اس منظر کو دیکھتے ہی تک پیٹ کے بل دہرا ہوا اور اس زور سے سر کے بالوں کو کھینچ کر اس کے پیچھے ہی دم بخود کھڑی آمت کو لگا کہ بال جڑے اکڑ جائیں گے۔ تک کو کسی قسم کی تسلی دینے سے پہلے وہ اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی اور اس ویڈیو پر موجود کھیلی کیشن کو پڑھنے لگی۔

کیشن کے مطابق پانچ بچوں اور ماں پر مشتمل وہ بے بس خاندان سیلابی پانی کے ریلے سے بچنے کے لیے اس پتھر پر پناہ گزین ہوا تھا لیکن سیلاب اتنا خطرناک تھا کہ وہ لحوں میں ہی اس پتھر پر محصور ہو کر رہ گئے تھے اور بے بسی سے موت کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتے رہے تھے۔ مزدوری کے لیے قریبی شہر جانے والے خاندان کے سربراہ کو اس سانحے کی خبر اس وقت ملی تھی جب سب ختم ہو چکا تھا اور اب وہ ہوش میڈیا کے ذریعے دہائیاں دیتا پھر رہا تھا کہ اس کے خاندان کو بچانے کے لیے امدادی اداروں کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

آمنہ یہ تفصیل پڑھ کر گہری سانس لیتے ہوئے تک کے قریب ہی بیٹھ گئی اور دھیرے سے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ اس کا سس محسوس کر کے تک چونک کر سیدھا ہوا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”ہمت سے کام لو تک اتم مجھ سے بہتر جانتے ہو کہ قدرتی آفات ایسے ہی سانحات کا جنم دیتی ہیں اور تیری دنیا میں جہاں سہولیات کا فقدان ہے، ان حادثات اور سانحات کا تناسب بہت زیادہ ہوتا ہے۔“

”قدرتی آفات.....!“ تک اس کی بات سن کر زیر لب بڑبڑایا۔

”کوئی قدرتی آفت نہیں تھی یہ..... قتل عام تھا۔“ انسانیت کا کل عام۔

لے کی زد میں آنے کا بھی خطرہ تھا جسے جنوں خیر پانی اپنے ساتھ بھاتا ہوا لارہا تھا۔

کچھ لوگ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اس چٹائی پتھر پر پہنچے ماں اور بچوں تک دی بھیجی جاسکے جس کے ساتھ باندھ کر سب کو نہ سکی، کسی کو تو زندہ سلامت کنارے کی طرف بھیجا جاسکے لیکن ایک تو فاصلہ زیادہ تھا، دوسرے ہوا بھی اتنی تیز چل رہی تھی کہ ان کی کسی کوشش کو کامیابی حاصل نہیں ہو پاری تھی۔ اس پر تم یہ تھا کہ پانی کی سطح مسلسل بلند ہوتی چلی جا رہی تھی اور اب یہ حال ہو چکا تھا کہ کوئی لہر پتھر سے گرائی تھی تو اس پر پناہ لیے ہوئے ماں اور بچوں کو اڑنے والے چھینٹے بھگو ڈالتے تھے۔ اس لمحے ان کے حلق سے ایسی چیخیں بلند ہوتی تھیں کہ ویڈیو میٹ ہونے کے باوجود تک کو اپنے کالوں میں ان کی گونج سنائی دیتی تھی۔ وہ اکڑے ہوئے جسم اور ساکت آنکھوں کے ساتھ سوشل میڈیا پر چلنے والی اس ویڈیو کو دیکھ رہا تھا جس نے یقیناً ہر صاحب دل انسان کو تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

کیرے کی آنکھ اسے دکھا رہی تھی۔ جہوم میں شامل افراد میں سے بھی کئی لوگ اب ان ماں اور بچوں کے ساتھ چیخ کر رہے تھے۔ کچھ نے تو اپنی آنکھیں ہی بند کر لی تھیں کہ ان میں اس دردناک منظر کو دیکھنے کی مزید تاب نہیں تھی لیکن کچھ تھے جو اب بھی کوششوں میں مصروف تھے۔ سب فون کالوں سے لگے شاید وہ کسی امدادی ادارے کو کال کرنے کی سعی لا حاصل میں مبتلا تھے۔ تیری دنیا کے اس ملک کے ایک دور افتادہ علاقے میں جہاں عام دنوں میں بھی سہولیات کا فقدان تھا، اس آفت کے وقت جبکہ سارا انفراسٹرکچر ہی تباہ ہو چکا تھا، پتھر پر پہنچنے ان چھ عام سے شہریوں تک کسی امداد کا پہنچنا دیوانے کا خواب ہی سمجھا جاسکتا تھا۔ اول تو سگنلز نہیں تھے۔ قسمت سے کنٹرول جاتے تو ہیملٹ لائنز پر اتارنا تھا کہ کال ملنا مشکل تھی۔ کال مل بھی جاتی تو امدادی پہلی کا پٹر کی دستیابی کا سوال نہ پیدا ہوتا تھا۔ ان چھ نفوس کا انجام وہ گویا ویڈیو ختم ہونے سے پہلے ہی دیکھ چکا تھا لیکن پھر بھی جب ایک تیز لہر آئی اور پتھر پر سے دو بچے ایک ساتھ غائب ہو گئے تو تک کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ سن کر بچن میں کام کرتی آمت دوڑ کر آئی لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ وہ حرکت کرنے سے قاصر آنکھیں پھاڑے اسکرین پر چلتے منظر کو دیکھتا رہا۔

میں بیٹھنے میں مدد دینے لگا۔ وہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔ گاڑی میں بٹھاتے ہوئے اندرونی روشنی کے سبب ارتعاشی نے اس کی انگلیوں کو اکھڑے ہوئے ناخن بھی دیکھ لیے۔

”اپنی مظلوم بہن کو سفاک بھیڑیوں کے جنگل سے نکالنے کے بدلے اگر ہمیں کسی کا اس سے بھی زیادہ سخت لہجہ سننا پڑتا تو سن لیتے۔“

ارتعاشی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں کہا تو معاذ جوں کہ خود بھی یہ سب ٹوٹ کر چکا تھا، اپنی جگہ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ واقعی بعض جگہ حالات اتنے جنگجک ہوتے ہیں کہ ان حالات میں بیٹھے لوگوں کے لیے صبح اور غلط کے درمیان تفریق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس خطے کے لوگ بھی ایسی نگلکش کا شکار تھے۔

☆☆☆

وہ ایک بہت بڑا چٹائی پتھر تھا جس پر اس وقت چھ نفوس دکھائی دے رہے تھے۔ ان چھ انسانوں میں بالغ انسان صرف اور صرف ایک تھا اور وہ ان پانچ عدد بچوں کی ماں تھی جن کی عمریں دس سال سے نیچے تھیں۔ لباس کی بنیاد پر شناخت کیا جاسکتا تھا کہ عورت کے اطراف موجود چار عدد بچوں میں سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں البتہ پانچواں بچہ جسے اس کی ماں نے چھوٹی سی چادر میں لپیٹ کر اپنے سینے سے چمٹا رکھا تھا، اس کی جنس کا تعین کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ جتنا چھوٹا سا تھا، اسے دیکھ کر بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی عمر چند دن یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتے ہی تھی اور یقیناً یہی وجہ تھی کہ ان چھ عدد نفوس میں واحد وہ تھا جو پڑسکون دکھائی دے رہا تھا۔ باقی پانچ عدد اتنے متوحش اور خوفزدہ تھے کہ رونے کے ساتھ ساتھ ہاتھ اٹھا اٹھا کر بری طرح مدد کے لیے چلا رہے تھے لیکن ان کے اطراف میں انسانوں کا جم غفیر ہونے کے باوجود مدد نہیں نہیں تھی۔

ماں، مدد نہیں تھی۔ باوجود اس کے کہ جہوم میں موجود ہر فرد ان چھ عدد انسانی جانوں کو بچانے کے لیے اپنی اپنی جگہ بے قرار تھا، مدد موجود نہیں تھی۔ مدد کی ہی نہیں جاسکتی تھی کہ اس جہوم اور پتھر پر موجود نفوس کے درمیان ٹانگیں مارتا پانی حائل تھا۔ پانی کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ کسی ماہر سے ماہر تیراک میں بھی اس کے اندر اترنے کی ہمت نہیں تھی۔ اگر کسی سے باندھ کر کسی شخص کو اس پانی میں اتارا بھی جاتا تو اس کی سلامتی مشکوک ہوتی کیونکہ اترنے والے کو صرف بہتے پانی کی تندگی کا سامنا نہیں کرنا تھا بلکہ ان درختوں کے تنوں، ٹوٹی عمارتوں کے ٹکڑوں اور دیگر

غلام تھا۔ اس غلام ذہن نے سلاخوں کے پیچھے قید طیبہ کو اپنے اختیار کے زور پر تفتیش کے نام پر باہر نکالا اور گاڑی میں خطرہ بیٹھے معاذ تک پہنچا دیا۔

”ہمارا تہوار اساتھ بس یہیں تک تھا۔ آج کے بعد میں دوبارہ تمہاری مکروہ شکل دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔“ معاذ نے کچھ دور نکلنے کے بعد جیتھر سے یہ الفاظ کہے اور اس کی کپٹی پر اس زور کا مارا کہ سید کیا کہ وہ تھوڑا کر بے ہوش ہو گئی۔ طیبہ جواب تک ہتھکڑیوں میں جکڑی ہوئی تھی، حیرت سے یہ منظر دیکھتی رہ گئی۔

”آپ کے ہم دروہوں نے آپ کی رہائی کے لیے مجھ سے یہ سارے پاپ بولائے ہیں۔ جا کر آزادی کے مزے لو لیے لیکن یاد رکھیے گا کہ انسان، انسان ہوتا ہے اور رب کائنات نے ناحق کسی بھی انسان کا خون بہانے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اتفاق الگ چیز ہے لیکن یہ بات تقریباً ہر شخص جانتا ہے کہ خود کش حملوں میں اصل ٹارگٹ کے ساتھ بہت سے بے گناہ بھی زد و کوب کیے جاتے ہیں۔ آپ اپنوں کے بے گناہ مارے جانے کے درد کو جانتی ہیں اس لیے امید کرتا ہوں کہ آئندہ کسی اور کو اس تکلیف میں مبتلا نہیں کریں گی۔“ اس نے طیبہ کی حیرت دور کرنے کے ساتھ ساتھ اسے فصاحت بھی کر ڈالی۔ وہ کوئی جواب دیتی، اس سے قبل ایک گاڑی ان کے قریب آرکی۔ اس نے طیبہ کی سیٹ کے ساتھ ذخیر کے ذریعے بندھی ہتھکڑی کو چابی کی مدد سے کھولا اور اسے نیچے اترنے کا اشارہ کر کے خود بھی گاڑی سے باہر نکل آیا۔ دوسری گاڑی میں ارتعاشی ان کا منظر تھا۔

”میں نے شرط پوری کر دی۔ امید ہے ابو جہزہ کو اب میرا ساتھ دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ خلاف مزاج کام کرنے پر اس کا انداز کچھ اکھڑا ہوا سا تھا جسے ارتعاشی نے بھی محسوس کر لیا اور وضاحت دینے والے انداز میں بولا۔

”ایسی بات نہیں ہے معاذ بھائی! آپ یہ کام نہ بھی کرتے تو ابو جہزہ آپ کا ساتھ دیتے لیکن ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہم آپ کی طرح بغیر کسی ہنگامے کے یہ کام انجام نہیں دے سکتے تھے۔“

”میری بھی مجبوری ہے کہ میں اپنے وطن اور اپنے مسلمان بھائیوں کی خاطر جس کام کو انجام دینے لگا ہوں، اسے انجام دینے بغیر واپس پلٹنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اس لیے بہت کچھ طبیعت پر گراں گزرنے کے باوجود بھی برداشت کرتا جا رہا ہوں۔“ اس کے لیے کئی ابھی تک قائم تھی۔ ارتعاشی نے مزید کوئی وضاحت دینا مناسب نہ سمجھا اور طیبہ کو گاڑی

”تمہارا مطلب ہے.....“ آئندہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی۔

”ہاں، یہ ہمارا ہی کیا ہوا اور تھا۔ بڑوں کا خیال تھا کہ تیری دنیا کا یہ ملک جس طرح اپنی حیثیت بھول کر ہمیں آنکھیں دکھاتا ہے اور حکم کھاتا ہے وہ جوڑ کی مخالفت کرتا ہے، ہمارا حق بنا ہے کہ ہم اسے سبق سکھا دیں۔ یہ سب جھپٹے ہی بیٹے کیا گیا تھا اور میں نے اس میں ایک ماہر کی حیثیت سے حصہ لیتے ہوئے صرف اس بات کا خیال رکھا تھا کہ موسم میں وہ تبدیلی پیدا کروں جو مطلوبہ شدت کی بارشوں اور سیلاب کا باعث بن سکے۔ مجھے اور میری ٹیم کو اس کام پر اوپر سے شاہاوش کے ساتھ ساتھ انعام کے طور پر تنخواہ میں رخصت انگریمنٹ دیا گیا تھا۔ میں خوش تھا کہ میں نے اپنے وطن کی خدمت کی ہے لیکن میں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اس سب کا نتیجہ کیا نکلا ہوگا۔“ تک جو اس وقت اصل میں آئندہ کا سوشل میڈیا کا ڈنٹ استعمال کر رہا تھا، کرب زدہ لہجے میں بولتا چلا گیا۔

”میں تمہیں یہی سب سمجھا رہی تھی تک اتم کیا سمجھتے ہو کہ یہ قتل عام صرف ایک محدود وقت تک ہوا ہوگا؟ نہیں تک نہیں۔ اس سیلاب کے متاثرین اب بھی بے گھر اور خالی پیٹ کھلے آسمان تلے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی حکومتیں ان کی تباہ حالی دکھا کر عالمی برادری سے امداد طلب کرتا تو جانتی ہیں لیکن ان کی دوبارہ آباد کاری جتنا مشکل کام ہے، تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔“ آئندہ کے لہجے میں شدید دکھ تھا۔

”میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں خود کو کوئی مار لوں۔“ تک نے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر زور سے کھینچا۔ کچھ دیر قبل اس نے جو ویڈیو دیکھی تھی، وہ اتنی دردناک تھی کہ وہ اندر سے لرز کر رہ گیا تھا۔

”یہ کوئی حل نہیں ہے تک! ایسا کرنے سے تم اپنا یا کسی دوسرے کا کوئی بھلا نہیں کر پاؤ گے۔ کرنا ہے تو کچھ ایسا کرو جس سے انسانیت کو کوئی فائدہ ہو سکے۔“ آئندہ نے اسے سمجھایا۔

”میں کیا کروں؟“ اس نے بچوں جیسی مصیبت کے ساتھ چوچھا۔

”سب سے پہلے تو یہ فیصلہ کر لو کہ اب تمہیں کسی قلم میں حصے دار نہیں بننا ہے۔ جب یہ نیت کر لو گے تو آگے ازالے کے لیے مزید راہیں نکل ہی آئیں گی۔“ آئندہ نے رسان سے اسے مشورہ دیا تو وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ اس وقت اس کا ذہن گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

☆☆☆

”بہت افسوسناک۔“ سون اور لیف کے چروں پر سہمے غم کے تاثرات تھے۔ وہ دونوں امریکی ڈیوٹی پر بروکس سے جیل آئے تھے اور کئی مہینوں کی مسلسل ڈیوٹی انجام دینے کے باوجود ان دونوں سے ملاقات کا وقت نکال لیا تھا۔

”کاش ہم اسے روک پاتے۔ مجھے اس کا رویہ مشکوک تو لگا تھا لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی کوئی اتنا بڑا قدم اٹھا بیٹھے گا۔“ ایلی کی موت نے شہر یار کو بھی افسردہ کر دیا تھا۔

”اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ایلی کے جسم کے ٹکڑے جوڑ کر اسے دوبارہ زندہ کرتی اور اسپتال کے ان وارڈز کا ڈنٹ کرواتا جہاں کئی بے قصور لوگ اس کی انتہا پسندی کے نتیجے میں بستروں پر پڑے سک رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو ہماری سر توڑ کوشش کے باوجود زندہ نہیں بچ سکے۔ کچھ ہمیشہ کے لیے معذور ہو جائیں گے اور باقی جو جسمانی طور پر تندرست ہو جائیں گے، ان کے ذہنوں سے کبھی اس جاوٹے کی دہشت نہیں نکل سکے گی۔ میں اس سے پوچھوں گی کہ ایک ناپسندیدہ شخص کو انجام تک پہنچانے کے لیے اتنے سارے لوگوں کی زندگیاں تباہ کر دینے کی کون سا مذہب اجازت دیتا ہے۔“ سون کی آواز میں غمی تھی اور آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ رو رہی رہی ہے۔

”ریٹیکس ڈارلنگ! ایلی کو جو کرنا تھا، وہ کر چکا ہے۔ شاید ایک ذمہ خورہ انسان بھلے اور بڑے میں اس طرح تمیز کرنے کے لائق نہیں ہوتا جیسے ایک عام فرد اور عام انسان سوچ سکتا ہے۔“ لیف نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھایا۔

”میں مانتی ہوں کہ اس کے ساتھ بڑا ہوا تھا لیکن قدرت نے بہترین ازالہ بھی تو کر دیا تھا۔ لیلی وہی جیسی عورت کے بیٹے کی حیثیت سے زندگی گزارنے سے بڑی نعمت کیا ہو سکتی ہے۔ لوگ ترستے ہیں اتنی پراسائش زندگی کے لیے اور اس لئے کہ اس زندگی کو شوکر ماردی۔“ سون جذباتی ہو رہی تھی۔

ظلم و جبر کے سماج میں
کسی نہ استبداد جو ظلم کا رعب ہے
نہایت افسوسناک ہے
نہایت افسوسناک ہے

ناشتے کی ٹرے کو چھوٹی سی ٹیبل پر رکھ کر سزمیری میگ کرسی پر بیٹھ گئی۔ سزمیری کی فریادیں سننے والے اسٹیلی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ سزمیری کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی اور تکان تھا۔ وہ بھی اگر غور سے اسٹیلی کو دیکھتی تو یقیناً اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی اور وہ اسے سزگنیا کا نام دیتی لیکن میری اس سے بے نیاز نہیں تھی۔

”دروازہ اچھی طرح بند کر جانا۔“ توس کا ٹکڑا اند میں ڈالنے سے سزمیری میگ نے اسٹیلی کی جانب دیکھے

اپنی ذات کے خول میں بند چند بیزار لوگوں کے دلوں کا چوکا دینے والا احوال انسان ہویا جانور... ان کی فطرت میں ملنا جلنا... ایک سے دوسرا ہٹ کا احساس رکھنا... یاد رکھ سکتے ہیں ایک دوسرے کے کام آنا شامل ہوتا ہے... مگر اس مکان کے ممکن بہت عجیب فطرت کے مالک تھے جیسے بالکل روبوٹ... مشینیں انداز میں اپنے کام سے کام رکھنا... البتہ انہی میں ایک شخصیت ایسی بھی تھی جسے ان کی خاموشی میں چھپے طوفان کا شور وحشت میں مبتلا کر دیتا تھا اور... اس کی نظر میں ملنا جلنا اور اپنے جذبات کا اظہار لازم تھا... پھر اس کے لیے کی گئی اس کی ساری کارشیں ایک دن بہت خوبصورت رنگ لے آئیں۔

پیرا... بیس
عسیرق بحساری



بغیر کہا۔

”اچھی طرح بند نہ بھی ہوا تو کون سا تھارے کمرے میں کسی نے آ جانا ہے۔ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اسٹیلی نے باہر نکل کر دروازہ بند کیا اور اٹھنا شروع کرنے کے لیے کچن کی جانب بڑھ گئی جہاں اس کی ماں بار بار ناشا بنا کر پلیٹوں میں رکھ رہی تھی۔

”اب مسٹر ایڈیسن کا پور چہرہ دیکھنا پڑے گا۔“ بار بار اسے پلیٹ تھامتے ہوئے اسٹیلی بڑبڑاتی اور کچن سے باہر نکل گئی۔

”شکر یہ..... دکھ دو۔“ مسٹر ایڈیسن کا ”شکر یہ“ بھی خشک سا تھا۔ تین کمروں میں جانے کے بعد اسٹیلی اب میزبیاں چڑھ رہی تھی کیونکہ دوسرے بالائی منزل پر تھے۔ کس کمرے میں کیا کیا جائے گا..... کون کیا بولنے کا؟ یہ اسٹیلی کو اچھی طرح یاد ہو چکا تھا۔ سب روشین کے مطابق ہو رہا تھا۔

”لے آئی ہو ناشا؟“ ٹھیک ہے، لاؤ پکڑاؤ۔“ کیم نے دروازے سے ہی پکڑ لیا۔

”میرا خیال ہے، دیر کر دی۔ خیر، اسے ٹیبل پر دھیان سے رکھ دو اور ہاں، ٹرے رکھنا ہے..... چٹختا نہیں۔“ جو روٹ نے کمر دروازے میں کہا۔

اسٹیلی نے کیم کی تعمیل کرتے ہوئے اسے گھورا لیکن وہ دوسری جانب دیکھ رہا تھا اس لیے بچاری کا گھورنا بیکار گیا۔ ”کانی کا کپ مجھے پکڑا دو اور ناشا ڈھانپ کر رکھ جاؤ۔“ بیڈ کی پشت سے ٹپک لگائے ہوئے ٹھکے انداز میں روزا کیمرون بولی۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ تقریباً ایک ہی جیسے جیسے سنتے ہوئے اسٹیلی نے ناشا سرو کرنے کا کام مکمل کیا اور پھر وہ اور اس کی ماں بار بار ناشا کرتے لگیں۔

”مئی! یہ سب کتنے بور لوگ ہیں۔ کتنا خاموش اور تنہا رہنا پسند کرتے ہیں۔ انہیں اکٹاہٹ نہیں ہوتی ایسی لائف سے؟“ ناشتے کے دوران اسٹیلی نے ماں سے سوال کیا۔ دونوں اپنے کمرے میں بیٹھی تھیں۔

”بچارے تنہا جو ہیں تو پھر ایسے ہی رہیں گے نا۔“ بار بار اسے دہرے سے کہا۔

”لیکن مئی! یہ مجھ سے اور دوسرے کمروں والوں سے تو بات نہ کر سکتے ہیں نا۔ اتنا کم بولتے ہیں جیسے بولنے پر بھی بھاری ٹیکس لگا ہوا ہو۔“ اسٹیلی نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا تو بار بار اسکرادی۔

”میں اور تم ان کی ملازما ہیں۔ ہم سے کیوں زیادہ بات کریں گے..... اور آپس میں اجنبی ہیں تو ظاہر ہے ”مڈ مارنگ“ یا ”مڈ نائٹ“ سے زیادہ اور کیا بولیں۔“ اس نے بیٹی کو سمجھایا۔

”تو کیا یہ ہمیشہ ایسے ہی زندگی گزاریں گے، چند جملے بول کر؟“ معصوم سی اسٹیلی کو لگنے لگیا۔

”چلو، جلدی سارے برتن سک پر پہنچاؤ اور انہیں دھوئے میں میری مدد کرو۔“ بار بار اسے تنگ ہوتے ہوئے موضوع بدلا۔ اسٹیلی نے خاموشی سے ناشا ختم کیا اور پانچ بور لوگوں کے کمروں سے برتن اٹھانے کے لیے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

”جو رکنز ولا“ نامی اس خوبصورت و کشادہ عمارت میں سات افراد مستقل طور پر رہائش پذیر تھے۔ باربرا، اس کی بیٹی اسٹیلی بطور ملازم اس عمارت میں گزشتہ آٹھ سالوں سے مقیم تھیں۔ اس سے قبل جو رکنز نامی امیر ترین برنس میں اپنی فیملی کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔ تقریباً ایک سال قبل اس نے اپنا برنس دوسرے ملک تک پھیلایا تو فیملی سمیت وہاں شفٹ ہو گیا۔ اس نے یہ عمارت ریٹ پر دینے کا فیصلہ کیا تو مختلف ٹیلیز اور لوگوں نے رابطہ کیا تو جو رکنز نے یہ مناسب سمجھا کہ مختلف لوگوں کو کمرے کرائے پر دیے جائیں۔ اس عمارت کو کرائے پر دینے کے لیے اس کی جو خصوصیات بتائی گئیں، ان میں ایک یہ تھی کہ کم روفنگ جگہ پر ہونے کی وجہ سے رہنے والے پُر شور اور پُر جوم زندگی سے قدرے دور پُر سکون رہ سکتے تھے۔ یہ بلڈنگ ان لوگوں کے لیے کافی پُرکشش تھی جو الگ تھلگ اور اپنے آپ میں مگن رہنے کے عادی تھے۔ جو رکنز کے منجمر نے جلد ہی اسے خبر دی کہ ”جو رکنز ولا“ آباد ہو گیا ہے۔ اس میں پانچ افراد نے کچھ مدت رہنے کے لیے پڑاؤ ڈالا۔

گراؤنڈ فلور کے چیمبرے میں ایڈیسن ٹھہرا۔ ایڈیسن ریٹائرڈ ٹیچر تھا۔ پنشن ملی تھی اور ایک میگزین میں آرٹیکلز بھی لکھتا تھا جس کا اسے معقول معاوضہ ملتا تھا۔ ملازمت چھوڑنے کے بعد وہ کافی تنہائی پسند ہو گیا تھا۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور بچے شادی شدہ تھے۔ اس نے شوقیہ یہاں رہنا پسند کیا تھا۔ اس کا بیشتر وقت مطالعہ کرنے میں گزرتا تھا۔

دوسرا کمرہ جو روٹ کا تھا۔ جو روٹ ریٹائرڈ فوجی تھا۔

سپنس ڈائجسٹ 80 اکتوبر 2024ء

انتہائی سخت مزاج۔ شاید اسی وجہ سے فیملی سے بن نہ پائی۔ وہ بھی اکیلے رہنا پسند کرتا تھا۔ اس کی بیوی کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اس کا گزراہہ پنشن اور ایک چھوٹے سے پلٹری فارم پر تھا۔ میری میگ کے حصے میں تیسرا کمرہ آیا۔ اس کا تعلق اس شہر سے کافی دور قصبے سے تھا۔ پُرکشش ملازمت کی وجہ سے اسے شہر منتقل ہونا پڑا۔ مختلف ہاسٹلز میں رہنے اور بے انگ گیسٹ ہونے کے بعد وہ یہاں آ گئی تھی۔ میری بہت کم سمجھی۔ آفس میں بھی کام سے کام رکھتی اور اس کے بعد بھی اس کا زیادہ بولنے یا کسی سے ملنے جلنے کا شوق نہیں تھا۔

بالائی منزل کا ایک کمرہ جو بیڑیوں سے کچھ ہی فاصلے پر تھا، وہ کیم نے لیا۔ کیم کا شہر میں ایک چھوٹا سا ریٹائرمنٹ تھا۔ بیوی بچوں سے علیحدگی کے بعد دن بھر ریٹائرمنٹ میں مصروف رہتا اور رات کو خواب آؤر دو الینا اس کا معمول تھا۔ کیم کی آنکھوں میں ہر وقت سرخی اور بے چینی سی نظر آتی تھی۔

دوسرا کمرہ جو بالکل کیم کے کمرے کے بالمقابل تھا، وہ مس روزا کیمرون کے حصے میں آیا۔ مس روزا کئی سال کیمشری کا خشک مضمون پڑھانے کے بعد ریٹائر ہوئی تو کافی خشک مزاج ہو چکی تھی۔ اسے بھی اپنے کمرے، اپنی لائف تک محدود رہنا پسند تھا۔ بس کبھی کبھی واک کے لیے نکلتی۔

ان تمام افراد کا یہاں رہنے کا مقصد یہی تھا کہ شور شرابے سے دور کسی بھی طرح ڈسٹرب ہوئے بغیر زندگی گزار دی جائے۔ اتفاق سے ان سب میں ایک بات مشترک تھی۔ وہ یہ کہ وہ پانچوں اپنی پرائیویسی کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان پانچوں کو زیادہ میل جول، مگپ شپ، شور، رونق سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اسٹیلی اور اس کی ماں باربرا کو جو رکنز اپنے آبائی شہر سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ غریب باربرا کو بطور تنگ رکھا گیا تو اس کی حالت بہت اچھی ہوئی۔ اچھی رہائشگاہ، معقول معاوضہ ملا تو اس نے اسٹیلی کو اچھے اسکول میں داخل کروا دیا لیکن بد قسمتی سے بیٹی کو اچھی تعلیم دلوانے کا اس کا خواب بڑی طرح ٹوٹ گیا۔ ہوائیوں کے اسٹیلی کے اسکول میں ہم دھماکا ہو گیا۔ خوش قسمتی سے وہ تو بالکل محفوظ رہی لیکن اس نے اپنے سامنے اپنے کلاس فیلوز کو لاشوں میں بدلے اور بہت سا خون بہتہ دیکھا۔ اس حادثے کا بھی اسٹیلی پر بہت برا نفسیاتی اثر پڑا اور اس نے اسکول ہی چھوڑ دیا۔ باربرا نے کافی کوشش کی لیکن بھیا تک حادثے نے اس کی بیٹی کو اتنا

توڑ چھوڑ دیا کہ اس کی تعلیم میں دلچسپی بالکل ختم ہو گئی اور وہ ماں کا ہاتھ بنانے کے لیے گھر پر رہنے لگی۔

جو اٹھنے والے شوہر سے علیحدگی اختیار کرنے والی باربرا کے لیے اسٹیلی کا تعلیم چھوڑ دینا کافی دکھ کی بات تھی لیکن ظاہر ہے اسے یہ سب برداشت کرنا پڑا۔

چند سال گزرے۔ جو رکنز کا کاروبار وسیع ہوا اور پھر اس نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا تو باربرا گھبرا گئی کہ اچھی بھلی مستقل ملازمت اور رہائش ہاتھ سے چلی جائے گی لیکن جو رکنز کی مہربانی سے اسے نئے کمینوں کی ملازمت کے طور پر برقرار رکھا گیا۔ یعنی ”جو رکنز ولا“ میں آنے والوں کو یہ سہولت ملی کہ انہیں تین وقت کا کھانا پکانے والی ملازمت میسر آگئی۔

باربرا کی تنخواہ ان پانچوں کو اپنا اپنا حصہ ڈال کر ادا کرنا تھی۔ یہ میسے اس کی پہلی تنخواہ سے زیادہ تھی۔ باربرا خوش ہوئی کہ کچھ بھی نہیں چھوٹا اور تنخواہ بھی بڑھ گئی۔ اب دونوں ماں بیٹی نئے لوگوں کا کھانا پکاتیں، سرو کرتیں۔ اس کے علاوہ لاؤنج اور کچن کی صفائی ان کے ذمے تھی۔ باقی تمام کمروں، گیلری اور لان کی صفائی کرنے کی ذمہ داری باربرا، اسٹیلی کی طرح پرانے ملازم جم کی تھی۔

اسٹیلی نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ وہ عمارت جو اس سے پہلے پُر رونق تھی، اب یکدم یہاں سناٹوں کا راج ہو گیا ہے۔ پرائیویسی کے نام پر ہر شخص نے عجیب ویرانی پھیلارکھی تھی۔

سراڈیسن دو چار بار کافی ہنوا کر پیتے اور کبھی کبھار اپنے کمرے میں موجود ٹیلی میں خود بھی بتاتے۔ چہرے پر حد درجہ متانت و سنجیدگی لیے وہ مختلف موضوعات پر کتابیں پڑھتے پڑھتے جاتے یا آرام کرتے۔ اسٹیلی انہیں دیکھتی تو اس کا دل کڑتا کہ وہ کبھی کبھار چند جملے بول لیا کریں۔ کتاب ساٹھ پر رکھ کر اس کے بارے میں ہی کچھ کہیں۔

اسٹیلی نے اگرچہ اسکول کی تعلیم بہت جلد چھوڑ دی تھی لیکن باربرا اور جو رکنز فیملی کے بچوں کو پڑھانے آنے والے ٹیچر کی مہربانی سے اسٹیلی اس قابل ہو گئی تھی کہ کس پڑھ سکے۔ اس کا بچی چاہتا کہ کوئی بک مانگے کہ بھانے سر ایڈیسن سے بات کرے اور پھر کبھی گفتگو ہو اور پھر شاید کچھ اچھل پیدا ہو جائے۔

”آپ کس طرح کی کتابیں پڑھنا پسند کرتے ہیں؟“ ایک روز شام کے وقت کانی کا کپ ایڈیسن کے پاس رکھتے ہوئے اسٹیلی نے سوال کیا۔

”ہر طرح کی۔“ نہایت مختصر جواب ملا۔

سپنس ڈائجسٹ 81 اکتوبر 2024ء

”آپ اسکول میں کون سا مضمون پڑھاتے تھے؟“
گفتگو کرنے کی خاطر اسٹیلی نے اگلا سوال کیا۔
”فزکس۔“ مختصر ترین جواب ملا۔
”آپ اکیلے ہیں۔ پورے نہیں ہوتے اس طرح کی.....“ اسٹیلی یونٹی چار دی گئی تاکہ مسٹر ایڈیسن کی عادت بدل سکے۔

”میں آج رات کا کھانا نہیں کھاؤں گا۔“ سرائیڈن نے کہا۔ ”اور جانے سے پہلے کھڑکی کھول دو۔“ مزید کہا گیا۔
”منظب میں جاؤں۔ اب مزید برداشت نہیں کیا جائے گا۔“ اسٹیلی نے دل میں کہا اور کھڑکی کھول کر باہر نکل گئی۔
”معلوم نہیں یہ سب ایک جیسے ہی کیوں اس بلڈنگ میں آئے ہیں۔ کوئی ایک ہی مختلف ہوتا۔“ پلٹیں صاف کرتے ہوئے اسٹیلی نے کہا۔

”ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کون کیسا ہے اور کتنا بولتا ہے یا تجاہر ہوتا پسند کرتا ہے۔ ہم یہاں ملازم ہیں۔ ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔“ باربرائے اسے سمجھایا۔
”لیکن می! دیکھو نا، پہلے یہاں کتنی رونق تھی۔ ٹی وی، میوزک کی آواز، لوگوں کے ہنسنے بولنے کی رونق، مسکراتی فلمی والے۔ ملازم سبھی کتنے متحرک تھے اور سچ بتاؤں، میں یہ سب مس کر رہی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے اس عمارت کی سیزھیوں سے لے کر لاؤنج تک اور کمروں سے لے کر کچن تک ایسا ماحول بنے کہ تھیں ہو جائے یہاں انسان رہتے ہیں۔ دراصل میں اس جگہ رونق دیکھ چکی ہوں اس لیے یہاں کی خاموشی اور تنہا تھا سے انسان مجھے بہت عجیب لگتے ہیں۔“ پلٹیں ان کی جگہ پر نفاست سے سیٹ کرتے ہوئے اسٹیلی نے کہا۔

”درست کہتی ہو..... لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔“
باربرائے سبک چکاتے ہوئے بے بسی ظاہر کی۔

☆☆☆
”سرا! کیسا جمل رہا ہے آپ کا ریسٹورنٹ؟“ اسٹیلی نے بڑے دوستانہ انداز میں سوال کیا۔

”ٹھیک چل رہا ہے..... لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ ایک بچی کا ایسے معاملات سے کیا لینا دینا؟“ دوستانہ انداز میں پوچھتے گئے سوال کا بڑے کمر دے لہجے میں جواب ملا۔
”لگے پنگ فرام میں ملبوس، پلٹتے سے بالی جمائے، نرم سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اسٹیلی کو سرخ سی آنکھوں والے نیم سے ایسے ہی لہجے اور جواب کی توقع تھی۔ وہ نیم کو رات کا کھانا دینے آئی تھی حالانکہ وہ اپنی بھی پہنی تھی لیکن

نیم نے بس کہہ دیا۔

”بس، ایسے ہی پوچھا تھا..... سو رہی شاید آپ کو بڑا لگا۔“ اسٹیلی نے فوراً معذرت کی۔

”ذرا وہ دراز کھولو۔“ نیم نے اس کی معذرت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اسٹیلی نے جلدی سے وہ دراز کھولی جدھر نیم نے اشارہ کیا تھا۔

”وہ ٹیبلٹس جو سامنے نظر آرہی ہیں، وہ پکڑ دو۔ میں جلدی سونا چاہتا ہوں۔“ جملے کا پہلا حصہ اسٹیلی کو اور دوسرا اس نے خود کو آستین سے کہا جو اسٹیلی نے سن لیا۔

”یقیناً یہ خواب آور گولیاں ہیں۔“ اس نے فوراً درست اندازہ لگایا لیکن بولی کچھ نہیں۔

”جب برتن لینے آؤ تو پیڑ کوئی شور، کچن مت کرنا۔ میری خند خراب ہو جائے گی۔“ پلیٹ اٹھاتے ہوئے نیم نے ٹھکی ٹھکی آواز میں کہا۔ اسٹیلی نے غور سے اس کے چہرے، ست روی سے کہاں کہاں اور خواب آور گولیوں کی جانب دیکھا۔

☆☆☆
”گڈ ایننگ میم!“ اسٹیلی نے ٹھکی آواز میں کہا تو عمارت کی خاموشی میں اسے اپنی آواز بڑی عجیب اور ماحول کے متضاد لگی۔ جو اب اس روز اکسروں نے شخص سر ملانے پر اکٹھا کیا۔ وہ باہر سے داک کر کے آئی تھی۔ یہ کام وہ کبھی کبھار ہی کرتی تھی۔

”میرے لیے کافی لے آؤ۔“ کہہ کر روزا اکسروں سیزھیاں چڑھنے لگی۔ ہاں کو کافی بنانے کا کہہ کر اسٹیلی پھر وہیں یعنی وسیع و عریض لاؤنج میں آگئی اور اس کے فرنیچر کی ڈسٹنگ کرنے لگی۔ ڈسٹنگ اور روزا کو کافی سرد کرنے کے بعد اسٹیلی سیزھیوں پر بیٹھ کر لاؤنج کا جائزہ لینے لگی۔ بڑی سی ڈاننگ ٹیبل وہاں پر رکھی گئی تھی۔ ایک طرف صوفے اور ٹیبل سیٹ کے گئے تھے اور دیوار پر بہت بڑی اسکرین نصب تھی۔ جو کزن فلمی کا یہ ڈاننگ روم، لیوگ روم اور ٹی وی لاؤنج تھا۔ یہاں پر فرنیچر کا ڈیزائن، سیننگ اور دیواروں پر لگی پینٹنگ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”سارا فرنیچر بیکار پڑا ہے اور اسکرین پر فٹ بال میچ، موزیز، کارٹونز کے بجائے تاریخی چمائی ہوئی ہے۔“ اسٹیلی نے تاسف سے سوچا۔

☆☆☆
”آپ سے ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟“ اسٹیلی نے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔ جواب میں جو روٹ نے رک کر

اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جو روٹ داک کے لیے نکل رہا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا اور اس میں کبھی بھی تاخیر نہیں ہوتا تھا۔ بیرونی گیٹ کے پاس پڑے ایک کلمے میں سے پھول توڑتے ہوئے اسٹیلی نے آج جو روٹ سے بات کرنے کا سوچا تھا۔

”آپ روزانہ کتنے گھنٹے داک کرتے ہیں؟“ اس نے سوال کیا۔

”یہ بات پوچھنے کا مقصد؟“ اپنے مخصوص سخت اور کھردرے لہجے میں جو روٹ نے کہا۔

”بس یونی پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ اپنی صحت پر کتنا وقت خرچ کرتے ہیں۔“ اسٹیلی نے اس کا لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

جو روٹ اسے چند سیکنڈ دیکھتا رہا پھر گویا بادل ناخواست بولا۔ ”داک کرنا میرا برسوں سے معمول ہے۔ پہلے ہائپر ٹوٹ کر تھا لیکن اب ٹائم تو نہیں دیکھتا، بس کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیڈل چل سکوں۔“

”یعنی صحت اور وقت گزاری دونوں؟“ اسٹیلی نے گفتگو کو طویل دینا چاہا۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں چلتا ہوں..... اور ہاں، یہ پھول توڑنا اچھی بات نہیں ہے۔“ جو روٹ نے اس کی امیدوں پر پانی پیسرتے ہوئے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔
”نہیں اگر کسی اپنے کو دینا ہوں تو پھول توڑنا پڑتے ہیں۔“ اسٹیلی مسکرائی لیکن جو روٹ اس کی مسکراہٹ دیکھے بغیر تیز قدموں سے بیرونی گیٹ پار کر گیا۔

☆☆☆
”ادویات کے مسلسل استعمال کے باوجود میرا ڈپریشن کم نہیں ہو رہا۔“ کافی کا کپ لیے کمرے میں داخل ہوئی اسٹیلی کے کانوں میں کس روزا اکسروں کا جملہ پڑا جو وہ سیل فون پر یقیناً اپنے ڈاکٹر سے کہہ رہی تھی۔ اسٹیلی کو دیکھتے ہی اس نے گفتگو سمیٹنے سے سیل فون آف کر دیا۔

”یہ لیں میم آپ کی کافی اور یہ.....“ کہہ کر اسٹیلی نے پھول اس کی جانب بڑھایا۔

”یہ کس لیے؟“ روزانہ پوچھا۔ اس نے پھول کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

”وہ..... مجھے اچھا لگا تو میں نے توڑ لیا پھر خیال آیا کہ کسی کو دے دینا چاہیے۔ آپ کے کمرے میں آ رہی تھی تو آپ کے لیے لے آئی۔“ اسٹیلی نے کہا۔

”ٹھیک ہے، ٹیبل پر رکھ دو۔“ روزانہ سپاٹ لہجے میں

کہا اور کافی کے سب لیے ہوئے کڑکی سے باہر چھٹ گئی۔
”اوہ..... سوویت.....“ تھینک یو کی توقع تو خیر اسے تھی نہیں لیکن اتنا روکھا پچا کا روٹھل دیکھ کر اس کا دل جھج گیا۔
”اگر مسکرا کر پھول پکڑتی، اس کے رنگ اور میرے جذبات پر غور کرتی تو آج یقیناً اس کا ڈپریشن ذرا کم ہو جاتا۔“ سیزھیاں اترتے ہوئے اسٹیلی نے سوچا۔

☆☆☆
”چچ کی ٹرے لیے اسٹیلی میری میگ کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ میری کے سامنے پڑی ٹیبل پر فائزر پڑی تھیں اور کافی کاغذات ٹیبل پر اور فائزین پر گرے ہوئے تھے۔ کرا! کبکرا! کبکرا! سا لگ رہا تھا۔ الماری کے دونوں پٹ بھی کھلے تھے۔ اسٹیلی کو دیکھتے ہی اس نے تیزی سے کاغذات سمیٹا شروع کیے۔

”میم! آپ کچ لکھیں۔ یہ چیزیں میں الماری میں رکھ دیتی ہوں۔“ اسٹیلی نے ٹرے پر رکھتے ہوئے کہا۔
”دھیان سے رکھ دو۔ کوئی کاغذ ادھر ادھر نہ رہی تھی۔“ میری نے پریشان لہجے میں کہا۔

”کس رنگ کی فائل نہیں مل رہی؟ میں دیکھتی ہوں، شاید مجھے مل جائے۔“ اسٹیلی نے ٹرے سے خدشات پیش کیں۔
”پنک رنگ کی ہے۔“ لیکن اس کمرے میں تو اور فائزر بھی ہیں۔ تمہیں کیا پتا چلے گا۔“ میری نے کہا۔ وہ مزید پریشان ہو چکی تھی۔ اسٹیلی تیزی سے فائزین پر تھکی، کاغذات اور فائزر سمیٹتے ہوئے الماری کی جانب بڑھی۔ چند منٹ بعد پٹی تو اس کے ہاتھ میں چند پنک فائزر تھیں۔

”یہ پنک کھروالی ساری فائزر ہیں۔ اب ان سے مطلوبہ فائل ڈھونڈنا آسان ہوگا۔“ اسٹیلی نے کہا تو میری نے بڑی بے تابی سے انہیں پکڑا اور جلد ہی اسے وہ فائل مل گئی جس میں اس کے آفس کے ضروری کاغذات تھے اور جو کافی دیر سے مل نہیں رہے تھے۔

”تھینک یو اسٹیلی! تم نے میری بہت بڑی سیپ کی ہے۔ میں بہت نشین میں تھی۔“ کم گو میری میگ نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے مسئلے کے حل میں کام آئی۔ اب آپ سکون سے کھا سکتی ہیں۔“ اسٹیلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا کچھ دیر بعد کافی لے آؤں؟ دراصل میں تینوں کے لیے ایک ہی بار میں کافی بنانا چاہتی ہوں۔“ اسٹیلی نے

جان بوجھ کر ایسا جملہ بولا جس پر میری میگ کوئی سوال کرے۔ نتیجہ حسب توقع رہا۔
 ”تینوں۔“ میری نے بچ روکتے ہوئے کہا۔
 ”سرایڈین، مس روز اور آپ۔ آپ تینوں کو کافی پسند ہے اور آپ تینوں ایک ہی طرح کی کافی پیتے ہیں۔ مجھے بنانے میں آسانی رہتی ہے۔“ اسے بڑی خوشی ہو رہی تھی۔ آج عرصے بعد ”جور کزنز دلا“ میں دو افراد (اسٹیلی اور باربرا کے علاوہ) لمبی گفتگو کر رہے تھے۔
 ”ٹھیک ہے، لے آنا۔۔۔۔۔ اور ایک بار پھر تمہارا شکریہ ادا کرنے پر۔“ میری ہلکا سا مسکرائی۔
 اسٹیلی نے اسے غور سے چند لمحے دیکھا اور سر کو ہلکا سا خم دے کر کمرے سے باہر نکل کر بیچن کی جانب چل دی۔
 ☆☆☆

”مس روز! کمرن کو دو روز سے بخار ہے۔“ اسٹیلی نے سرایڈین کو اطلاع دی۔
 ”اوہ، ویری سیڈ۔ میڈلین لی انہوں نے؟“ سرایڈین نے رکی انداز میں سپاٹ چہرے کے ساتھ کہا۔
 ”جی لی ہے میڈلین۔ اب میں ان کے لیے سوپ بنانے جا رہی ہوں۔“ اسٹیلی نے کہا۔
 ”اوکے“ کہہ کر سرایڈین الماری کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔ وہ کتا نہیں رکھ رہے تھے۔
 ”سر! ایک بات کہوں اگر ماسٹرنہ کریں تو۔“ اسٹیلی نے کتا میں اٹھا کر الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔
 ”کیا؟“ اسٹیلی نے پوچھا۔
 ”آپ کو مس روز کی خیریت دریافت کرنے جانا چاہیے۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہیں۔ یہ تو اخلاقی فرض بنتا ہے۔“ اسٹیلی بڑی امید سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”میں کسی سے زیادہ ملنا جانا پسند نہیں کرتا۔ بس ایسے ہی رہنے کی عادت ہے مجھے۔“ ایڈلین نے کرسی پر بیٹھ کر کتاب گھولی اور چشمہ لگایا۔ وہ گفتگو سمیٹ کر مطالعہ کرنا چاہ رہے تھے۔
 ”آپ کہیں تو آپ کی طرف سے میں مس روز کو پھول دے دوں؟ وہ یقیناً خوش ہوگی گی۔“ اسٹیلی نے تجویز سے کہا۔
 ”ہاں، ہاں۔ دے دو۔“ ایڈلین نے بے خیالی میں کہہ دیا۔ اسٹیلی تقریباً بھاگتی ہوئی لان میں گئی، پھول توڑے، ان کا گلہزہ سناٹا یا اور اڑتی ہوئی میز چھایا چڑھی۔

”لے آئی ہو سوپ؟“ دروازہ کھلنے کی آواز سننے ہی روزانے پوچھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے کمرے میں اسٹیلی ہی آسکتی ہے یا کبھی کبھار باربرا۔ اسٹیلی نے اس کی بند آنکھوں اور پڑھ رہے چہرے کو دیکھا۔ اسے یکدم اس تنہا عورت پر ترس آیا۔ وہ بیڈ کے قریب گئی اور بولی۔
 ”سوپ بس چند منٹ بعد آجائے گا۔ پہلے آپ یہ پھول لیں۔ آپ کے لیے کسی نے بھجوائے ہیں۔“ اس نے اپنے لہجے میں ٹھنک اور ہونٹوں پر ہر پور مسکراہٹ سجائی ہوئی تھی۔ روزانہ کمرن نے آنکھیں کھولیں۔
 ”پھول۔۔۔۔۔ میرے لیے؟۔۔۔۔۔ کس نے بھجوائے ہیں؟“ روزانہ حیران و پریشان نظر آئی۔
 ”سرایڈین نے۔ آپ کی بیماری کا سن کر کافی پریشان ہو گئے تھے۔ ذرا مصروف تھے اس لیے اپنی طرف سے مجھے آپ کی خیریت دریافت کرنے بھیجا ہے اور پھول بھی دینے کا کہا ہے۔“ اپنی ہی طرف سے ایڈلین پر زور ڈال کر اس سے بے خیالی میں جملہ کھلوا کر اسٹیلی نے خوب بات بنائی۔ پھولوں کو دیکھتے ہوئے روزانہ آہستہ آہستہ ٹھٹھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پھول تمام لیے۔
 ”تم انہیں میری طرف سے شکریہ کہہ دینا۔“ روزانہ کے چہرے پر یکایک بشارت سی آگئی۔ اس کی جانب سے نوٹس لیے جانے، توجہ دینے کا یہ نتیجہ اسٹیلی نے مسکراتے ہوئے غور سے دیکھا۔
 ”ویسے مس روز! اعلیٰ منزل سے چند میز چھایا چڑھ کر اوپر کی منزل پر آتے کون سادہ رہتی ہے۔ کیا خیال ہے، سرایڈین کو خود نہیں آتا چاہے تھا؟“ بیڈ شیٹ درست کرتے ہوئے اسٹیلی نے کہا۔
 ”درست کہہ رہی ہو لیکن یہ بھی کافی ہے کہ انہوں نے طبیعت کا پوچھا اور پھول بھجوا دیے۔“ روزانہ آہستہ آہستہ بالوں کو برش کرتے ہوئے بولی۔
 ”اچھا تو پھر میں آپ کے لیے سوپ لارہی ہوں۔ سوپ تو ذرا جلدی آجاتا، یہ سرایڈین کے آپ کے لیے فکر مند ہونے اور پھول دینے ڈلانے میں وقت لگ گیا۔“ کہتے ہوئے اسٹیلی میز چھایا اترنے لگی۔
 ”ہوسکا ہے میں دونوں میں دوستی کروانے اور اس جگہ کچھ روٹی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔“ خود کو امید دلانی وہ مسکرا رہی تھی۔
 ☆☆☆

”آج سرایڈین نے مس روز کو پھول بھجوائے۔“

اسٹیلی نے بریکنگ نیوز دی اور سوپ بتاتی اس کی ماں نے شدید حیرت سے اس کی جانب دیکھا پھر جب پوری کہانی سنی تو باربرا بے اختیار ہنس دی۔
 ”اچھا تو اب تم ان دونوں کو فریڈز بنوانے والی ہو؟“ اس نے برتن میں سوپ اٹھاتے ہوئے کہا۔
 ”دونوں نہیں، میں ان پانچوں کو آپس میں فریڈز دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں ”جور کزنز دلا“ میں پھر سے انسانوں کی آواز گونجے اور پرائیویسی کے نام پر تنہائی اختیار کر کے بوریت بھری، ڈپریشن والی لائف گزارنے، خواب آور ادویات کھانے والے نازل زندگی گزارنے لگیں۔“ اسٹیلی نے تنبیہ کی کہ تو باربرا نے غور سے اپنی گڑبادی بنی کو دیکھا جو خود نفسیاتی طور پر ایسی ہو گئی تھی کہ تعلیم چھوڑ دی لیکن اس کا حساس دل ماضی میں پُر رونق رہنے والی جگہ کو پھر سے پُر رونق بنانے کے لیے اس سے کوششیں کروا رہا تھا۔ قدرے اپنا رمل کم عمر لڑکی، پیچور ایچ والوں کو نارمل بنانے پر تکی ہوئی تھی۔

☆☆☆
 میری میگ آفس کے لیے اور سرایڈین اپنے کسی کام کے لیے پیررونی گیٹ کی جانب جا رہے تھے کہ اسٹیلی نے دونوں کو دیکھ لیا۔ وہ تیزی سے ان کی جانب لپکی۔
 ”مس میری! آپ کے کاغذات، فائلز کا کام ٹھیک چل رہا ہے؟“ کچھ ادھر ادھر تو نہیں ہوا؟“ اسٹیلی نے پوچھا۔
 اس کے لہجے میں شوشی سی تھی۔
 ”ارے نہیں۔ کچھ ادھر ادھر نہیں ہوا۔ سب ٹھیک ہے۔“ میری نے رکتے ہوئے کہا۔
 ”اور سرایڈین! اس روز پھولوں کے لیے آپ کا شکریہ کہہ رہی تھیں اور۔۔۔۔۔“
 ”اور؟“ ایڈلین رک گیا۔ کچھ کچھ میری کی تجسس میں آکر دونوں کو دیکھنے لگی۔
 ”اور یہ کہ سرایڈین! میں یہ کہہ رہی ہوں کہ آپ کے اور میڈم روز کے کمرے اتنے دور تو نہیں کہ حال پوچھنے خود نہ جایا جاسکے۔“
 ”یہ تم سے میڈم روزانے کہا؟“ سرایڈین کے لبوں پر متانت بھری مسکراہٹ تھی۔ اسٹیلی نے آنکھیں میچا کر اس تہہ بلی کو ٹوک دیا۔
 ”چھوڑیں، جس نے بھی کہا ہے۔ آپ کی آج شام کی کافی میں لاؤنج میں سرو کروں گی۔ بس ایک کام کریں۔ زحمت کر کے کمرے کے بجائے وہاں بیٹھ کر کافی پی لیں۔

مس روز ابھی اس وقت کافی لیتی ہیں۔ آپ بڑا استخوان کا حال چال دریافت کر لیں گے اور کافی پینے کا بھی کام ہو جائے گا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ایک ہی جگہ رہنے، ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والوں۔۔۔۔۔“ اسٹیلی مسلسل بول رہی تھی۔
 ”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے، لی لوں گا لاؤنج میں کافی۔“ سرایڈین نے بے مشکل جان چھڑائی اور تیز قدم اٹھانے لگے جبکہ میری میگ نے اسٹیلی کو پاس بلایا اور پھول، طبیعت، حال دریافت کرنے کا پورا قصہ سنانے کو کہا۔ اسٹیلی نے اپنی ہی طرف سے کھلوئے گئے ایک دو جملوں اور پھولوں کا قصہ بڑے دلچسپ پیرائے میں سنایا اور پھر اس کے جانے کے بعد جم کے سر پر سوار ہو کر اسے پودوں کی کانٹ چھانٹ سمجھانے لگی۔ بڑے بڑے منہ بناتا جم مجبور اس کی باتیں سن رہا تھا۔
 ☆☆☆
 ”خوب کہا مسٹرایڈین! واقعی بعض اسٹوڈنٹس بڑے ڈھیٹ اور دلچسپ ہوتے ہیں۔“ روزانہ نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر بولی۔
 ”میری کلاس کا ایڈی بھی ایسا ہی احمق تھا۔ میں اکثر اسے سزا دیتی لیکن نہ جانے کیسے وہ مجھ سے سزا معاف کر دیتا۔“
 ”مس روز! ٹینک کے بیڑے میں ایسے طلبہ کا ہونا ایک معمول ہے۔“ سرایڈین نے کافی ختم کر کے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔
 ”بالکل۔۔۔۔۔ بالکل۔۔۔۔۔ اور مجھے تو لگتا ہے اگر تمام طلبہ ذہین، فرمانبردار اور ریکورل بن جائیں تو ہم پچھڑ کی زندگی یکسانیت کا شکار ہو جائے گی۔ ہے نا؟“ اپنے بال سہلاتے ہوئے اور خوب ہنستے ہوئے روزانہ تصدیق چاہی۔
 ”میرا خیال ہے مجھے آپ کی اس بات سے سو فیصد متفق ہو جانا چاہیے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے کی بات ہے، ایسا ہی ایک اسٹوڈنٹ ایک دن میرے پاس آیا۔۔۔۔۔!“ سرایڈین بڑے ہلکے ہلکے پچھلے انداز میں بولنے لگے۔ روزانہ کمرن میز پر کنبیاں لٹکائے ایک ہاتھ پر چہرہ رکھ کر انہماک سے سن رہی تھی اور۔۔۔۔۔ بظاہر ڈسٹنگ کرنی اسٹیلی دونوں کی گفتگو اور بہت جلد پیدا ہونے والی بے تکلفی دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔
 ”گڈ اینک!“ میری میگ کی آواز سن کر سرایڈین اور روزانہ دونوں نے لاؤنج کے دروازے کی جانب دیکھا۔

”گڈ ایونگ مس میری!“ دونوں بیک وقت بولے۔ تینوں میں رکی جھلس کا تھلہ ہوا۔
”میرے لیے بھی کافی نہیں لے آؤ۔ میں فریش ہو کر آتی ہوں۔“ اپنے کمرے کی جانب جاتے ہوئے میری نے اسٹینی سے کہا۔ اسٹینی کو حیران کن خوشی تو ہوئی، ساتھ ہی اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ہر روز یہ جملہ بڑے ہنسے، میز اور انداز میں بولا جاتا تھا جبکہ آج لفظوں میں تازگی سی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈائننگ ٹیبل کے گرد ایک اور چیز آباد ہو چکی تھی۔

”کتنا اچھا اتفاق ہے کہ ہم تینوں کو کافی پینا پسند ہے۔“ میری نے نیک اٹھاتے ہوئے کہا۔
”اور اس وقت تو میں لازمی ایک کپ لیتی ہوں۔“ روزا نے کہا۔ ہمارے اثرات دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے۔
”میں بھی۔“ میری اور ایڈیسن بول اٹھے اور یوں بولنے پر ساتھ ہی ہنس دیے۔
”اگر آپ حکم کریں تو میں روزانہ اسی وقت آپ تینوں کی کافی ہمیں سرد کر دیا کروں؟“ صوفے کو گزرتے ہوئے اسٹینی نے پیشکش کی جو تینوں نے فوراً یوں قبول کی جیسے اسی انتظار میں تھے کہ کوئی کہے اور وہ ”یس“ کہیں۔

☆☆☆

”مس میری میگ بہت کم گوے۔ میرا جب کبھی اس کے کمرے میں جانا ہوا یا کوئی بات کرنے کا موقع ملا، وہ بہت مختصر الفاظ میں گفتگو کرتی ہے۔ آج مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی جب وہ شام کے وقت روزا اور ایڈیسن کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور مسکرا بھی رہی تھی حالانکہ اس سے پہلے میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی۔“ رات کے کھانے کی تیاری کرتی ہوئی باربرانے بیٹھا سے کہا۔

”جس روز میں نے مس میری کی فائل ڈھونڈنے میں مدد کی تھی، اس روز اس نے میرے ساتھ چند جملے بھی بولے اور مسکرائی بھی تھی جس سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کم گو نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی لائف تنہا گزر رہی ہے۔ اس کے ساتھ بولنے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر ہو تو شاید وہ بہت بولے۔“ انجیرن باندھتے ہوئے اسٹینی نے ایک بڑی حقیقت بتائی۔ وہ ماں کی مدد کر رہی تھی۔

”تمہیں لگتا ہے کہ تم پانچ اپنی لوگوں کو ایک جگہ بیٹھے یاد دہانی کرنے پر آمادہ کر سکتی ہو؟“ ہنر بالے ہوئے باربرا

نے پوچھا۔

”تین اپنی تو آپس میں کسی حد تک بات کرنے لگ گئے ہیں۔ یقیناً یہ سلسلہ بڑھے گا۔ ہاں، جو روٹ سر کی سخت طبیعت اور نیم کا اندازہ دیکھ کر یہ دونوں ذرا مشکل ٹانگ لگتے ہیں۔“ اسٹینی نے سلاہ کے پتے پیٹھوں میں رکھتے ہوئے کہا۔

”تو پھر..... ان کے بارے میں کیا سوچا۔ کیا کسی ایک کے بیمار ہونے اور پھر پھول بیجے کا انتظار کرو گی؟“ باربرا اپنی فریج کا ڈور کھولتے ہوئے اس نے اپنی بیٹی کی طرف پیار سے دیکھا جو ایک مشکل لیکن خوبصورت سے ٹانگ کو پورا کرنے چلی تھی۔

”کوئی نہ کوئی کوشش تو کرنا پڑے گی“ جو کزنز ولا“ کی روٹی بجال کرنے کے لیے دیکھتے ہیں کیا کچھ کیا جاسکتا ہے۔“ اسٹینی، جو روٹ کا کھانا سلپتے سے ٹرے میں رکھتے ہوئے بولی۔ ”جو کزنز ولا“ والے اس کے رشتے دار نہیں تھے۔ وہ ماں بیٹی تو یہاں محض ملازم تھے لیکن نہ جانے کیسے اس بیٹی کے جانے کے بعد اور پانچ نئے لوگوں کے آنے کے بعد اس مصوم سی نفسیاتی ڈسٹر ب لڑکی کو اس جگہ سے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ وہ پہلے جیسا ماحول بنانے کا سوچنے لگی بلکہ اس مشن پر لگ گئی۔ اسے دیکھ کر باربرا سوچتی تھی کہ شاید اسٹینی کو کتنی سالوں کی ایک طرح کے لوگوں، ماحول کی عادت ہو چکی تھی اور وہ اس سے دور ہونے کے بعد سب پہلے جیسا ہی چاہتی تھی۔

☆☆☆

”موسم کافی اچھا ہے ماسٹر جو روٹ؟“ اسٹینی نے چہرے پر خوب دوستانہ مسکراہٹ سجا کر کہا۔
”ہاں..... شاید..... میں نے غور نہیں کیا۔“ جو روٹ کا لہجہ سیانہ تو تھا، اس میں سختی بھی تھی۔

”تو کرنا چاہیے یا یہ ضروری ہے۔“ اسٹینی نے گویا سمجھایا۔
”کیوں..... کیوں ضروری ہے؟“ جو روٹ نے تجویزی چڑھا تے ہوئے پوچھا۔ اسے اسٹینی کا اتنا بولنا پسند نہیں آ رہا تھا۔ یہ ایک دو جملے بھی اس کے بہت تھے۔ اسے تو مختصر الفاظ اور وقت ضائع نہ کرنا پسند تھا۔

”لہٰذا، طبیعت، اعصاب پر اچھا اثر پڑتا ہے۔“ اسٹینی نے کھڑکی کھول کر تازہ ہوا کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”میری طبیعت بہت فٹ ہے اور اعصاب خوب مضبوط ہیں۔ اب مجھے کھانا کھانے دو۔ میں نے پھر چھل تدی کے لیے جانا ہے۔“ بڑے سخت لہجے میں اسٹینی کو

کمرے سے باہر جانے کا کہا گیا۔

☆☆☆

”جو روٹ سر اپنی فٹنس پر بہت دھیان دیتے ہیں۔ میں نے نوٹ کیا ہے باقاعدگی سے اور کئی گھنٹے واک کرتے ہیں۔“ اسٹینی نے کافی کے برتن ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔
اپ روزا کی کمر، میری میگ اور سرائیسن اکٹھے ہی کافی پیتے اور پھر گپ شپ کا سیشن شروع ہو جاتا تھا۔ اسٹینی بہانے بہانے سے ان کے آس پاس مٹھلاتے ہوئے ان کی باتوں سے مخلوط ہوتی۔ اکٹھے کافی پیتے ہوئے ان تینوں کو اپنے سے اوپر ہو گیا تھا اور اب اسٹینی آگے کا سوچ رہی تھی۔
”ٹھیک کہتی ہو اسٹینی ایہ بات میں نے بھی نوٹ کی ہے۔“ میری نے تائیدی کی۔ وہ تینوں لاشوری طور پر اسٹینی سے یوں بات کرنے لگے تھے جیسے وہ ان کی ملازمنہ ہو بلکہ ان کی کوئی ساتھی ہی ہو۔ دراصل اسٹینی نے زبردستی کوششیں کر کے ان سے خوب گفتگو کی تھی اور اب ان کے کافی قریب ہو چکی تھی۔

”اچھی بات ہے نا۔ میں تو کہتی ہوں سب کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔“ اسٹینی نے کہا۔
”واک“ ہم بھی کرتے ہیں لیکن باقاعدگی سے نہیں۔ سست پڑ جاتے ہیں۔ واقعی ہمیں اپنی صحت کے لیے جو روٹ جیسا نہ کبھی لیکن کچھ نہ کچھ واک ضرور کرنا چاہیے۔ سرائیسن بولے۔

”میں تو کہتی ہوں آپ جو روٹ سر سے فٹنس ٹیس لیں۔ مجھے یقین ہے وہ خوشی سے آپ لوگوں کی ہیلپ کریں گے۔“ اسٹینی نے مشورہ دیا۔
”بھئی پتا نہیں جو روٹ مانے گا بھی یا نہیں۔ میں نے تو آج تک اسے کسی سے بات کرتے نہیں دیکھا، ہیلپ کیسے کرنے گا؟“ روزا کی کمر، انہی۔ باقی دونوں نے بھی اس کی تائیدی کی۔
”ویسے ایک بار بات کرنے میں کیا حرج ہے؟“ اسٹینی نے اصرار کیا۔

”چھوڑ دیجی۔ اب یہ اتنا سیریس ایڈیو بھی نہیں ہے۔ یعنی کم از کم میرے خیال میں۔ سرائیسن! آپ اپنی ملازمت کے ابتدائی دنوں کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے؟“ میری نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے موضوع بدل دیا۔ اسٹینی کے لیے بولے گئے یہ چند جملے بہت تھے۔

☆☆☆

”آپ واک کے لیے جا رہے ہیں؟“ کمرے سے

موتی مالا

☆ اگر خیالات میں گہرائی ہو تو کردار میں ساوگی آ جاتی ہے۔
☆ دو دل کی کرسی آج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔
☆ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ ہم کیا بن سکتے ہیں۔

کچھ باتیں

☆ آنکھ کے پانی اور ندی کے پانی میں جذبات کا فرق ہے۔
☆ زمین خواب دیکھنے سے بہتر ہے کہ انسان ڈٹ کر زندگی کی بلیک اینڈ وائٹ حقیقتوں کا سامنا کرے۔
☆ زمین پر تکبر سے پاؤں مارنے والا یہ نہیں جانتا کہ اس کے قدموں کے نیچے اس جیسے انسانوں کی مٹی ہے۔
(مستشرق حسین تارڑ)

نور اللہ کو اچھی لکھنا پڑی

☆ ہماری قسمت کا فیصلہ ہماری زبان کی نوک پر ہوتا ہے۔
☆ محض بڑا ہونے سے کیا ہوتا ہے جب تک فیض نہ ہو۔ سمجھو کہ درخت کو دیکھو کہ مسافر کو سایہ بھی نہیں اور پھل بھی بہت دور۔
☆ اپنی زندگی کے واقعات میں ایسے پھول بکیر و کر لوگ انہیں چنے کی کوشش کریں۔
☆ محبت ہمیشہ اپنی گہرائیوں سے بے خبر رہتی ہے جب تک جدائی کے لمحے اسے بیدار نہ کریں۔
مرسلہ: وزیر محمد خان، محل ہزارہ

جنگ بندی

☆ تیر غم کی سے۔ ”اچھا تو تمہاری بیوی اب تم بالکل جھگڑا نہیں کرتی؟“
ندیم۔ ”بالکل، اب وہ مجھ سے جھگڑا نہیں کرتی۔“
☆ ”حیرت ہے لیکن یہ مجھ کو کیسے رونما ہوا؟“
ندیم سرد آہ بھر کے بولا۔ ”یار! اس کا انتقال ہو گیا ہے۔“
مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

باہر نکلتے ہوئے جو روٹ سے اسٹاپی نے کہا تو وہ ڈرار کا لیکن بولا کچھ نہیں اور ہلکا سا سر ہلا کر قدم آگے بڑھائے۔

”آپ کی فٹس کے تو چرچے ہونے لگے ہیں۔ کبھی آپ کے پاس ٹائم ہو تو میں آپ کو پوری تفصیل بتاؤں گی۔“ اسٹاپی نے چکن کی جانب جانے والی گیلری میں مڑتے ہوئے کہا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”سنو لڑکی!“ جو روٹ کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

”اسٹاپی..... اسٹاپی ہے میرا نام۔“ اس نے فوراً مڑتے ہوئے سچ کی۔

”ہاں..... ہاں ٹھیک ہے۔ میں یہ پوچھ رہا تھا کہ تم میرے کس چرچے کی بات کر رہی تھیں؟ کون کر رہا تھا میری فٹس کی بات؟“ جو روٹ بڑا تجسس نظر آیا۔

”میرا اس عمارت سے باہر آنا جانا تو اتنا ہے نہیں۔ اسی جگہ کے رہنے والوں سے آپ کا ذکر سنا ہے۔“ اسٹاپی اتنا کہہ کر رک گئی۔

”وہی پوچھ رہا ہوں کہ کیا بات ہوئی تھی؟“ جو روٹ کا سخت لہجہ کچھ بدل گیا۔

”مس روزا کیمرن، مس میری میگ اور سرائیڈ لین تینوں جب کل یہاں بیٹھے کافی لمبی رہے تھے تب میں نے سنا۔ ان کی گفتگو کا موضوع آپ، آپ کی واک کا دورانیہ اور حیران کن فٹس تھی۔“ بات خود کہہ کر اسے اپنے مطلب کی بنانے کی اپنی سابقہ روایت کے مطابق اسٹاپی بولی۔

”اچھا..... میں نہیں جانتا تھا کہ کوئی مجھ پر غور کرتا ہے۔“ جو روٹ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ پھولدار، جھار دار فراک اپنے اسٹاپی نے بڑے غور سے اس کی جانب دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہو۔ ”تم بھی میرے جال میں پھنس رہے ہو۔“

”کرتے ہیں سب غور اور ہاں یاد آیا..... وہ تو غالباً آپ سے ایکسر سائز وغیرہ کے بارے میں ٹیس لینے کی بات کر رہے تھے۔ اودہ معذرت سرائیڈ مجھے چکن میں کام ہے۔“ بڑے انداز سے اپنی بات کہہ کر اسٹاپی چکن کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

”سیاسی حالات نہ جانے کس کروٹ بیٹھیں گے۔“ سرائیڈ لین نے بات کرنے کے لیے موضوع چیمپرا پھر حسب معمول میری بروز اور وہ بھی گپ شپ کرنے لگے۔

”آپ کہیں تو لی وی آن کروں؟ لہجہ یہ کچھ تازہ خبر سننے، دیکھنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔“ کہتے ہوئے اسٹاپی نے ان کی جانب اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔

”ہاں، آن کر دو۔ ویسے میں موویز دیکھنا زیادہ پسند کرتی ہوں۔“ میری میگ نے کہا۔ اسکرین پر مناظر چل رہے تھے۔ تینوں گاہے بگاہے نظر ڈالتے ہوئے آپس میں بات کر رہے تھے۔ اسٹاپی کے لیے یہ منظر کافی خوش کن تھا۔ اسی دوران جو روٹ لاؤنج میں داخل ہوا اور نیبل کے گرد بیٹھے عین لوگوں کے پاس آ کر رک گیا۔

”ہیلو..... نیوز سنی جا رہی ہے؟“ نیبل والے تو حیران ہوئے ہی، برتن بیٹھتی باربرانے بھی آنکھیں پھاڑ کر اس کی جانب دیکھا کہ جو روٹ عام انداز میں بول سکتا ہے۔ وہ تو اسے سخت قسم کی ایک چیز وغیرہ سمجھتی تھی جس کی شکل انسانوں سے ملتی تھی۔

”ارے مسٹر جو روٹ! آئیں بیٹھیں..... کیسے ہیں آپ؟“ ایڈیٹن نے خوش خلقی سے کہتے ہوئے کرسی سیدھی کی۔

”میں کیسا ہوں.....؟ بھی بالکل فٹ۔“ جو روٹ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اتر کر بولا۔ اپنی تعریف نے اسے بہت خوش کر رکھا تھا۔

”وہ تو آپ ہیں۔“ روزانے اعتراف کیا۔

”بلاشبہ ایسا ہی ہے۔“ میری نے تائید کی۔ جو روٹ ذرا پچھل کر چپڑ پر بیٹھ گیا۔

”مجھے فریش جوس چاہیے۔“ جو روٹ نے باربرانے سے کہا۔

”میں جوس دے کر بس چھوٹ میں اسٹاپی کو آپ کے کمرے میں بیٹھتی ہوں۔“ کافی کے برتن ٹرے میں رکھ کر جلدی سے نیبل پر ڈسٹر پھیرتے ہوئے باربرانے ادب سے کہا۔

”کمرے میں نہیں، میں یہیں بیٹھا ہوں، یہیں لاؤ۔“ جو روٹ نے کہا تو نیبل پر بیٹھے تین افراد نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ یہ بھول گئے تھے کہ کچھ دن قبل ان کا کل بیٹھنا بھی ایسا ہی حیران کن تھا جیسا آج جو روٹ کا یہاں بیٹھ کر جوس پینے کا کہا تھا۔

”تم نے آج اس پتھر لیے سے چہرے والے جو روٹ سے کوئی ایسی بات کہی تھی کہ اس کا چہرہ قدرے ڈھیلا پڑ گیا ہے؟“ چکن میں بیٹھتی ہی باربرانے بیٹی سے پوچھا۔ اس نے کافی لمبی برتن بھی اس کے پاس رکھ دیے۔ اسٹاپی برتن دھو رہی تھی۔

”کیوں..... کیا کچھ بنا ہوا ہے؟“ اسٹاپی نے بالکل بھی چوہے کا حیران ہوئے بغیر سوال کیا اور پھر باربرانے کا جواب سن کر باہر نکل اور لاؤنج میں جا کر دیکھا۔ جو روٹ

بڑے مدبرانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ جبکہ روزا، میری اور ایڈیٹن سر ہلاتے ہوئے کن رہے تھے۔

”ہونہ..... پرائیویسی..... پرائیویسی..... کیسے چوٹی ہر بندے کو موقع ملا، وہ تیزی سے اپنا خول اتار کر دوسرے کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ پرائیویسی کے نام پر کبے خود کو تھپا اور پیار سا کر رکھا تھا۔ انہیں دیکھتے ہوئے اسٹاپی سوچ رہی تھی۔

”اور یہ خواب آدرا ادویات استعمال کرنے والا ہے چمن کیم.....“ اسٹاپی نے اس ایک اور شخص کے بارے میں سوچا جس کی آنکھوں کی سرخی بتاتی تھی کہ سکون آور میڈیسن بھی اسے سکون نہیں دے رہی۔

☆☆☆

”میں پہلے بھی ناشا لے کر آئی تھی لیکن آپ سو رہے تھے، میں چلی گئی۔ اب پوچھنے آئی ہوں کہ اگر ارادہ ہو تو ناشا لے آؤں؟“ اسٹاپی نے کیم کی آنکھوں کو فورے دیکھتے ہوئے کہا جہاں حسب معمول بے چینی، بے خوابی، سرخی نظر آرہی تھی۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی ناشا کرنے کو دل نہیں کر رہا۔“ کیم جھٹکے جھٹکے انداز میں بولا۔

”کوئی میڈیسن..... کوئی ہیپ چاہیے۔“ اسٹاپی نے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں۔ بس تھوڑا سا ریٹ کر کے ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ کیم بولا۔

”کیا آج ریسٹورنٹ نہیں جائیں گے؟“ اسٹاپی نے سوال کیا۔ اس نے خود کو ملازمہ سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ یوں سوال جواب کر رہی تھی جیسے کبھی بھی ٹاسک کو پورا کرنے والے کو اپنے ارد گرد کے ماحول کے بارے میں باخبر رہنے کے لیے کہنے چاہئیں۔

”ہاں، شاید..... تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ کیم چڑسا گیا۔

”مسٹر کیم! اگر ”جو رکنز دلا“ میں رہنے والے لوگ آپ کے ریسٹورنٹ میں آئیں تو کیا آپ کو اچھا لگے گا؟“ کیم کو جواب دینے کے بجائے اس نے خود ایک سوال کر ڈالا۔

”اس میں برا لگنے والی کوئی بات ہے بھلا..... ظاہر ہے اچھا ہی لگے گا۔“ کیم جھلا یا ہوا تھا کہ یہ ملازمہ اس سے کیا سوال کر رہی ہے اور نہ جانے کیوں کر رہی ہے۔

”اگر یہاں رہنے والے چار افراد یعنی مس میری میگ، مس روزا، کیمرن، مسٹریڈ لین اور مسٹر جو روٹ آپ کے ریسٹورنٹ میں کبھی ٹیج کریں تو انہیں ڈسکاؤنٹ دیں گے؟“ اسٹاپی نے مصیبت بھرے انداز میں سوال کیا۔

”ہاں، کیوں نہیں۔ اکٹھے رہنے کا اتنا تو فائدہ ملنا

ہوگا۔“ اسٹاپی نے کہا تو وہ ڈرار کا لیکن بولا کچھ نہیں اور ہلکا سا سر ہلا کر قدم آگے بڑھائے۔

”آپ کی فٹس کے تو چرچے ہونے لگے ہیں۔ کبھی آپ کے پاس ٹائم ہو تو میں آپ کو پوری تفصیل بتاؤں گی۔“ اسٹاپی نے چکن کی جانب جانے والی گیلری میں مڑتے ہوئے کہا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”سنو لڑکی!“ جو روٹ کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

”اسٹاپی..... اسٹاپی ہے میرا نام۔“ اس نے فوراً مڑتے ہوئے سچ کی۔

”ہاں..... ہاں ٹھیک ہے۔ میں یہ پوچھ رہا تھا کہ تم میرے کس چرچے کی بات کر رہی تھیں؟ کون کر رہا تھا میری فٹس کی بات؟“ جو روٹ بڑا تجسس نظر آیا۔

”میرا اس عمارت سے باہر آنا جانا تو اتنا ہے نہیں۔ اسی جگہ کے رہنے والوں سے آپ کا ذکر سنا ہے۔“ اسٹاپی اتنا کہہ کر رک گئی۔

”وہی پوچھ رہا ہوں کہ کیا بات ہوئی تھی؟“ جو روٹ کا سخت لہجہ کچھ بدل گیا۔

”مس روزا کیمرن، مس میری میگ اور سرائیڈ لین تینوں جب کل یہاں بیٹھے کافی لمبی رہے تھے تب میں نے سنا۔ ان کی گفتگو کا موضوع آپ، آپ کی واک کا دورانیہ اور حیران کن فٹس تھی۔“ بات خود کہہ کر اسے اپنے مطلب کی بنانے کی اپنی سابقہ روایت کے مطابق اسٹاپی بولی۔

”اچھا..... میں نہیں جانتا تھا کہ کوئی مجھ پر غور کرتا ہے۔“ جو روٹ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ پھولدار، جھار دار فراک اپنے اسٹاپی نے بڑے غور سے اس کی جانب دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہو۔ ”تم بھی میرے جال میں پھنس رہے ہو۔“

”کرتے ہیں سب غور اور ہاں یاد آیا..... وہ تو غالباً آپ سے ایکسر سائز وغیرہ کے بارے میں ٹیس لینے کی بات کر رہے تھے۔ اودہ معذرت سرائیڈ مجھے چکن میں کام ہے۔“ بڑے انداز سے اپنی بات کہہ کر اسٹاپی چکن کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

”سیاسی حالات نہ جانے کس کروٹ بیٹھیں گے۔“ سرائیڈ لین نے بات کرنے کے لیے موضوع چیمپرا پھر حسب معمول میری بروز اور وہ بھی گپ شپ کرنے لگے۔

”آپ کہیں تو لی وی آن کروں؟ لہجہ یہ کچھ تازہ خبر سننے، دیکھنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔“ کہتے ہوئے اسٹاپی نے ان کی جانب اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔

”ہاں، آن کر دو۔ ویسے میں موویز دیکھنا زیادہ پسند کرتی ہوں۔“ میری میگ نے کہا۔ اسکرین پر مناظر چل رہے تھے۔ تینوں گاہے بگاہے نظر ڈالتے ہوئے آپس میں بات کر رہے تھے۔ اسٹاپی کے لیے یہ منظر کافی خوش کن تھا۔ اسی دوران جو روٹ لاؤنج میں داخل ہوا اور نیبل کے گرد بیٹھے عین لوگوں کے پاس آ کر رک گیا۔

”ہیلو..... نیوز سنی جا رہی ہے؟“ نیبل والے تو حیران ہوئے ہی، برتن بیٹھتی باربرانے بھی آنکھیں پھاڑ کر اس کی جانب دیکھا کہ جو روٹ عام انداز میں بول سکتا ہے۔ وہ تو اسے سخت قسم کی ایک چیز وغیرہ سمجھتی تھی جس کی شکل انسانوں سے ملتی تھی۔

”ارے مسٹر جو روٹ! آئیں بیٹھیں..... کیسے ہیں آپ؟“ ایڈیٹن نے خوش خلقی سے کہتے ہوئے کرسی سیدھی کی۔

”میں کیسا ہوں.....؟ بھی بالکل فٹ۔“ جو روٹ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اتر کر بولا۔ اپنی تعریف نے اسے بہت خوش کر رکھا تھا۔

”وہ تو آپ ہیں۔“ روزانے اعتراف کیا۔

”بلاشبہ ایسا ہی ہے۔“ میری نے تائید کی۔ جو روٹ ذرا پچھل کر چپڑ پر بیٹھ گیا۔

”مجھے فریش جوس چاہیے۔“ جو روٹ نے باربرانے سے کہا۔

”میں جوس دے کر بس چھوٹ میں اسٹاپی کو آپ کے کمرے میں بیٹھتی ہوں۔“ کافی کے برتن ٹرے میں رکھ کر جلدی سے نیبل پر ڈسٹر پھیرتے ہوئے باربرانے ادب سے کہا۔

”کمرے میں نہیں، میں یہیں بیٹھا ہوں، یہیں لاؤ۔“ جو روٹ نے کہا تو نیبل پر بیٹھے تین افراد نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ یہ بھول گئے تھے کہ کچھ دن قبل ان کا کل بیٹھنا بھی ایسا ہی حیران کن تھا جیسا آج جو روٹ کا یہاں بیٹھ کر جوس پینے کا کہا تھا۔

”تم نے آج اس پتھر لیے سے چہرے والے جو روٹ سے کوئی ایسی بات کہی تھی کہ اس کا چہرہ قدرے ڈھیلا پڑ گیا ہے؟“ چکن میں بیٹھتی ہی باربرانے بیٹی سے پوچھا۔ اس نے کافی لمبی برتن بھی اس کے پاس رکھ دیے۔ اسٹاپی برتن دھو رہی تھی۔

”کیوں..... کیا کچھ بنا ہوا ہے؟“ اسٹاپی نے بالکل بھی چوہے کا حیران ہوئے بغیر سوال کیا اور پھر باربرانے کا جواب سن کر باہر نکل اور لاؤنج میں جا کر دیکھا۔ جو روٹ

کہاتے تو کافی ڈسکاؤنٹ کے ساتھ خوب انجوائے کرتے۔ اسٹیلی نے عین درمیان میں آکر کہا۔
 ”مسٹر کیم.....؟“ یعنی وہ کیم جن سے مدد کی سی علیک سلیک بھی یہ مشکل ہوتی ہے۔ ”روزنامی۔“
 ”ارے نہیں۔ آپ ایسا مت سمجھیں۔ آج صبح جب میں ان کے کمرے میں گئی تو.....!“ اسٹیلی نے صبح والی منگٹوں اپنے دل و ذہن کی خواہشات کے مطابق ڈھال کر کی۔ اسے خوشی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی بلکہ سادہ جلوں پر خوبصورت چمکدار رپر لپسٹ کر ادھر ادھر گٹ کر رہی ہے۔
 ”کیا خیال ہے، کیم کی طبیعت پوچھنے جانا چاہیے؟“ میری میگ نے لکھا ختم کرتے ہوئے کہا۔
 ”یقیناً اسے اچھا لگے گا۔“ ایڈیسن نے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ چاروں کیم کے کمرے میں داخل ہو رہے تھے اور اسٹیلی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے اپنی کارگزاری پر خوش ہو رہی تھی۔
 ”سانے تو کافی دن پہلے ختم کر دیے تھے۔ جو تھوڑی سی کی رہ گئی تھی، لگتا ہے پوری ہونے والی ہے۔“ سنک میں برتن رکھ کر دھوئے شروع کرتے ہوئے اسٹیلی نے سوچا۔

☆☆☆

”زندگی کے زیادہ سال لگی بندھی روٹیں اور تنہا گزارے تو عادت سی پڑ گئی کہ بس ایسے ہی رہتا ہے۔ اب چند دوست بٹے ہیں تو تبدیل ہو جانا اچھا لگا ہے۔“ مس روزا کیمرون نے لان کی سرسبز گھاس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
 ”میرے بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ اکیلے پن کی اتنی عادت پڑ گئی تھی کہ سوچ بھی نہ آتی کہ کبھی کسی اور کا ساتھ مل جائے گا۔“ میری میگ نے آسان پر آنے والے بادلوں کو دیکھا جو تیزی سے چمارہے تھے۔ شام کا وقت تھا اور ”جو رکز ولا“ میں ریٹ پر رہنے والے تنہا لوگ پانچ بن کر اکٹھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔
 ”اس عمر میں کچھ لوگوں کا ساتھ میرا آنے کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ اپنے اسکول کے دنوں کے دلچسپ واقعات شیئر کر کے پرانی یادیں تازہ کرنے کا موقع ملا۔“ سر ایڈیسن کے متانت بھرے چہرے پر ایک سکون سا نظر آرہا تھا۔
 ”بیوی سے علیحدگی کے بعد اور بچوں کے دور ہو جانے کی وجہ سے میری طبیعت میں چڑچاہن اور بے چینی سی آگئی تھی۔ کسی سے بات نہ کرنے کو دل نہیں کرتا

تھا۔“ ریسٹورنٹ بھی بس گزارے کی خاطر چلا رہا تھا۔ اس سے قبل میں ایسا ہرگز نہیں تھا لیکن لائف میں آنے والے خاندانی اور پھر کافی حد تک معاشی کراسز نے مجھے ایسا کر دیا تھا۔ اب سوچا ہے کہ زندگی گزارنا ہی ہے تو کیوں نہ ہنس بول کر، پرانی یادوں کو بھلا کر، نئے ساتھیوں کے ساتھ روباہل بڑھا کر گزارنی جائے۔“ کیم کی آنکھوں کا رنگ سرخ کے بجائے نارمل لگ رہا تھا۔
 ”مجھے خود پر حیرت ہوتی ہے کہ میں جو کمرے سے نکلتا ہوں نہیں کرتا تھا، اب مجھے شام کا انتظار ہوتا ہے کہ جلدی واک پر جا کر واپس آؤں اور شام کی گپ شپ کا حصہ بنوں۔“ جو روٹ کے چہرے پر سے جو مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی، وہ کافی حد تک واپس آگئی تھی۔ ریٹائرڈ لائف کے بارے میں اسے لگتا تھا کہ پورے گزرنے کی لیکن کچھ انجینیئروں نے اس کا خیال بدل دیا تھا۔ وہ سب اکٹھے رہنے پر شوق ہو چکے تھے۔ ”جو رکز ولا“ میں وہ قیام کا عرصہ بڑھا سکتے تھے کیونکہ یہ جگہ اب اسی مقصد کے لیے استعمال ہوتی تھی۔
 ”اسٹیلی کا بخار اترا؟“ باربرا سے کافی پکڑتے ہوئے میری نے پوچھا۔
 ”پہلے سے کم ہے۔ امید ہے رات تک طبیعت بہتر ہو جائے گی۔“ باربرا نے کہا۔
 ”کافی بھرتی لڑکی ہے۔ بہت کام کرتی ہے۔“ ایڈیسن نے تعریف کی تو باربرا اسکرادی اور پھر رک رک بولی۔
 ”میں آپ لوگوں کی دوستی، گپ شپ اور اس جگہ کی ویرانی دور ہوتا دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ پانچ ایک دوسرے سے بالکل انجان، الگ تھلگ رہنے والے لوگوں کے قریب آنے میں کس کا ہاتھ ہے؟“
 ”مجھے کافی حد تک اسٹیلی کا ہاتھ ہے۔ وہ پانچوں کمروں میں آنے جانے کے دوران ہمارے پیغامات، خیالات ایک دوسرے تک پہنچاتی تھی۔“ روزا نے اپنے ساتھیوں کی جانب تائید طلب نظروں سے دیکھا۔
 ”کافی حد تک نہیں مس روزا.....! مکمل طور پر۔“ باربرا مسکرائی اور پھر کہنے لگی۔
 ”اسٹیلی بہت حساس ہے اور ”جو رکز ولا“ سے بہت انج تھی۔ اس نے.....!“ باربرا نے پھول بیچنے، بیجوانے، خود ہی کچھ بول کر کسی کے منہ سے جملہ نکلا کر اسے اپنے انداز سے اور اپنی خواہش کے مطابق بنانے، جو روٹ کے واک سے متعلق، کیم کے ریسٹورنٹ میں جانے تک ساری

پانچ تفصیل سے بتائیں تو ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔
 ”یعنی اگر یہ لڑکی نہ ہوتی یا اگر یہ سب باتیں نہ بناتی تو ہم ویسے کے ویسے ہی رہ رہے ہوتے۔“ جو روٹ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
 ”واقعی مسز باربرا! آپ کی باتیں سن کر یقین ہو گیا ہے کہ میں ایک دوسرے کے قریب کرنے کا مکمل کریڈٹ اسٹیلی کو جاتا ہے۔“ سر ایڈیسن نے دل سے اعتراف کیا۔
 ”اسٹیلی مجھے ہر بات بتاتی جو اس نے خود سے گھڑ کر کی ہوتی۔ میں ہنسی تھی کہ اس سے کیا ہوگا تو وہ کہتی تھی کہ می! یہ فائدہ دینے والے جھوٹ بہت اچھے نتائج لائیں گے۔“ باربرا بولی۔
 ”مکمل کریڈٹ اسٹیلی کا..... مکمل..... کیونکہ جس طرح باربرا بتا رہی ہے، ہم نے ایسا تو ایک دوسرے کے متعلق بولا ہی نہیں۔“ میری تھی۔
 ”ہاں بالکل، ایسا ہی ہے۔ ہمارے عام سے جملوں کو اس نے ایسا رنگ دیا کہ ہماری پچھلی تنہائی میں رنگ بھر دیے۔“ روزا کے لہجے میں ”شکر“ نظر آرہا تھا۔
 باربرا وہاں سے جانے ہی والی تھی کہ یکدم بارش کے خیز قطرے گرنے لگے۔ وہ سب باربرا کے ساتھ ہی خود کو بارش سے بچانے کے لیے لاؤنج کی جانب بھاگے۔
 ”اس موسم میں پرانے قصبے سننے سنانے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ یہ سب نے سوچا تھا۔“
 ☆☆☆
 رات کے کھانے میں مچھلی، سوپ، بیف کے روٹنڈ گلوں نے خوب برستی بارش کے خوبصورت موسم کا مزہ دو بالا کر دیا۔ اسٹیلی طبیعت بحال ہوتے ہی ماں کی ہیلپ میں لگ گئی تھی۔ باربرا نے اسے شام کو ہونے والی ساری باتیں بتادی تھیں۔ اسٹیلی خوش ہوتے ہوئے سن رہی تھی کہ اس کی اتنی تعریف ہوئی اور اس نے ایک بہت بڑا ٹانگ مکمل کر لیا ہے۔
 ”اسٹیلی! بات سنو۔“ وہ برتن سینے کے لیے آئی تو سر ایڈیسن نے بڑی نرمی اور پیار سے اسے پکارا۔
 ”جی سر! وہ ادب سے کھڑی ہو گئی۔
 ”ہم سب تمہیں ”تھینک یو“ کہنا چاہتے ہیں۔“ ڈانگ ٹیبل سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ کر نیوی کا زیپوٹ تھامتے ہوئے ایڈیسن نے اسے خوشگوار اطلاع دی۔ چند منٹ میں اسٹیلی کے لیے تعریفی جملے، شکریہ کے الفاظ اور بہت سا پیار دیا گیا۔

”ذاتی زندگی، اپنا کرا، اپنی جاب، اپنی فائٹرسب کو دوسروں سے الگ رکھنا، اپنی پرائیویسی کا خیال رکھنا ہر انسان کا حق ہے لیکن اس پرائیویسی کے نام پر اپنے جیسے دوسروں سے کٹ کر رہ جانا، کرے تک محدود ہو جانا اور اکیلے پن کی گھبراہٹ دور کرنے کے لیے سکون آور دوا کا استعمال غلط ہے۔ مجھے آپ لوگوں کو دیکھ دیکھ کر یوریت ہوتی تھی۔ سمجھیں اپنی یوریت دور کرنے کے لیے میں نے یہ سب کیا اور دیکھیں آج آپ ایک دوسرے کے اور میرے اور می کے بھی قریب ہو چکے ہیں۔“ ٹنگ کی شرٹ اور ڈھیلے سے ڈائٹ ٹراڈز میں وہ معصوم سی لڑکی بولتی ہوئی دانشور لگ رہی تھی۔
 ”ہاں، درست کہا۔ خول تو ڈنٹا میرے لیے اچھا رہا ہے۔ میں اب ڈپریشن سے باہر آ چکی ہوں۔“ روزا کیمرون مسکرائی۔
 ”اور میں جب رات کو دیر تک ان لوگوں سے باتیں کر کے چہل قدمی کر کے کمرے میں جاتا ہوں تو خواب آور دوا کے بغیر خوب گہری نیند آ جاتی ہے۔“ کیم کی آنکھوں کی سرخی مکمل غائب ہو چکی تھی۔
 ”تو اب آپ پانچوں دوست بن گئے ہیں نا؟“ اسٹیلی نے مسکراتے ہوئے تصدیق چاہی۔
 ”نو.....!“ سخت مزاج جو روٹ کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ سب کی حیرت کا لطف لینے کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔
 ”ہم پانچ نہیں بلکہ تم بھی ہماری دوست ہو۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ممکن ہوا ہے تو پھر تم سے تو دوستی کرنا پڑے گی۔“ جو روٹ نے ہنس کر کہا تو سب تائیدی انداز میں ہنس دیے۔
 لاؤنج کے باہر تیز برستی بارش کا شور بڑھتا جا رہا تھا لیکن لاؤنج کے اندر کی آوازیں اس شور پر غالب آ رہی تھیں۔ کیم اور میری ٹی وی کے سامنے پڑے صوفے پر بیٹھے تازہ نیوز سن رہے تھے۔ سر ایڈیسن اور روزا کیمرون اپنے شرارتی اسٹوڈنٹس کے قصبے، اپنے پرنسپل کی سخت گیری کے دلچسپ قصبے سنارہے تھے اور جو روٹ بڑے شوق سے سن رہا تھا۔
 اسٹیلی نے پرسکون سانس لینے ہوئے پھر سے آبار ہو جانے والے ”جو رکز ولا“ کی روٹ کو دیکھا اور اپنے کمرے کی جانب چل دی۔

نشیمن

مرزا امجد بیگ

سیانہ کہتے ہیں دنیا ایک دھوکا ہے... یہ بھی شاید ٹھیک ہی ہے کیونکہ یہاں جسے دیکھو یا تو دھوکا دے رہا ہے یا پھر دھوکا کھا رہا ہے... لیکن... یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر دھوکا کھانے والوں کو سکون نہیں ملتا تو... دھوکا دینے والے بھی پُرسکون نہیں رہ پاتے... اس کے ساتھ بھی بے سبب ایسا ہوا... جس کا نتیجہ اتنا بھیانک نکلا اور وہ قاتلہ بن گئی... یہ اور بات کہ اس پر پڑنے والی کیچڑ کو صاف کرنے کے لیے مرزا امجد بیگ کو کتنی مشقت کرنا پڑی... پھر ایسا ہوا کہ اس پر سے قاتلہ ہونے کا داغ مٹ تو گیا مگر معاشرے میں دوبارہ عزت اور مقام پانے کے لیے ابھی اسے بہت محنت کرنا تھی... دوسری جانب ایک معصوم انبسان کی زندگی برباد کرنے والوں کو بھی بالآخر قدرت نے کیفر کردار تک پہنچا دیا۔

بیگ صاحب کی ڈائری سے ایک اور قتل کی لرزہ

خیزداستان

زمینی کوئس ذاتی طور پر جانتا تھا اس لیے اس کا کيس لئے میں مجھے کوئی تردد ہوا اور نہ ہی میں نے کسی قسم کی کوئی ہچکچاہٹ محسوس کی۔ ذیاب الساعف زمینی پر قتل کا الزام تھا اور وہ اس وقت عدالتی ریمانڈ پر تھانے کی حوالات میں بند تھی۔ وہ جاتے ہوئے موسم برسات کی ایک سہانی شام تھی۔ ماہِ ستمبر کا آغاز ہو چکا تھا۔ بعض لوگ اس مہینے کو ماہِ ستمبر بھی کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس مہینے میں انسانوں کو آئے روز کسی نہ کسی مشکل اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتقاد میں کس حد تک صداقت ہے، اس کا پتا چلانے کا آسان طریقہ تو یہی ہے کہ آپ پچھلے دس پندرہ سال کے تمام مہینوں میں پیش آنے والے چھوٹے بڑے حادثات و سانحات اور دیگر مصائب و مشکلات کا حساب لگا کر دیکھ لیں۔ اگر ماہِ ستمبر میں دیگر مہینوں کی بہ نسبت انسانوں نے زیادہ دکھ درد، جھیلے اور نقصانات اٹھائے ہوں تب تو اس ماہ کو ستمبر کہنا ٹھیک ہے، بصورتِ دیگر اس خیال کو "خیال

خام" جان کر آگے بڑھ جانا چاہیے مگر کچھ لوگ اس نوعیت کے معاملات میں بڑے بڑے کچے اور پُر نشین ہوتے ہیں۔ حیدر علی بھی ایک ایسا ہی شخص تھا۔ خیر، میں ماہِ ستمبر کی ایک شام اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ میری سیکریٹری نے مجھے انٹرکام پر بتایا۔ "سر! کوئی حیدر علی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔" "کیا انہوں نے اپنا ٹیٹل لے رکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "نو سر!" سیکریٹری نے کہا۔ "ان کے پاس اپنا ٹیٹل تو نہیں ہے مگر ان کا کہنا ہے کہ صبح آپ جب عدالت جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے تو فون پر آپ کی ان سے بات ہوئی تھی اور آپ نے انہیں شام میں آفس آنے کو کہا تھا۔" مجھے یاد آگیا کہ سیکریٹری کس حیدر علی کا ذکر کر رہی تھی۔ "ٹھیک ہے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا اور پوچھا۔ "ویننگ روم میں کلائش کی کیا پوزیشن ہے؟"

”سب خفت کچے سرا“ میکر بیڑی نے جواب دیا۔
 ”نی الحال تو بھی حیدر علی صاحب ہیں۔“
 ”آپ حیدر صاحب کو میرے چیمبر میں بھیج دیں۔“
 میں نے کہا۔

حیدر علی ایک شریف انٹس انسان تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ حال ہی میں ایک سرکاری ٹکے سے ریٹائر ہوا تھا مگر مذکورہ ٹکے میں وہ بہت ہی چھوٹے عہدے پر فائز رہا تھا۔ فائر کے لٹنی معنی ”کامیاب“ کے ہیں۔ میں نے ایک ریٹائرڈ نائب قاصد (چراسی) حیدر علی کے لیے ”فائر“ کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ وہ انتہائی ذمے دار و فرض شناس اور ذہنی اعتماد انسان تھا۔ مجھے یقین ہے حیدر علی نے دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کمالی بھی اور یہی اس کے ”کامیاب“ ہونے کی دلیل تھی۔

حیدر علی نے میرے چیمبر میں آنے کے بعد مجھے سلام کیا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ گہرا اور اندوہ غم کی آماجگہ بنا نظر آتا تھا اور آنکھوں سے دیرانی ٹپک رہی تھی۔ رکی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا۔

”حیدر صاحب! آپ خالص اچھے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا کوئی پریشانی ہے؟“
 ”جگ صاحب! انسان مشکل اور مصیبت میں ہی ڈاکٹر اور وکیل سے رجوع کرتا ہے۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ کا اندازہ درست ہے کہ میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔“

کچھ عرصہ پہلے حیدر علی کی اوپن ہارٹ سرجری ہوئی تھی۔ میرا خیال اس کی سرجری کی طرف چلا گیا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”آپ کا دل کیسا چل رہا ہے؟“
 ”جگ صاحب! اللہ تعالیٰ نے دل کو رہنے کے لیے سینے میں جکڑ دی تھی۔“ وہ ہنسی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اور حالات کی سفاکی دیکھیں کہ میرے دل کو تھانے کی حوالات میں بند کر دیا گیا ہے۔ یہ سب نہیں، مگر ہے جناب! دو سال پہلے بھی میں اسی سینے میں ایک فریاد لے کر آپ کے پاس آیا تھا اور آپ نے میری قانونی مدد کی تھی۔ اس سبب میں کچھ دیکھی صورت حال ہے۔“

دوسرا سال میں نے حیدر علی کی اکلوتی بیٹی زہبی کو اس کے ذاتی اور شرابی شوہر سے بذریعہ طلاق نجات دلائی تھی۔ اس وقت ماہِ ستمبر چل رہا تھا اور اتفاق سے اب بھی ستمبر کا ہی مہینہ تھا۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

”زہبی تو خیریت سے ہے نا؟“
 ”اگر زہبی غایت سے ہوتی تو میں اپنے دل کے تھانے کی حوالات میں بند ہونے کا ذکر کیوں کرتا؟“ وہ روہا کی آواز میں بولا۔ ”آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا دل، دماغ، ہیکر، روح..... ان فرض سب کچھ زہبی ہی ہے جسے پولیس نے اپنی تحویل میں لے رکھا ہے۔“
 میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا پھر حیدر علی سے سوال کیا۔ ”زہبی کو پولیس نے کس سبب گرفتار کیا ہے۔ میرا مطلب ہے، اس پر کیا الزام عائد کیا گیا ہے؟“
 ”ایک امیر زادے کے قتل کا الزام۔“ حیدر علی نے بتایا۔ ”میں کسی بھی قیمت پر یہ ماننے کو تیار نہیں کہ میری زہبی کسی انسان کی جان بھی لے سکتی ہے۔ یقیناً وہ کسی گہری سازش کا شکار ہو گئی ہے۔“

”مجھے بھی زہبی کے قاتل ہونے کا یقین نہیں آ رہا حیدر صاحب!“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔
 پھر پوچھا۔ ”پولیس نے زہبی کو کس گرفتار کیا ہے؟“
 ”یہ تین روز پہلے کا واقعہ ہے جگ صاحب!“
 ”اس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس نے زہبی کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریاضہ حاصل کر لیا ہوگا اسی لیے اب وہ پی پی (پولیس کسٹڈی) میں ہے۔“

حیدر علی نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
 میں نے پوچھا۔ ”آپ اس واقعے کے بارے میں جو کچھ بھی جانتے ہیں، وہ آپ مجھے بتائیں۔ میں ہر ممکنہ آپ کی، میرا مطلب ہے زہبی کی مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔“
 ”اس انفاد کی تفصیل تو آپ کو زہبی ہی بتا سکتی ہے جگ صاحب!“ وہ ہنسی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ آٹھ ستمبر کی صبح زہبی اپنے آس جانیے کے لیے حسب معمول گھر سے نکلی تھی۔ اس کا آس صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک کا ہے۔ وہ کم دیشن شام سات بجے تک گھر پہنچ جایا کرتی تھی۔ آٹھ ستمبر کی شام میں اس کی راہ دیکھ رہا تھا کہ میرے گھر بیٹوں کی کھینچ آئی۔ میں نے فون انٹینڈ کیا۔“

”بیٹو!“
 دوسری طرف سے ایک کرخت مردانہ آواز میں پوچھا گیا۔ ”کیا آپ زیب النساء کے باپ حیدر علی بات کر رہے ہیں؟“
 ”جی، میں حیدر علی بول رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ کون ہیں اور آپ نے میری بیٹی کا نام کیوں لیا ہے۔ سب خیریت تو ہے نا؟“

نشیدیں

”سچی بات تو یہ ہے جگ صاحب کہ زہبی کا نام سننے ہی میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اس شخص نے خود کو سب انکسٹر خود شید شاہ بتاتے ہوئے مجھ سے کہا۔“
 ”آپ کو فوراً تھانے آنا ہوگا۔“ اس نے متعلقہ تھانے کا نام لینے کے بعد مزید کہا۔ ”ہم نے آپ کی بیٹی زیب النساء کو ایک وفاقی وزیر کے بیٹے کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔ کل صبح آپ کی بیٹی کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریاضہ حاصل کر لیا جائے گا۔ زیب النساء کی درخواست پر آپ کو فون کیا گیا ہے تاکہ آپ یہاں آکر اس سے ملاقات کر لیں۔“

”میرے پاس کوئی آپشن نہیں تھا۔ میں متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔“ حیدر علی نے بتایا۔ ”پولیس کے بیان کے مطابق زہبی اپنے ایک دوست نیل کے ساتھ شہری حدود سے باہر واقع ایک فارم میں گئی تھی۔ نیل ایک فیڈرل منسٹر کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میں نیل کے لیے مامی کا سینڈ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ یہ وہی لڑکا تھا جس کے قتل کا الزام زہبی پر لگا یا گیا ہے۔ پولیس نے مجھے بتایا ہے کہ زہبی، نیل کے ساتھ گئی تو اپنی مرضی سے گئی مگر فارم ہاؤس پر پہنچنے کے بعد ان دونوں کے بیچ ان بن ہو گئی۔ ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ زہبی کی نیت شروع سے ہی خراب تھی۔ بہر حال زہبی نے نیل کو اسی کی گن سے شوٹ کیا اور اس کا بٹوا اور سونے کی گھڑی لے کر فرار ہو رہی تھی کہ فارم ہاؤس کے چوکیدار نے اسے رگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ اس کے بعد چوکیدار نے فارم ہاؤس کے مالک کو فون کر کے صورت حال سے آگاہ کیا۔ فارم ہاؤس کے مالک نوازش علی کا بیٹا فیصل فوراً جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ فیصل ہی نے پولیس کو اس واردات کی اطلاع دی تھی۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ فیصل اور منتول نیل میں گہری دوستی تھی اور ان کے باپ نہایت ہی دولت مند اور اثر رسوخ والے لوگ ہیں۔“ لگائی توقف کر کے حیدر علی نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

”جگ صاحب! کیا آپ بھی میری زہبی کو ایسی گھٹیا اور بدکردار عورت سمجھتے ہیں؟“
 آج صبح جب حیدر علی نے مجھے گھر پر فون کیا تھا تو اس نے زہبی کی چٹا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ چرچ یہی کہ تھا کہ وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ وہ بیٹھے بیٹھائے اتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا۔
 ”ہرگز نہیں۔“ میں نے اس کے سوال کے جواب

میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بھی یہی لگ رہا ہے کہ زہبی کسی سازش کا شکار ہو گئی ہے۔ آپ کی زہبی سے تو بات ہوئی ہوگی، وہ اس بارے میں کیا کہتی ہے؟ اگر اسے کسی فارم ہاؤس کے اندر سے گرفتار کیا گیا ہے تو اس سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ وہاں گئی تھی۔“
 ”زہبی نے مجھ سے زیادہ مکمل کلمات نہیں کی۔“ حیدر علی نگاہ جراتے ہوئے بولا۔ ”اس نے صرف اتنا بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز یعنی آٹھ ستمبر دوپہر کے بعد اس کے سر میں اچانک درد ہونے لگا تھا اور اس نے آس سے جھپٹی لے کر گھر آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ عام طور سے بس کے ذریعے آس جاتی اور آتی ہے لیکن وقوعہ کے روز چونکہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے اس نے آٹو لے لیا تھا۔ اسے بس اتنا یاد ہے کہ آٹو والے نے اسے کوئی باڈی اسپرے ٹرائی کرنے کو کہا تھا۔ ڈرائیور کہنا تھا کہ وہ رکشا چلانے کے علاوہ چند کاسٹیکس وغیرہ بھی فروخت کرتا ہے جو وہ اپنے گاہکوں کو مارکیٹ ریٹ سے کم قیمتوں میں دے دیتا ہے۔ اس طرح اس کی اضافی آمدنی ہو جاتی ہے۔ زہبی آٹو والے کی باتوں میں آئی۔ اسے اس محنت کش رکشا ڈرائیور پر ترس آ گیا تھا۔ اس نے آٹو دالے سے ایک باڈی اسپرے لے کر ٹرائی کیا تو اس کی خوشبو سے زہبی کو پکڑ سا آ گیا۔ اس کے سر میں پہلے ہی درد ہو رہا تھا۔ اسے بس اتنا یاد ہے کہ وہ اس اسپرے کو سونگھنے کے بعد اپنے ہوش دھواں میں نہیں رہی تھی۔“ لگائی توقف کر کے حیدر علی نے ایک پوچھل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”زہبی کے بیان کے مطابق جب اسے ہوش آیا تو وہ کسی عالی شان گھر کے بیڈ روم میں تھی۔ اس کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا تاہم برابر والے کمرے سے دو افراد کی باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ زہبی نے ان آوازوں پر دھیان لگا لیا تو اسے پتا چلا کہ وہ دونوں آپس میں جھگڑا کر رہے تھے اور وہ ٹیسٹ میں بھی لگ رہے تھے۔“

”فیصل! اس لڑکی کو میں لے کر آیا ہوں۔“ ایک نے دوسرے سے کہا۔ ”پہلے میں اس کے پاس جاؤں گا۔ تمہارا نمبر بعد میں آئے گا۔“
 ”نیل! میں تم سے عمر میں بڑا ہوں اس لیے پہلا حق میرا ہے۔“

”ان دونوں کی بحث و گھرارے زہبی کو ان کے نام معلوم ہو گئے تھے۔ زہبی کی یادداشت کے مطابق اسے آٹو

والے نے انکار کیا تھا۔ اس حساب سے نیل وہی آٹو والا ہونا چاہیے تھا۔ یہ زرعی کا ابتدائی اندازہ تھا جو بعد از ان غلط ثابت ہوا تھا۔ نیل دراصل ایک وفاق و راز کا گہرا ہوا اہلکار بننا تھا اور وہ آٹو والا دعوے باز شخص نیل کے نیلے کام کرتا تھا۔

”تم مجھ سے دو تین سال بڑے ضرور ہو فیصل!“

نیل نے شاک کے لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں یہ عروں کے فرق کا معاملہ نہیں ہے۔“

”پھر یہ کیوں سا معاملہ ہے؟“ فیصل نے طنز یہ لہجہ میں پوچھا۔

وضاحت کو تمام کرتے ہوئے بتایا۔ ”زہبی کے مطابق فارنگ کی آواز سننے ہی وہ اس بیڈ روم سے نکل کر باہر کی طرف لہجہ کی گئی۔ اس نے پلٹ کر یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کہ برابر والے کمرے میں فیصل اور نیل نامی جو دو افراد اس کی ذات کو لے کر آپس میں جھگڑا کر رہے تھے، ان میں سے کون جان کی بازی ہار گیا تھا اور کون زندہ بچا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے جب فارم ہاؤس کے بیرونی حصے میں پہنچی تو اس نے اپنے عقب میں فیصل کی آواز سنی۔

”کل زمانہ اس لڑکی کو پکڑو۔ یہ نیل کو نکل کرنے کے بعد یہاں سے فرار ہو رہی ہے۔“

لوگ عیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ بعض تو دے الفاظ میں بہت کچھ کہہ بھی جاتے ہیں۔ اگرچہ میں ان کے تہمیدے سن نہیں پا تا لیکن مجھے معلوم ہے، وہ زمینی کے کردار پر کچھ ہی اچال رہے ہوتے ہیں۔“

”آپ اپنے دعوے کو اپنے عمل سے ثابت کریں اور لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کی بدگوئی کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا کریں۔“

وہ آبدیدہ ہو گیا۔ ”کاش ہماری عدالت میں آپ جیسے نفلز اور ایماندار وکلایں تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو جائے۔“

روز عدالت میں میری مصروفیات نہ ہونے کے برابر تھیں اسی لیے میں خلاف معمول جلدی آفس چلا گیا تھا۔ اس زمانے میں گیارہ ستمبر کی چٹھی ہوا کرتی تھی۔ بہر کیف، آئندہ روز جب میں عدالتی معاملات سے فارغ ہوا تو نوٹج کرنے کے بعد میں دس بجے بسے سیدھا حائل تعلقہ تھانے پہنچ گیا تھا۔

ایک عادی زانی اور شرابی مقصص تھا۔ اس کے علاوہ بھی شاکر کے اندر کئی ایک دیگر معاشرتی برائیاں پائی جاتی تھیں۔ شادی کے چھ ماہ بعد ہی زہی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شاکر کے ساتھ نہیں رہے گی۔

اس موقع پر کئی لوگوں نے زہی کو سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ وہ اس معاملے میں جلد بازی سے کام نہ لے۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر شاکر سدھر جائے۔ آج کل تو لڑکیوں کی شادی ہی بہت مشکل سے ہوتی ہے۔ وہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سوچنے کی کوشش کرے۔ اس شادی کو بچانے کا بھی کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔

”رسبی! کیا تم اس آنسو والے کو پہچان سکتی ہو جس نے تمہیں کوئی باڈی ایسے بڑائی کرنے کے لیے کہا تھا جس کے بعد تم بے ہوش ہو گئی تھیں؟“

”ہاں، اس کا چہرہ مجھے یاد ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مگر وہ دوبارہ میرے سامنے آئے تو میں اسے پہچان لوں گی۔“

”آؤ میں بے ہوش ہونے کے بعد میں اس فارم ہاؤس میں کیسے پہنچی، اس حوالے سے مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو اس فارم ہاؤس کے ایک بیڈ روم پایا تھا اور ساتھ والے کمرے سے مجھے ان دونوں کے جھگڑنے کی آوازیں آتی تھیں۔ اس وقت میں ان کی شکل صورت سے واقف نہیں تھی لیکن بعد ازاں جب فارم ہاؤس کے چوکیدار نے مجھے کچلا تو میں نے فیصل کو دیکھا تھا کیونکہ اسی کے حکم پر چوکیدار میرے تعاقب میں دوڑا تھا۔ اللہ کا شکر ہے.....“ زہبی نے لمبائی توقف کر کے ایک خطرناک جھرجھری کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ”فیصل اور نیل میری عصمت کو پامال کرنے کے لیے مجھے اس فارم ہاؤس پر لے گئے تھے۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ میں دوسرے بیڈ روم میں بے ہوش پڑی ہوں۔ قدرت کو میری عزت کی حفاظت منظور تھی اس لیے ان شیطانوں کی توقع سے پہلے مجھے ہوش آگیا اور ان کی بحث و تمکار سن کر میں سمجھ گئی کہ وہ کس نیت سے مجھے اغوا کر کے وہاں لائے تھے۔ میں بیڈ روم سے نکلنے کا فیصلہ کر چکی تھی کہ برابر والے کمرے میں گولی چلی گئی۔ ان دونوں کی گفتگو کی روشنی میں مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت یا دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ فیصل نے نیل کو روکنے کے لیے اس پر گولی چلائی تھی جو نیل کی کھوپڑی کے پار ہو گئی۔ اب میرا ہاں ایک لمحہ بھی رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ سو، میں نے باہر کی جانب دوڑ لگا دی مگر بد قسمتی سے میں پکڑی گئی اور اس کے بعد.....!“ وہ ایک مرتبہ پھر تھکی۔ دو تین گہری سانسیں لینے کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”فیصل نے ساری کہانی ہی الٹ دی۔ اس نے پولیس کو جو کچھ بھی بتایا ہے، اس میں ذرا سی بھی حقیقت نہیں۔ اس کے ملازمین نے بھی اس کی مرضی کا بیان دیا۔ میں نیل کو جانتی تک نہیں تھی اور مجھے اس کی گرل فرینڈ بنا دیا گیا جو اپنی خواہش سے نیل کے ساتھ موج سستی کرنے اس فارم ہاؤس پر گئی تھی۔ دولت مند لوگ پیسا خرچ کر کے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کس طرح بنا دیتے ہیں، اس کا صحیح معنوں میں مجھے پہلی بار اندازہ ہوا ہے۔ بیگ صاحب! کیا ان لوگوں میں معمولی سی بھی شرم و حیا نہیں ہے۔ مجھے بتائیں، کیا یہ کہنے، خدا سے بھی نہیں ڈرتے؟ کیا انہیں ذرا سامان بھی احساس نہیں ہے کہ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ سانچہ، ستر، اسی، نوے، سو..... کتنا بھی جی لیں، ایک دن موت تو آتا ہی ہے

جسے مال و دولت کے دم پر روکا جائے گا نہیں جاسکتا۔“ زہبی جذبات میں بہہ کر کچھ زیادہ ہی بول گئی تھی اور میں نے بھی اسے روکنے یا ٹوکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے دماغ کا بخار اور دل کا غبار اچھے سے دھل جائے۔ جب وہ اپنی کہہ کر شانت ہو گئی تو میں نے معتدل اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”دیکھو زہبی! دولت مند ہونا کوئی معیوب یا بری بات نہیں ہے۔ ہاں، البتہ اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرنا کسی بھی طور پر جائز یا مستحسن عمل نہیں ہے۔ دولت، اختیار اور اقتدار کے نشے میں جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ قابلِ مذمت ہیں اور یہی وہ غرور و غفلت انسان ہیں جو اللہ سے نہیں ڈرتے۔ تم بھی عاقبت نااندیش دولت مند بابوں کی بگڑی ہوئی عیاشی اور لاادبی کی سازش کا شکار ہو گئی ہو لیکن شکر کا مقام یہ ہے کہ ان کے غلیظ عزائم کی تکمیل سے پہلے ہی تمہارے حق میں دو اہم واقعات رونما ہو گئے۔“ لمبائی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”نمبر ایک..... جہیں ان کے مجرمانہ حملے سے پہلے ہی ہوش آگیا۔ نمبر دو..... تمہاری طرف رخ کرنے سے قبل ان کے سچ پھٹا ہو گیا جس میں ایک شیطان کے ہاتھوں دوسرا شیطان مارا گیا۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگ صاحب!“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں تو اسے امداد بھیجی ہی کہوں گی مگر سوال یہ ہے کہ آگے کیا ہوگا؟ ان لوگوں نے تو پولیس اور دیگر متعلقہ افراد کے منہ نونوں سے بھر کر مجھ پر بڑا سنگین مقدمہ بنا دیا ہے۔ کیا میں اس بخنور سے کبھی باہر بھی آسکوں گی؟“

زہبی کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ وہ دکھ نش فطرت کی مالک ایک جاذبِ نظر اور پرکشش لڑکی تھی۔ شاکر سے اس کی شادی صرف چھ ماہ چل سکی تھی۔ شاکر کی بد قسمتی اور زہبی کی خوش نصیبی کہ ان کا ازدواجی بندھن کچھ دھماگے سے بھی زیادہ تائید اور کمزور ثابت ہوا تھا۔

کرم نے نیل کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا۔ قتل کی اس واردات میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ کیا تم اتنا بھی نہیں ترسکتی ہو؟“

”کیوں نہیں بیگ صاحب!“ وہ جلدی سے بولی۔ ”یہی تو حقیقت ہے کہ میں بے قصور ہوں۔“

”ہاں تو پھر سمجھ لو کہ میں گناہ گاروں اور مجرموں کی ہولت نہیں کرتا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے تمہارے کس میں ہاتھ ڈالا ہے تو تمہیں بے گناہ ثابت کر کے باعزت بری بھی کراؤں گا۔“

اس کے چہرے پر اطمینان جھلکے لگا۔

میں نے وکالت مانے، درخواستِ ضمانت اور دیگر چھ اہم کاغذات پر زہبی کے دستخط لیے، آئے پولیس کی کمرڈی میں خود کو محفوظ رکھنے کے ٹرے تائے اور تسلی بخشی کے بعد اس وعدے کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

”چندہ تمہاری صحت عدالت میں ملاقات ہوگی۔“ زہبی نے بی کام کرکھا تھا اور وہ آئی آئی چندر بیکر روڈ پر واقع ایک فرم کے اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتی تھی۔ اس واقعے سے پہلے زہبی کی زندگی میں صرف ایک ہی آپ سیٹ تھا یعنی شاکر جیسے بے وقافتہ شخص سے شادی اور وہ اس ناخوشگوار واقعے کو بھول کر اپنی زندگی میں گمن ہو گئی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ جی بھائی زندگی نے اچانک ایک تکلیف دہ اور اذیت ناک کروٹ لے لی تھی۔

☆☆☆

ریمائنڈر مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس مقدمے کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ چارج شیٹ میں زہبی کے کردار کو مشکوک بنانے کے لیے حد سے زیادہ منافقت، ریاکاری اور جانبداری سے کام لیا گیا تھا۔ اس حوالے سے مشورہ نیل اور قاتل فیصل کے باپوں نے ہر ہر جگہ حالات کو اپنی موافقت میں لانے کے لیے پیسے کو پانی کی طرح بہایا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ زہبی کے توسط سے میں یہ جان چکا تھا کہ نیل پر گولی فیصل نے چلائی تھی لیکن فیصل کے صنعت کار بزنس مین باپ نوازش علی نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے ایسا جال بچھایا تھا کہ نیل کا باپ، وہ نذرانہ شہر بھیجی یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کے بیٹے کی قاتل میری مولا اور اس کیس کی طرہ زیب الشاعرف زہبی ہی ہے۔

وفاقی وزیر جیسے گھاگ سیاست دان کو ایک گرگوبر داراں، بید، مرد گرد مچھیا صنعت کار نوازش علی نے بڑی مہارت اور خوبصورتی سے اپنے شیشے میں اتار لیا تھا۔ قاتل کا باپ

وائٹ ایک بائیس شخص تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ڈیفنس کے سامنے اس کی تہذیب کہاں تک اُڑو کھائی ہیں۔

نیل کو فیصل نے گولی ماری تھی یا کسی ایکس، وائے، زیڈ نے..... یہ ثابت کرنا میرا مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے تو عدالت کے سامنے اپنی مؤلفہ زہبی کو بے گناہ ثابت کرتے ہوئے اس امر کے محسوس ثبوت اور دلائل پیش کرنا تھے کہ نیل کی موت سے طرہ زہبی کا کوئی تعلق، واسطہ نہیں ہے۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہونے سے پہلے میں نے اپنا وکالت نامہ اور زہبی کی درخواستِ ضمانت دائر کر دی تھی لیکن آپ کو یہ بتاتے ہوئے مجھے کوئی باک محسوس نہیں ہوا کہ عدالت نے زہبی کی ضمانت کی درخواست کو رد کرتے ہوئے طرہ کو جوڈیشل ریمائنڈر پرنٹل بھیج دیا تھا۔ میں پہلے بھی کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ قتل کے طرہ کی ضمانت بہت مشکل ہوتی ہے۔

میں عدالت سے باہر نکلا تو زہبی کا باپ حیدر علی میرے ساتھ تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے غناک مایوسی جھلک رہی تھی۔ میں نے اسے قتل کے طرہ کی ضمانت کے حوالے سے قانونی پیچیدگیوں کے بارے میں با تفصیل آگاہ کرنے کے بعد اپنا تہذیب بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

”حیدر صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ مایوسی اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ شے ہے؟“

حیدر علی نے ایک لمحہ سوچا تو میں نے اس کی آنکھوں میں ندامت کی چمک دیکھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے کہا۔ ”بیگ صاحب! میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں۔ مایوسی بڑا سنگین گناہ و صغیرہ ہے۔ انسان کو کسی بھی حال میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اُمّی اللہ سورہ بیگ صاحب!“

”کوئی بات نہیں حیدر صاحب!“ میں نے معتدل انداز میں کہا اور پوچھا۔ ”میں نے آپ کے ذمے جو کام لگا یا تھا، اس کا کیا ہوا؟“

”میں نے مالی سراج دین اور رکشا ڈرائیور تقدیر خان سے بات کر لی ہے۔ اس نے بتایا۔“ میں آج انہیں اپنے ساتھ لے کر آپ کے آفس آؤں گا۔ وہ دونوں میرے لیے قابلِ بھروسہ ہیں۔ آپ ان کے ذمے جو بھی کام لگائیں گے، وہ اسے پوری دیانت داری سے انجام دیں گے۔“

”دوبری گڈ!“ میں نے سانس کی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”بیگ صاحب! زہبی کے بغیر گھر بہت سونا سونا ہو گیا ہے۔“ وہ بکرا پاش لہجے میں بولا۔ ”آپ تو جانتے ہی ہیں کہ وہ تمہاری توجہ اور محبت کا مرکز و محور تھی اور اب تو پتا نہیں وہ کب دوبارہ گھر میں قدم رکھے گی۔“

سپنس ڈائجسٹ 99 اکتوبر 2024

رمز شناس

کے صفات پر

سینس ڈائجسٹ

بہت جلد

ماہنامہ

نازیہ کامران کاشف

کے قلم سے

وہ صدیوں پر محیط ایک سربستہ راز تھا..... جس کی خبریں ہندوستان سے لے کر مصر اور انگلستان تک پھیلی ہوئی تھیں

ایک جنگجو اور رمز شناس کی کائنات کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھانے کی ایسی کوشش..... جس نے شیطانی قوتوں کو جگا دیا۔

علم کی معراج پانے والوں کی ایسی ناقابل فراموش داستان جس نے تاریخ کے صفحات پر تباہ و تاراج کو عبرت کے دائرے میں قید کر لیا

عشق اور مرض کے درمیان وہ کون تھا جسے کامیابی حاصل ہوئی۔

ایک ایسی تحیر انگیز اور تباہ کن خیر داستان جس کی کڑیاں آج بھی خوف سے جڑیں ہیں

ہے باہر نکل گئی تھی جس کے سبب فی الفور اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اتنی گزرتی تھی سے پلائی جانے والی گولی لگ کر سر کے آ پار ہو جائے تو انسان کا زندہ بچ جانا ایک معجزہ ہی ہوگا اور نبیل کے معاملے میں کوئی معجزہ رونما نہیں ہوا تھا اور وہ ایک سانس لیے بغیر موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ اسی رپورٹ میں ایک خاص اٹکس بتاتے ہیں کہ تھا کہ متول کی کھوپڑی کے اندر ہڈی نے اپنا زانو ڈرا سا بھی تپوڑ نہیں کیا تھا یعنی وہ جس اینٹیل سے متول کی پیشانی میں ٹکرائی تھی، اسی اینٹیل پر وہ اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے سے باہر نکلی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گولی نے متول کی کھوپڑی کے اندر 180 ڈگری (خط مستقیم) پر ستر کیا تھا۔

میڈیکل رپورٹ کے ساتھ ہی کیس کی ایگزامینر کی رپورٹ بھی منسلک تھی جس کے مطابق متول کے معدے سے حاصل کیے جانے والے مواد کے اندر اینٹیل پائی گئی تھی جس سے یہ واضح ہو جاتا تھا کہ موت سے پہلے اس نے شراب کا نشہ کر رکھا تھا۔ میں نے ان تمام پوائنٹس کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔

اگلی پیشی میں اچھا خاصہ وقت تھا لہذا میں کیس کی باقاعدہ ساعت کے لیے اپنی تیاری میں لگ گیا۔ اس جاب کا ایک حصہ سراج دین اور قدیر خان سے رابطہ میں رہ کر ان کی کارکردگی کا جائزہ لینا بھی تھا۔ حیدر علی کے دیے ہوئے یہ دونوں بندے بڑے کام کے ثابت ہوئے تھے۔

☆☆☆

عدالت کی کیا قاعدہ کارروائی تک پہنچنے کے لیے دو ماہ لگ گئے تھے اور میرے خیال میں یہ بہت کم عرصہ تھا ورنہ ہماری عدالتوں میں بعض کیس سالہا سال سے چل رہے ہیں مگر ابھی تک ان کی کوئی شکل نکل کر نہیں آئی۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ سچ نے چارج شیٹ کی روشنی میں فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ طرمہ نے صحت جرم سے منافی انکار کر دیا۔

اس کے بعد طرمہ زہبی کا بیان حلفی ریکارڈ کیا گیا۔ میری موکلہ اور اس کیس کی طرمہ زیب النساء عرف زہبی نے بڑا پٹا تلا بیان دیا۔ اس حوالے سے میں نے اسے خاص ہدایات دے رکھی تھیں۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ زہبی نے میرے بتائے ہوئے پوائنٹس کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کر لیا تھا۔

”پراسیکیوشن!“ سچ نے وکیل استثناء کی طرف دیکھتے ہوئے یہ آواز بلند کیا۔

حیدر علی کے سینے میں ایک باپ کا دل تھا اور کوئی باپ اپنی بیٹی سے کتنی محبت کرتا ہے یا کتنی محبت کر سکتا ہے، اس سانس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

”حیدر صاحب! آپ عمو اور تجربے میں مجھ سے بہت زیادہ سینئر ہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”لیکن آج میں آپ کو بچنے کی ایک بات بتا رہا ہوں۔“

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا تو وہ چونک کر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کھری سنجیدگی سے اپنی بات کو آگے بڑھا دیا۔

”اللہ ہمارا خالق، مالک، رازق اور معبود ہے۔ بنا ہے وہ ستر ماؤں سے زیادہ اپنے بندے سے محبت کرتا ہے۔

اس ذات پاک کی اس بے بہا محبت کا تقاضا ہے کہ انسان بھی اپنے رب کو اس کائنات کی ہر چیز سے زیادہ چاہے۔

جب ہم اپنی کئی عزیز ہستی کو مر کڑی اور مجبور محبت مان کر اس کی حاجت میں اندھے ہو جاتے ہیں تو ہمارا پروردگار ہمیں جھنجھوڑنے کے لیے اس عزیز ہستی کو ہم سے دور کر دیتا ہے۔

یہ جدائی عارضی بھی ہو سکتی ہے اور دائمی بھی۔ آپ اللہ کا شکر ادا کریں کہ زہبی چند ماہ کے لیے آپ سے دور ہوئی ہے۔“

اس کی آنکھیں چمک پڑیں۔ ”بیگ صاحب! آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا ”آپ کا بہت بہت شکر ہے اور اب مجھے اجازت دیں۔“

اس نے مناسفانہ کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور مجھے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے جا کر اپنے رب کا شکر بھی ادا کرنا ہے کہ اس نے ایک وکیل کے نہیں میں آپ کو مجھ سے ملوایا۔“

میں نے حیدر علی کو روکا نہیں اور سچی بات تو یہ کہ وہ میرے روکنے سے روکنے والا بھی نہیں تھا۔ میں زیر لب مسکراتے ہوئے پارکنگ کی جانب بڑھ گیا۔

اسی شام حیدر علی، سراج دین اور قدیر خان کو مجھ سے ملوانے لے آیا تھا۔ میں نے ضروری ہدایات دینے کے بعد ان دونوں بندوں کو کام سے لگا دیا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا کچھ ذکر ہو جائے۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق متول نبیل کی موت آٹھ گھنٹہ کی سہ پہر پانچ اور چھ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور اس کی موت کا سبب اعشاریہ تین آنٹھ کیلبر کی وہ گولی تھی جو انتہائی نزدیک سے اس پر چلائی گئی تھی۔

”پوائنٹ بلیٹک رینج“ سے چلائی جانے والی مذکورہ گولی متول کی پیشانی میں گھس کر اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے

جی کی پکار پر وکیل استغاثہ کی نوڈ باکس (مزم والے کنبہ) کے قریب پہنچ گیا۔ ٹیل کے سیاست دان باپ نے اپنے تعلقات کا استعمال کر کے ہماری فیس پر ایک ٹھٹھا وکیل ارجح کیا تھا۔ وکیل استغاثہ کا شمار کراچی کے سب سے ترین وکلاء میں ہوتا تھا۔

”تم متول کو کب سے جانتی تھیں؟“ وکیل استغاثہ نے مزم سے سوال کیا۔

”میرا متول سے کبھی کوئی تعلق واسطہ نہیں رہا۔“

مزم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”وقعہ کے روز جب مجھے آغا کر کے اس فارم ہاؤس پر پہنچایا گیا تو ہوٹل میں آنے کے بعد میں نے برابر والے کمرے میں دو افراد کے باتیں کرنے کی آوازیں سنی تھیں۔ تبھی مجھے معلوم ہوا کہ متول اور اس کا دوست فیصل میری عزت سے کھینچنے کے لیے مجھے اس فارم ہاؤس میں لے کر گئے تھے۔ ان دونوں میں ”پہلے میں، پہلے میں“ پر جھڑا ہو گیا تھا اور وہ ایک دوسرے کو نام سے پکار کر بحث کر رہے تھے جیسی مجھے پتا چلا کہ ان میں سے ایک ٹیل اور دوسرا فیصل تھا۔“

”تم نے مذکورہ فارم ہاؤس کے مالک کے بیٹے فیصل پر الزام بھی لگایا ہے کہ اس نے ٹیل کو قتل کیا ہے۔“ وکیل استغاثہ نے اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”جبکہ حقیقت یہ ہے کہ فیصل جائے وقوعہ پر موجود ہی نہیں تھا۔“

”میں نے کسی پر الزام عائد نہیں کیا۔“ مزم نے بے خوف لہجے میں جواب دیا۔ ”میں نے جو سنا، وہی بیان کیا ہے۔ فیصل اور ٹیل کے جھڑپے کے دوران میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب ٹیل نے فیصل کو چپچپ کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہی میں نے فائر کی آواز سنی تھی۔“ وہ لہجے بھر کے لیے رکی پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد وکیل استغاثہ سے سوال کیا۔

”وکیل صاحب! میں اکاؤنٹس اور اکٹانکس کی دنیا سے تعلق رکھتی ہوں۔ آپ میرے حساب کتاب پر انگلی نہیں اٹھا سکتے۔ اگر میری جگہ کوئی ان پڑھ، جاہل، گنوار بھی ہوتا تو دو افراد کی لڑائی میں گولی چلنے کے بعد وہ بڑے استہاد کے ساتھ ہٹا سکتا تھا کہ جس کی موت واقع ہوئی، وہ متول اور جو زندہ بچ گیا، وہ قاتل ہے۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آٹھ ستمبر کی سہ پہر نوادش علی نامی ایک معروف صنعت کار کے فارم ہاؤس پر فیصل اور ٹیل میں سے کون زندہ بچا تھا؟“

”یہ سوال ہی فضول ہے۔“ وکیل استغاثہ نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیونکہ وقوعہ کے وقت فارم

ہاؤس پر متول کے ساتھ فیصل نہیں بلکہ تم تھیں اور ویسے بھی.....“ وکیل استغاثہ نے برا سامنے بنا کر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ”میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔“

”ساری پابندیاں تو کنبہ کے اندر کھڑے افراد پر عائد ہوتی ہیں وکیل صاحب!“ زہبی نے اپنی فطری بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مثنیٰ خیر لہجے میں کہا۔ ”آپ تو کنبہ کے باہر ہیں۔ خیر، آپ کے احترام میں میرے سوال کا جواب موجود ہے۔“

”کیا تم اس حقیقت سے انکار کر سکتی ہو کہ متول اکثر تمہیں آفس سے پک کر لیا کرتا تھا اور تم دونوں مختلف ریٹورنٹس میں اپنی مرضی اور پسند کے مطابق وقت گزارا کرتے تھے۔“ وکیل استغاثہ نے اپنی خفت کو مٹانے کے لیے مزم سے ایک رک رک سوال کیا۔ ”لیکن فارم ہاؤس پر جانے کا تمہارا پہلا تجربہ تھا۔ شاید اسی لیے تم دونوں کے درمیان کوئی غلط فہمی ہوئی تھی اور تم نے ٹیل میں آکر متول کے بدلے.....“

”آج بھی یو آر آنرا! میں نے وکیل استغاثہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بے آواز بلند کہا۔ ”میری مؤکلہ واضح الفاظ میں بتا چکی ہے کہ وہ متول کو کمرے سے جاتی ہی نہیں تو پھر استغاثہ اس کے کردار پر پتھر اچھالنے کے لیے عدالت کو من گھڑت کہانیاں کیوں سنارہا ہے؟“

”ڈیفنس جس سچائی کو سن گھڑت کہانی کہہ کر مزم کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے، اس کے ٹیس ثبوت ہیں استغاثہ کے پاس۔“ وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں تین چار ایسے افراد کے نام بھی شامل ہیں جو مزم کی پارسانی کا کچا چٹھا کیبل کر اس کیس کو صاف کریں گے۔“

”آج بھی یو آر رولڈ!“ جج نے ٹمبرے ہوئے لہجے میں کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”بیک صاحب! پراسیکیوشن کو اپنا کام کرنے دیں۔ اپنی مؤکلہ کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے آپ کو بھی موقع دیا جائے گا۔“

جج کے روئے کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال ابھر اٹھیں میں نے اس پردھیان نہیں دیا اور پوری توجہ عدالتی کارروائی پر لگا دی۔ وکیل استغاثہ میری مؤکلہ سے پوچھ رہا تھا۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“

”سوال دہرا دیں پلیز!“ زہبی نے متول انداز میں کہا۔

”کیا تم اس بات سے انکار کر رہی ہو کہ تم میں اور متول میں کافی عرصے سے دوستی چل رہی تھی اور متول اکثر تمہیں آفس سے پک کر کے اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا؟“

”میں اس سوال کا جواب دے چکی ہوں وکیل صاحب!“ زہبی نے خشکی بھرے لہجے میں کہا۔ ”ٹیل سے میرا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس افسوسناک واقعے سے پہلے میں اس کا نام تک نہیں جانتی تھی اور جہاں تک متول کے مجھے اکثر آفس سے پک کرنے کا معاملہ ہے تو میں اپنے اوپر لگے اس الزام بلکہ بہتان سے صاف انکار کرتی ہوں اور اس انکار کی میرے پاس ٹیس ثبوت بھی ہے جسے میں ثبوت کے طور پر عدالت کے سامنے پیش کر سکتی ہوں۔“

”ایسا کیا ہے تمہارے پاس؟“ وکیل استغاثہ نے جج زدہ نظر سے مزم کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”یہ پوچھیں کہ کیا کیا ہے میرے پاس۔“ زہبی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ زہبی ایک بچی، کھری اور دلیر عورت تھی لیکن اتنا اندازہ نہیں تھا کہ وہ کنبہ کے میں کھڑے ہو کر ایسی جرات کا مظاہرہ بھی کر سکتی ہے۔ زہبی کا یہ روپ بکلی مرتبہ میرے سامنے آیا تھا۔

”بی بی! آپ وکیل استغاثہ سے الجھنے کے بجائے اس وجہ عدالت کے سامنے لاؤ جس کا ابھی تم نے ذکر کیا ہے۔“ جج نے زہبی سے کہا۔ ”اور اگر تمہارا وکیل بھی اس خاص وجہ سے واقف ہے تو زیادہ بہتر ہوگا، ڈیفنس تمہارے موقف کو آگے بڑھائے۔“

”یو آر آنرا! میں جانتا ہوں میری مؤکلہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کس ثبوت کو معزز عدالت کے سامنے رکھنا چاہتی ہے۔“ میں نے جج سے مخاطب ہو کر مضبوط لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے، عدالت آپ کو توجہ سے سن رہی ہے۔“

جواب دینے جا رہی تھی۔

”جناب عالی!“ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میری مؤکلہ پچھلے ڈیڑھ سال سے ایک آفس میں کام کر رہی ہے اور اس آفس کے اوقات کار صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک ہیں۔ مزم روزانہ بذریعہ بس آفس آتی جاتی تھی اور گھر کے نزدیک اسے ٹھوٹا پیدل بھی چلنا پڑتا تھا۔ آفس جانے سے پہلے اور آفس سے واپس آنے کے بعد اس کا اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈیٹ پر جانا ممکن دکھائی نہیں دیتا کیونکہ گھر میں اس کا بوڑھا باپ مل جل اپنی بیٹی کی شکل دیکھنے کے لیے بے چین اور منتظر رہتا تھا۔ اب رہ گیا یہ امکان کہ وہ دوران ڈیوٹی آفس سے نکل کر تھوڑی دیر کے لیے اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ وقت گزار آتی ہو.....!“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر انکشاف انگیز لہجے میں اپنی بات مکمل کر دی۔

”تو اس سلسلے میں، میں اپنی مؤکلہ کے آفس اسٹاف میں سے نصف درجن افراد کو عدالت میں پیش کر کے اس امر کی تصدیق کر سکتا ہوں کہ ایسا بھی نہیں ہوا۔“

”ایسا بھی ہوا یا نہیں ہوا، اسے ثابت کرنے کے لیے جب آپ عدالتی کے نصف درجن گواہوں کو عدالت میں پیش کریں گے، تب کی تب دیکھی جائے گی میرے فاضل دوست!“ وکیل استغاثہ نے چوٹ کرنے والے انداز میں مجھ سے کہا۔ ”فی الحال تو یہ ثابت شدہ ہے کہ وقوعہ کے روز یعنی اچھے سہرے کی دوپہر مزم سردرد کا بہانہ کر کے اپنے آفس سے نکلی تھی۔ باہر سڑک کے کنارے اس کا دوست متول ٹیل اپنی گاڑی میں اس کا انتظار کر.....“

”آج بھی یو آر آنرا!“ میں نے قطع بکھاری کرتے ہوئے جارحانہ لہجے میں کہا۔ ”وقعہ کی دوپہر میری مؤکلہ کس طرح ایک آٹو والے کے فریب کا شکار ہوئی، وہ اپنے بیان میں اس سانحے کا ذکر بالتفصیل کر چکی ہے۔ اس بے چاری کو تو بے ہوشی کی حالت میں اس فارم ہاؤس میں پہنچایا گیا تھا اور یہاں پر میرے فاضل دوست اس کی کردار نشی کے ذیل میں بے سرو بیابانی سنارہے ہیں۔“

جج نے ٹیل سے میری بات سنی اور خشک لہجے میں مجھ سے استفادہ کیا۔ ”وکیل صاحب! کیا آپ اپنی بات کے ثبوت کے طور پر کوئی ٹیس ثبوت دکھائی دیں اور ایسی شے عدالت میں پیش کر سکتے ہیں جو باڈی ایپر سے بیچنے والے اس رکشا ڈرائیور کے وجود کی تصدیق کرتی ہو؟“

میں نے گول مول جواب دیا۔ ”جناب عالی! اس

سلسلے میں کوشش کی جاسکتی ہے۔

”اچھی بات ہے۔“ سچ نے سیاہ آواز میں کہا۔ ”یہ عدالت آپ کی اس کوشش کے نتائج کا انتظار کرے گی۔“ پھر وہ وکیل استغاثہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”پراسیکیوشن! پلیز پرسید!“

”یہ آواز! ڈیفنس اس ریکارڈ رائیور کو کان سے بکڑ کر کب عدالت میں پیش کرتا ہے، اس کا استغاثہ کو بھی بے تابی سے انتظار رہے گا۔“ وکیل استغاثہ نے سچ کو سناتے ہوئے مجھ پر طعن کیا تھا۔

میں وکیل مخالف کے اس وار کو مردانہ وار سہہ گیا اور کسی قسم کا رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ استہزاء سے نظر سے نیچے دیکھنے کے بعد دوبارہ سچ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”جناب عالی! اگر عدالت کی اجازت ہو تو میں استغاثہ کے ایک ایسے گواہ کو عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس نے متعدد بار ملزم کو متھول کی گاڑی میں بیٹھ کر جاتے دیکھا تھا۔“

”پریشن گر انڈیا!“ سچ نے مخصوص انداز میں کہا۔ اس کے بعد استغاثہ کا گواہ امجد علی وٹس باکس میں آکر کھڑا ہو گیا۔ امجد کی عمر پچاس کے اریب قریب تھی۔ وہ پان و مگرٹ وغیرہ کا ایک کمین چلاتا تھا۔ زہبی کا آفس جس بلڈنگ میں تھا، اس کے سامنے مرکز کی دوسری طرف امجد کا کمین فٹ پاتھ کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ مذکورہ کمین اتنا چھوٹا تھا کہ اس کے وجود سے پیدل چلنے والوں کو کسی دشواری یا پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ امجد کے کمین سے زہبی والی بلڈنگ کا داخلی گیٹ بالکل واضح دکھائی دیتا تھا۔

امجد علی نے حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرادیا تو وکیل استغاثہ اس کے نزدیک چلا گیا۔ وہ گھما چمرا کر اپنے سوالات اور گواہ کے جوابات سے عدالت کو یہ یاد کرانے کی کوشش کرتا رہا کہ امجد علی نے ملزم کو متھول کی گاڑی میں بیٹھ کر جاتے ہوئے کئی بار دیکھا تھا۔ اپنی جرح کے اختتام پر اس نے پوچھا۔

”امجد علی! تمہیں تو وعدہ لینی آٹھ ستمبر کی سہ پہر تو یاد ہوئی؟“

”اچھی طرح یاد ہے وکیل صاحب!“ گواہ نے کسی ٹیپ ریکارڈر کے مانند بولنا شروع کیا۔ ”اس وقت کم و بیش تین بجے ہوں گے۔ میں نے ملزم کو کسی نو جوان کی گاڑی میں بیٹھ کر جاتے دیکھا تھا۔ وہ وہی نو جوان تھا جس کے ساتھ وہ اکثر جایا کرتی تھی۔“

”کیا تم مذکورہ نو جوان کو پہچان سکتے ہو؟“

وکیل استغاثہ کے اس سوال پر گواہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے الجھن زدہ لمحے میں کہا۔ ”مگر اس نو جوان کو تو دو دو سال پہلے ملزم نے گولی مار دی تھی۔“

”ہاں، تم صحیح کہہ رہے ہو۔“ وکیل استغاثہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم سے شناخت کرانے کے لیے متھول نیل کو اب یہاں نہیں لایا جاسکتا مگر اس کام کو انجام دینے کے لیے ایک دوسرا آسان طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔“

وکیل استغاثہ کی مبہم وضاحت پر گواہ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ وکیل استغاثہ نے اس پر توجہ نہیں دی اور اپنے بیگ کے اندر سے پوسٹ کارڈ ساز کی چند تصاویر نکال کر گواہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”امجد علی! معزز عدالت جاننا چاہتی ہے کہ کیا ان تصاویر میں اس نو جوان کی بھی کوئی نوٹ ہے جو اکثر و بیشتر ملزم کو پک کرانے اس کے آفس آیا کرتا تھا؟“

امجد علی نے تاش کے پتوں کی طرح مذکورہ تصاویر کو اپنے ہاتھوں میں ادھر ادھر حرکت دینے کے بعد ایک نوٹ کو الگ کر لیا اور بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

”تو وعدہ کروں گی کہ نو جوان ملزم کو پک کرانے آیا تھا۔“ وکیل استغاثہ نے فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھا اور مذکورہ تصویر کو سچ کی جانب بڑھاتے ہوئے قدرے بلند آواز میں کہا۔

”جناب عالی! استغاثہ کے گواہ امجد علی نے آٹھ تصاویر میں سے صرف متھول ہی کی نوٹ کو الگ کیا ہے جس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ گواہ کی نگاہ ایک دم پرنکٹ ہے۔ اس کے مشاہدے پر پھر دوسرا کیا جاسکتا ہے۔“

سچ نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وکیل استغاثہ نے اپنی جرح کو موقوف کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”یو وٹس!“

میں وٹس باکس کے نزدیک چلا گیا اور استغاثہ کے گواہ امجد علی کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔

”امجد صاحب! آپ کب سے پان کا کمین چلاتے ہیں؟“ مجھے اس کام میں چندہ سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس نے بتایا۔

”آپ پان اور مگرٹ کے علاوہ اور کیا کیا فروخت کرتے ہیں؟“

”سوائف پارٹی اور ٹافیاں وغیرہ۔“

”مگر، مادہ، پان پر اک اور ٹی ٹی پڑیاں۔۔۔۔۔ ان سے بارے میں کیا کہتے ہیں؟“ میں نے چیختے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”نہیں جناب!“ وہ فنی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ سب تو ممنوع چیزیں ہیں۔ خاص طور پر وہ پڑیاں۔۔۔۔۔ ان کا شمار منشیات میں ہوتا ہے۔“

”تو تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم منشیات فروش نہیں ہو؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

جس طرح قربانی کے جانور کو ذبح کرنے سے پہلے خوب ہلا دھلا کر تیار کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ ہندی وغیرہ لگانے کے بعد اس کے بدن پر غبارے وغیرہ بھی بکھادیے جاتے ہیں، اس بے چارے بے زبان کو کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس آؤ بگت اور ناز برداری کے بعد اس کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔ بالکل ویسے ہی میں بھی اجماعی پرکاری وار کرنے سے پہلے اسے اپنے غیر متعلق سوالات کی مدد سے بکھرے کی طرح ادھر ادھر گھما رہا تھا۔

”نہیں وکیل صاحب!“ وہ جلدی سے بولا۔ ”میں نے کبھی کسی منشیات کو چھوا ایک نہیں، ایسی چیزوں کو فروخت کرنا تو دور کی بات ہے۔“

”شاباش! آپ تو بہت اچھے انسان ہیں۔“ میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”ویسے وکیل سرکار نے بھی خود ہی دیر پہلے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔“ میرے آخری جملے پر وکیل استغاثہ نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کے کان محاورہ ٹاٹھڑے ہو گئے تھے اور وہ حقیقتاً سوچتی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا جیسے میرے دماغ کو پڑنے کی کوشش کر رہا ہو اور اس کا گواہ امجد علی متعجب و حیران تھا کہ میں اس کی کون سی تعریف کا حوالہ دے رہا ہوں۔

”امجد صاحب! کیا آپ کی نگاہ سکس بالی سکس ہے؟“ میں نے استغاثہ کے گواہ سے سوال کیا۔

”یہ کیا ہوتا ہے؟“ اس نے الجھن زدہ انداز میں مجھ دیکھا۔

”مطلب، آپ کی آنکھیں بالکل ٹھیک اور صحت مند ہیں۔ آپ دور و نزدیک سچ طور پر دیکھ سکتے ہیں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اسی لیے وکیل صاحب نے آپ کی نگاہ کو ایک دم پرنکٹ ہونے کا لائسنس بھی جاری کر دیا ہے اور معزز عدالت کو یہ بھی یاد کرانے کی کوشش کی

ہے کہ آپ کے مشاہدے پر آنکھیں بند کر کے مجھ کو ماریا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔ وغیرہ۔“

”نیل اس کے کہ استغاثہ کا گواہ میری وضاحت کے جواب میں اب کشا ہوتا، وکیل استغاثہ نے دخل در مداخلات ضروری جانا۔“

”آئیٹیشن یو آر آزا!“ اس نے فنی مجھ سے لہجے میں کہا۔ ”اس وقت عدالت میں نیل مرڈر کیس کی سماعت جاری ہے اور ڈیفنس اپنا آئی ٹیکنک کھولے بیٹھے ہیں۔ یہ سب عدالت کے قیسی وقت کو برباد کرنے کے مترادف ہے۔“

”میرے فاضل دوست!“ میں نے ترکی یہ ترکی کہا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ میں آئی ٹیکنک کھولے بیٹھا نہیں بلکہ پولی ٹیکنک کھولے کھڑا ہوں اور میرے اس پولی ٹیکنک میں آپ کے گواہ کی نگاہ کے علاوہ اس کی نیت، کردار اور اخلاق کا ساتھ بھی کیا جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ جب آپ نے اپنے گواہ کو مجھ سے کے لائن ڈیکٹر کر دیا ہے تو ڈیفنس گواہ اتنا مونیق تو دیں کہ وہ آپ کے گواہ کے مجھ سے کو چیک کر سکے۔“

”آئیٹیشن سسٹم!“ سچ نے استغاثہ کے اعتراض کو جائز سمجھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”بیگ صاحب! آپ اپنے سوالات کو زیر سماعت کیس تک محدود رکھتے ہوئے جرح کو آگے بڑھائیں۔“

ایک مرتبہ پھر مجھے سچ کے رویے میں جانبداری محسوس ہوئی۔ اس نے استغاثہ کے آئیٹیشن کو برقرار رکھتے ہوئے مجھے دبانے کی کوشش کی تھی۔ پہلی بار میں نے سچ کی ایسی جانبداری کو نظر انداز کر دیا تھا لیکن اس واقعہ میں یہ سوچے بنا نہ رہ سکا کہ۔۔۔۔۔ کیا فوٹو اسی نے اپنے بیٹے فیصل کی گردن بچانے اور فیڈرل مشنر نے اپنے بیٹے نیل کے خون کو میری مؤکلہ کے سر پر ڈالنے کے لیے سچ کو بھی خرید لیا ہے؟

یہ میرا ایک ذہنی احساس تھا اور اگر یہ بات درست تھی تو پھر قانون شناس چٹا دیو یوں کے اس فرمودے پر پوری طرح فٹ ان نظر آتی تھی کہ ”غریب آدمی انصاف کے حصول کے لیے وکیل کرتا ہے اور امیر آدمی سچ۔“

”امجد صاحب! میں آپ کے مجھ سے، مشاہدے اور نیت کو نمٹ کرنے جا رہا ہوں لہذا میرے ہر سوال کا جواب اچھی طرح سوچ کر دیں۔“ میں نے استغاثہ کے گواہ کے چہرے پر نگاہ جما کر قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”کیا آپ نے واقعی ملزم کو توہم کی سہ پہر لگ بھگ تین بجے متھول کی کار میں بیٹھ کر دیکھا تھا؟ میں آٹھ ستمبر کی

بات کر رہا ہوں۔“
”جی ہاں۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”میں بھلا
جھوٹ کیوں بولوں گا۔“
”ڈنٹس ہاؤس میں کھڑے ہو کر بعض لوگ اس لیے
جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں کہ انہیں اس کام کا ہلکا یا بھاری
معاوضہ ملتا ہے اور اس رقم کا تعین کسی کی نوعیت پر ہوتا ہے
لیکن میں فی الوقت ایسے معاملات کی تہ میں نہیں جاسکتا
کیونکہ میری اس گستاخی پر کمرائے عدالت“ آئیکشن اور
”آز“ کے نعرے سے گونج اٹھے گا اور میں بلاوجہ عدالت کا
قیمتی وقت برباد کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ سو۔۔۔۔۔ میں
نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر جج
سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! معزز عدالت سے میری درخواست
ہے کہ استغاثہ کے گواہ امجد علی کو صرف پانچ منٹ کے لیے
کمرائے عدالت سے باہر بھیج دیا جائے۔ میں اس دوران
میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے ایک دو اہم سوالات کرنا
چاہتا ہوں۔“

میری اس فرمائش غماز اس میں کوئی قباحت نظر نہیں
آتی تھی چنانچہ عدالت کے حکم پر امجد علی کو کورٹ روم سے
باہر بھیج دیا گیا اور اس کی جگہ اس کیس کا انکوائری آفیسر
خورشید شاہ آکر کھڑا ہو گیا۔

خورشید شاہ کی عمر چالیس کے آس پاس تھی۔ وہ ایک
چاق و چوبند پولیس اہلکار تھا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں تیزی
سے ترقی کرتے ہوئے وہ سب انسپکٹر کے عہدے تک
رسائی حاصل کر چکا تھا۔

آپ کو معلوم ہے کہ کسی بھی کیس میں تفتیشی افسر کی
حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر
اسے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔

میں نے ڈنٹس ہاؤس کے نزدیک آکر آئی ادھر خورشید

شاہ سے کہا۔ ”شاہ صاحب! مجھے آپ سے متعدد سوالات

کرنا ہیں لیکن اس وقت میں نے عدالت سے صرف پانچ

منٹ کی مہلت لی ہے لہذا میں چار منٹ میں آپ کو فارغ

کردوں گا۔ باقی باتیں اگلی کی پیشی پر۔“

”آپ کو جیسے شیک لگے۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔

”شاہ صاحب! اس اندوہناک واقعے کی اطلاع

آپ کو کس نے اور کب دی تھی؟“ میں نے آئی او سے
استفسار کیا۔

حوالے سے آٹھ ستمبر کی سہ پہر ساڑھے پانچ بجے تھانے
میں نوٹ کیا گیا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور یہ کمال اس
فارم ہاؤس کے مالک نوادش علی کے بیٹے فیصل نے ہی تھی۔“
”آپ جانے وقوعہ پر کب پہنچے تھے؟“
”ٹھیک چھ بجے۔“

”جانتے ہی آپ نے ملزم کو گرفتار کر لیا۔“ میں نے
اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کے بعد آپ
موٹے کی کارروائی میں مصروف ہو گئے تھے۔ میں غلط تو
نہیں کہہ رہا شاہ صاحب؟“

”نہیں جناب! وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے
بولا۔ ”آپ نے جیسا بیان کیا اس روز بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔“
”شاہ صاحب!“ میں نے اپنی جرح کو اختتام سے
ہٹکنا کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ”گرفتاری کے وقت ملزم
نے کس قسم کا لباس زیب تن کر رکھا تھا؟“

”سفید اور سیاہ پچول دار قمیص، سیاہ شلوار اور سر پر
اسکارف (عجاب) پہنا ہوا تھا۔“ آئی او نے جواب دیا۔
”اس عجب کارنگ بھی بتادیں پلیز!“

”سیاہ۔“
”شکریہ شاہ صاحب!“ میں نے سرسری انداز
میں کہا۔ ”آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ اسندہ کسی پیشی پر میں
آپ کو لمبی چوڑی زحمت دینے والا ہوں۔ سو، ذہنی طور پر تیار
رہیے گا کیونکہ وہ زحمت ذہنی مشقت سے تعلق رکھتی ہے۔“

انکوائری آفیسر میری بات کے جواب میں کچھ کہنے
کے بجائے بے پردائی سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔ میں نے
جج سے مخاطب ہوتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

”جناب عالی! استغاثہ کے گواہ امجد علی کو کمرائے
عدالت میں بلایا جائے تاکہ میں اس پر اپنی جرح مکمل
کر سکوں۔“

ایک بار پھر میری فرمائش کی تکمیل کے احکامات
صادر کرنے کے بعد جج نے سپاٹ آواز میں مجھ سے کہا۔

”وکیل صاحب! ایک بات کا خیال رہے کہ عدالت
کا مقررہ وقت ختم ہونے میں صرف بیس منٹ باقی ہیں۔“

”میں آپ کی ہدایات کا خیال رکھوں گا جناب عالی!“
میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے مؤدب انداز میں کہا۔

امجد علی ڈنٹس ہاؤس میں پہنچا تو میں اس کے نزدیک
چلا گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تصدیق طلب
انداز میں پوچھا۔

”امجد صاحب! کیا آپ اب تک اپنے اس بیان پر

تائید ہیں کہ وقوعہ کی دو پہر یا سہ پہر میں دیش تین بجے آپ
نے ملزم کو تھانے کی کار میں بیٹھ کر کیس جاتے دیکھا تھا؟“
”جی ہاں۔۔۔۔۔ مجھے اپنا بیان بدلنے کی ضرورت کیا
ہے۔“ وہ برہمی بھری نظر سے مجھ سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جو
جج ہے، وہ سچ ہے اور جج کو آج نہیں۔“

”بے شک جج کو آج نہیں۔ اسی لیے میں نے آپ
کے سچ کو اپنے سوالات کی آج پر چڑھا کر پگھلانے کا فیصلہ کیا
ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”معزز عدالت جاننا
چاہتی ہے کہ وقوعہ کے روز جب آپ نے ملزم کو تھانے کی کار
میں بیٹھے دیکھا تو ملزم نے کون سا لباس پہن رکھا تھا؟“

”کالے رنگ کا شلوار قمیص۔“ گواہ نے کسی رٹو
ملوٹے کے مانند کینک سے جواب دیا۔

”اب ذرا ملزم کے گیسوؤں کا ذکر ہو جائے۔“
”کس کا ذکر ہو جائے؟“ میری بات پوری ہونے
سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

”یا تو وہ گیسو کے لفظ سے واقف نہیں تھا اور یا پھر اس
نے میری بات کو تو جسے سنایا نہیں تھا۔ بہر کیف، میں نے
وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”گیسو مطلب، سر کے بال۔ انہیں زلفیں اور کانٹل
بھی کہا جاتا ہے۔ خیر، عدالت آپ کی زبان سے یہ جاننا
چاہتی ہے کہ وقوعہ کی سہ پہر آپ نے جب ملزم کو تھانے کی
گڈی میں بیٹھے دیکھا تو اس نے اپنے بالوں کا جوڑا بنا رکھا
تھا یا بالوں میں پونی، کلیپ، کچر وغیرہ لگا رکھا تھا اور یا پھر
اس نے زلفیں کی آزاد چھچی کے مانند کھلی چھوڑ رکھی تھیں؟“

لمحاتی تذبذب کا شکار رہنے کے بعد اس نے جواب
دیا۔ ”میں نے ملزم کو کھلے بالوں کے ساتھ دیکھا تھا۔“

”اور اس کا دوپٹا؟“ میں نے گواہ کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر سرسراہٹ ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ”ملزمہ
نے دوپٹا سر پر اوڑھ رکھا تھا یا پھر گلے میں ڈال رکھا تھا؟“

گواہ نے ”گزشتہ سے پیوستہ“ کی راہ پر چلتے ہوئے
اپنے پچھلے جواب کو وسیلہ بنا کر پیچنگ بیان دیا۔ ”ملزمہ کے بال
کھلے ہوئے تھے اور اس نے اپنا دوپٹا گلے میں ڈال رکھا تھا۔“

میں کا ایک ”آپ“ سے ”تم“ پر آگیا اور استغاثہ کے
گواہ کو نفی نظر سے گھورتے ہوئے جارحانہ انداز میں کہا۔
”میں تمہیں غور و فکر کرنے کے لیے ایک لائن دے
رہا ہوں۔ تم اس لائن پر توجہ لگو دو۔ تب تک میں سر سے
بات کر لیتا ہوں۔“ پھر میں نے متذکرہ بالا لائن کو یہ آواز
بلند و برادیا۔

”اللہ کے حکام قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھانے
کے بعد ڈنٹس ہاؤس میں کھڑے ہو کر غلط بیانی کرنے والوں
کا آخرت میں کیا حشر ہوگا، یہ تو رب ہی جانتا ہے البتہ
تجزیرات پاکستان کی روشنی میں ایسے دروغ گو افراد کو وہ
سے تین سال جیل میں ضرور گزارنا پڑتے ہیں۔“ لمحاتی
توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر
روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے توانا لہجے میں کہا۔

”جناب عالی! میری مؤکلہ اور اس مقدمے کی ملزمہ
زیب النساء عرف زہبی نے سن بلوغ کو چھوٹے ہی عجب کو
اپنی عادت بلکہ اپنا شعار بنالیا تھا۔ گزشتہ لگ بھگ پندرہ
سال میں کسی نامحرم نے اس کے سر کا ایک بال نہیں دیکھا اور
اس شخص حقیقت کو عدالت میں ثابت کرنے کے لیے میں
ملزمہ کے آئس سے نصف درجن بندے پکڑ کر یہاں لاؤں
گا اور نہ ہی اپنی مؤکلہ کے محلے سے دو درجن افراد کو بطور گواہ
عدالت میں پیش کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ کام تو اللہ
بھلا کرے۔۔۔۔۔ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر
انکوائری آفیسر کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے ان الفاظ میں
اضافہ کر دیا۔

”اس کیس کے تفتیشی افسر سب انسپکٹر خورشید شاہ نے
تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ گرفتاری کے
وقت ملزمہ زہبی نے اسکارف پہن رکھا تھا۔ اس ناؤک موقع
پر میں عدالت کے سامنے ایک سنسنی خیز اور حساس سوال رکھنا
چاہوں گا کہ۔۔۔۔۔“ میں ایک بار پھر تمام ادرج سمیت تمام
حاضرین عدالت پر نگاہ ڈالنے کے بعد سگستے ہوئے جگر پاش
لہجے میں استفسار کیا۔

”کیا کوئی مجھے بتلائے گا کہ اپنے بوائے فریڈ کے
ساتھ رنگ رلیاں منانے کی خواہشمند بے شرم و بے حیا کوئی
آوارہ اور آزاد خیال لڑکی عشرت کدے میں داخل ہونے
کے بعد عجب پہننے کی ضرورت کیوں محسوس کرے گی؟“

میرے اس دل و دماغ کو ہلا دینے والے سوال نے
کورٹ روم میں موت کا سناٹا طاری کر دیا۔ وکیل استغاثہ
اور انکوائری آفیسر کی حالت دیدنی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا
جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

میں نے استغاثہ کے گواہ امجد علی کو غضب ناک نظر
سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔ ”تم نے میری دی ہوئی لائن
پر کچھ غور کیا؟“

مجھے ”ہاں“ ”نا“ ”نہ“ میں جواب دینے کے بجائے
وہ امداد طلب نظر سے کسی وکیل استغاثہ اور کئی جج کی طرف

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے قیام بخشے بعد کی تاریخ دے کر عدالت پر خاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

میں کورٹ روم سے نکلا تو حیدر علی بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں نے اتر کر نیچے پہنچے تو اس نے مجھے سے کہا۔
”بیگ صاحب! آج تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔
آپ کی وکالت کا کوئی جواب نہیں ہے۔“

”یہ بھی اچھی بات ہے حیدر صاحب!“ میں نے
بارکنگ لاف کا رخ کرتے ہوئے مقتل انداز میں کہا۔
”اور نہ اس جواب کے فٹیل میری دو کالت پر سوال بھی اٹھنے
تکتے۔ سوال اور جواب دو جڑواں بھائیوں کے مانند ہیں۔
گر جواب نہیں تو پھر سوال کیا؟“

”آپ بجا فرما رہے ہیں بیگ صاحب!“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”اللہ ہماری مدد فرما رہا ہے۔ میری زوجہ کو بہت جلد اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔۔۔۔۔ ان شاء اللہ!“

”حیدر صاحب! اللہ تو ہر حال میں اپنے بندوں کا مہربان و معاون ہے۔ بس، مخصوص کرنے کی بات ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

حیدر علی نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

اگلی پیشی پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہ پیش کیے گئے جن میں سے دو کے بیانات میں ایسی کوئی اہم بات نہیں تھی۔ سو، میں تیسرے گواہ کی طرف بڑھتا ہوں۔

کل زمان کا عمر چالیس کے قریب نہی ہوگی۔ وہ ایک قد آور اور صحت مند شخص تھا۔ کل زمان اس فارم ہاؤس کا سیکرٹری گاڑڈ، چونکہ دار اور کیئر تیکر تھا اور فارم ہاؤس کے مالک لوئس علی کا پرانا و قاردار اور نمک خوار بھی۔

فل زمان حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کر اچکا تو ویل استغاثہ جرح کے لیے ونس باکس کے نزدیک چلا گیا اور اپنے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ہوئے وقوعہ کے روز ٹرمہ کو فرار ہونے سے روکا تھا۔ اگر یہ فارم ہاؤس سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی تو سارا معاملہ ہی الٹ جاتا تھا۔“

”وکیل صاحب! میں ملزمہ کو فرار کیسے ہونے دے

سکا تھا؟“ کل زمان نے پُر جوش انداز میں کہا۔ ”بڑے مالک (نوازش علی) نے مجھے اس فارم ہاؤس کی حفاظت اور نگرانی کی ذمہ داری سونپ رکھی ہے۔ اگر اس دن لمبرہ فارم ہاؤس سے نکل جاتی تو میزے لیے یہ بڑی شرمندگی اور اسوس کی بات ہوتی۔“

”گل زمان!“ وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ”یہ عدالت جاننا چاہتی ہے کہ وقوعہ کی سہ پہر قلام ہاؤس پر دراصل کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

”اس دن دوپہر میں چھوٹے مالک (لیبل) نے مجھے فون کر کے بتایا کہ چار بیجے کے آس پاس ان کا ایک دوست اپنی لیبل کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لیے فارم آکر آئے گا۔ لیبل نے ان لوگوں کے لیے فارم ہاؤس کا ایک رُ

”میں نے چھوٹے مالک کے حکم کے مطابق ان کے مہمانوں کے لئے ایک بیڈ روم سیٹ کر دیا۔ یہ لوگ ٹھیک چار بجے

فارم ہاؤس پہنچ گئے تھے۔
 ”کون لوگ؟“ وکیل استیوار نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

”میرا مطلب ہے ہنرمند اور دلو جو ان مجھے شرم سے قتل کر دیا ہے۔“ گل زمان نے بتایا۔ ”اس کا نام غیل تھا۔“

”جھٹک ہو گیا۔“ دیکل استغاثہ نے سرسری انداز میں کہا۔ ”اس کو کون کرے گا؟“

”میں نے جھوٹے مالک کے مہمانوں کو بیڑ روم دکھانے کے بعد ان کے لیے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کیا اور غلام ہاؤس کے بیرونی حصے میں آگیا۔“ کل زمانہ اپنی

وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”آدھا پونا گھنٹا
خیریت سے گزر گیا۔ پھر میں نے گولی چلنے کی آواز سنی تو
چونک اٹھا۔ وہ آواز اسی بیڈروم کی طرف سے آئی تھی جہاں

میں نے ملازمہ اور مسئول کو عہدہ پایا تھا۔ میں نور اس طرف لپکا۔ اسی وقت میں نے ملازمہ کو اندر سے نکل کر فارم ہاؤس کے گیٹ کی سمت جاتے دیکھا۔ اس کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ میں اسے نہ دیکھ سکا۔

وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔“ وہ سانس بہوار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا۔ پھر انا الفنا میں

افساد کر دیا۔
 ”میں نے فوراٰ الزم کو اپنے قابو میں کر لیا اور کلائی
 سے پکڑ کر اسے اسی بیڈروم کی طرف لے گیا جہاں میں نے

11 اکتوبر 2024ء

زبان اردو کو جو ترقیاں لکھنؤ میں حاصل ہو گئیں وہ اس زبانوں و قارئین اور محققین ہی تک محدود رہیں گی۔
موسائیک اور بطون میں ترقی و وسعت زبان کی فنی بنیاد پیدا ہو گئی جنہوں نے ہر گرد و والوں کے لیے خاص زبان پیدا کیں۔

ان میں سے زیادہ قائل توجہ داستان گوئی ہے۔ جو دراصل بہر تعریف کرنے کا نام ہے۔ لیکن اصل میں عمل کا ہے۔ بہر جاہلیت میں بھی داستان گوئی کی جھنجھٹیں مرتب ہوا کرتی تھیں۔ ہندوستان کی داستان گوئی کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ کون کون سے قصہ خوانی سے اس کا کوئی رشتہ ہے یا نہیں۔ امیر خسرو کی جو داستان گوئی کی اصلی اور حقیقی جڑوں کا ہے، وہ دراصل جس کی اور کہیں ہے کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں امیر خسرو ایک قائل قصص نے اسے تعریف کیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ نقل کے بعد داستان گوئی امیر خسرو ہی ہو گئی۔

دہلی کے مشہور داستان گو کھنڈو میں آنا شروع ہوئے۔ یہاں
ساتنے ان کی یہاں تک قدر کی کہ داستان سننے کو اپنی محبتوں کا
اعزاز قلم قرادے لیا۔ چند ہی روز میں کھنڈو کے اندر اس کو اس
غریب سے ایک اک کوئی بابہ پتا چلا جس کے صاحب کے

[illegible]

گوئیں کو حاصل تھا۔ دہلی میں دو ایک صاحب کمال داستان کو پڑے ہیں۔ مگر لکھنؤ میں ان کا شمار بہت زیادہ ہے اور ان کا اثر مقررہ کار کا اثر عوام شہر کی زبانوں پر بے حد ہو گیا ہے۔ نادلوں

چند اہل علم کے لئے چند جہاں کی بات کی کوس کی سی
گوئی کی زبان میں قلم بند کر لیا جائے تو کھنڈ ہی ایسے
داستان گویش کر سکا جنہوں نے خیم جلدیں لکھ کر اردو وال
میں بھلا دیں۔ جتنی جہاں اور کتنا تصانیف ملک میں

داستان کے چار فن قرار پائے ہیں۔ رزم، بزم، حسن اور عیاری..... ان چاروں فنوں میں لکھنؤ کے داستان

نے ایسے ایسے کمال دکھائے ہیں جن کا اعجاز و تغیر دیکھنے والے نے نہیں ہو سکتا۔ الفاظ میں تصویر کھینچنا اور تصویروں کا تکرار اور پراثر سامعین کے دلوں پر ڈال دینا ان لوگوں کا

مولانا عبدالحلیم شرر کے مضمون سے اقتباس
مرسلہ - راجیلہ جہانگیر، مرگودھا

اكتوبر 2024

ان دونوں کو گھبراہٹ اور پھر میں نے وہاں بھیل کی لاش پڑی دیکھی۔ میں نے غصہ کو کمرے میں بند کرنے کے بعد بڑے ایک کوفٹن کیا لیکن وہ شہر میں موجود نہیں تھے۔ بہر حال، میں نے انہیں صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ انہوں نے

چھوٹے مالک کو فارم ہاؤس پر بیچ دیا۔ چھوٹے مالک نے جب ملزمہ کے پریس کی تلاش کی تو اس کے اندر مشمولہ خلی کا پھولا ہوا بیوا اور میتی سونے کی گھڑی موجود تھی۔ چھوٹے مالک نے گھڑی کو لے لیا۔

اور گھڑی پرس میں ڈال کر وہاں سے فرار ہو رہی تھی۔
چھوٹے مالک نے میری تحریف کی کہ میں نے ملزمہ کو فرار
نہیں ہونے دیا۔ اس کے بعد چھوٹے مالک نے تھانہ فوج

کر کے پولیس کو بلالیا تھا۔ بس، یہی ہے تمام کہانی۔“
خواہ نے اپنی بات مکمل کی تو وکیل استغاثہ میری
طرف مڑا اور معتدل انداز میں کہا۔ ”یو روٹس پلیر!“

میں بچ کی اجازت حاصل کرنے کے بعد وٹس باکس کے نزدیک پہنچ گیا اور میں نے ہلکے پھلکے انداز میں اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔

”یہی کوئی نو، دس سال۔“ گواہ نے جواب دیا۔
”کہا۔ سچ سے کہتم اور تمہاری بیوی زرتاج عرف

رہی اسی فارم ہاؤس میں رہتے ہو جس کے ایک بیڈروم میں آٹھ تہری کی سہ پہر معروف وفاقی وزیر کے اکلوتے بیٹے نیل کی کھوپڑی میں گولی مار کر بلکہ اس کی کھوپڑی کے اندر سے

”جی، یہ سچ ہے۔“ وہ اثبات میں گرون ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہم میاں بیوی اسی فارم ہاؤس کے اندر رہیں گے۔“

اور تم دونوں ایک بے اولاد جوڑا ہو؟“
اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”ظہور کام چھوڑ کر چلا گیا تھا؟“

اسے نوکری سے نکال دیا تھا۔“ گواہ نے میری سچ کرتے ہوئے بتایا۔ ”خیر، وقوعہ کے دس دن بعد ہم نے ایک دوسرا مالی رکھ لیا تھا۔“

”پہلے مایا ظہور حسین کو نوکری سے نکالنے کا سب

کیا تھا؟

”اس میں چوری کی بڑی عادت تھی۔“ گل زمان نے بتایا۔ ”بڑے مالک نے دو تین بار اسے معاف بھی کیا تھا لیکن جب وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تو اسے فارغ کر دیا گیا۔“

”تمہارے بڑے مالک کو ان کی صاحبہ کو ظہور حسین کی چوریوں کے بارے میں تم ہی بتایا کرتے تھے؟“

”ظاہر ہے، اور کون بتائے گا۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”جب بڑے مالک نے فارم ہاؤس کی نگرانی اور حفاظت کی ذمہ داری مجھ پر ڈال رکھی ہے تو یہ سارے معاملات مجھ ہی کو دیکھنا ہیں نا۔“

”لیکن سنئے میں آیا ہے کہ ظہور حسین تمہاری خوبصورت بیوی زری پر بڑی نگاہ رکھتا تھا؟“ میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ”اسی لیے تم اس سے بہت نارکھاتے تھے؟“

”آپ کی یہ بات درست ہے وکیل صاحب! ظہور کی نظر سلی اور نیت خراب تھی۔“ وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ”لیکن نوکری سے نکالے جانے کا سبب اس کی چوری کی عادت ہی تھی۔“

”نیامال تو دیر نہیں ہے نا؟“ میں نے معتدل انداز میں پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے چور، بد نیت اور نظر باز؟“

”نہیں جناب! سراج دین ایک پختہ عمر، پختہ ذہن، شریف انٹنس انسان ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“

”اور تمہارے بڑے مالک کو؟“

”وہ بھی سراج دین کے کام سے بہت خوش ہیں۔“

”مجھے چتا چلا ہے کہ سراج دین کے ساتھ تمہاری گڑھی جتنے لگی ہے؟“ میں نے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”تم اس سے اپنے دل کی ہر بات کر لیتے ہو۔ اسے اپنے ہر راز میں شریک کر لیتے ہو۔ تم نے سراج دین کو وہ باتیں بھی بتادی ہیں جو زوری کے علم میں بھی نہیں ہیں۔“

”ہیں نا؟“

”وکیل صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”سراج دین ہے ہی اتنا اچھا کہ اس پر بھروسہ کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن.....“

”لحائی توقف کر کے اس نے انھیں زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔“

”لیکن آپ میرے اور سراج دین کے تعلقات کے

بارے میں کیسے جانتے ہیں؟“

اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔ ”گل زمان! میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ وقوعہ کے روز فارم ہاؤس پر اصل میں ہوا کیا تھا اور حقیقت کو چھپانے کے لیے جو ڈراما رچایا گیا، اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔“

گل زمان کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر مگر رہ گیا۔ وہ پریشان نظریں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں اس کی نگاہ کے مرکز کے بارے میں دقیق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ وکیل استفسار سے مدد کا طلب کرتا یا پھر فیصل اور نقیشتی انفر سے کوئی امید باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مذکورہ تینوں افراد اس وقت عدالت میں موجود تھے۔

”آئی جیکشن اور آڑا“ وکیل استفسار نے نعرہ مستان بلند کر دیا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا یہ ڈینٹس زیر سماعت کس کو پس پشت ڈال کر فارم ہاؤس کے چوکیدار اور مالی کے باہمی خوشگوار تعلقات کو گفتگو کا موضوع بنا کر عدالت کے قیمتی وقت کے ساتھ کھلوڑا کیوں کر رہے ہیں۔ ڈینٹس کو ہدایت کی جائے کہ وہ غیر ضروری معاملات کو زیر بحث لانے سے پرہیز کرے۔“

میں اتنی دیر سے گل زمان کے ساتھ جواہر اور کھیل رہا تھا، اس کا پہلا مقصد تو فارم ہاؤس کے نئے مالی سراج دین کی نجابت، شرافت اور عمدہ قابل بھروسہ کردار کو عدالت کی نظر میں لانا تھا اور وہ بھی مخالف چار کی زبان سے۔ دوسرے میں وکیل استفسار کے صبر کے پیمانے کو چیلنا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی سے میں ان دونوں مقاصد میں صد فیصد کامیاب رہا تھا۔ وکیل استفسار کے منہ سے ”آئی جیکشن اور آڑا“ کی صدا ایسے خارج ہوئی تھی جیسے میں نے اسے انجیکٹر گرم تو سے پریشانادیا ہو۔

”آئی جیکشن سسٹینڈ!“ جج نے فیصلہ کن انداز میں کہا پھر مجھے سے مخاطب ہو کر سپاٹ آواز میں اضافہ کر دیا۔ ”بیگ صاحب! آپ اپنی جرح کو مکمل مرڈر کیس تک محدود رکھیں۔“

”جو علم جناب عالی!“ میں نے فرمانبرداری سے کہا اور دوبارہ استفسار کے گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”گل زمان!“

”میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جھاکر معتدل انداز میں پوچھا۔ ”وقوعہ کی سہ پہر میں نے مڑمہ اور مقتول کو فارم ہاؤس میں خوش آمدید کہا تھا نا؟“

”جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”کیا مقتول اپنے قدموں پر چل کر بیڈروم تک پہنچا

تھا یا تم نے سہارا دے کر اسے وہاں تک پہنچایا تھا؟“ میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے سوال کیا۔

”وہ دونوں اپنے قدموں سے چل کر، باتیں کرتے ہوئے بیڈروم تک گئے تھے اور غاصے خوش نظر آ رہے تھے۔“

”میں نے دونوں کا نہیں، صرف مقتول نیل کے بارے میں پوچھا ہے۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

”جی بالکل!“ گواہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”مقتول نیل خوش باش اپنے قدموں سے چلتے ہوئے فارم ہاؤس کے بیڈروم تک پہنچا تھا۔“

”سولہ آنے درست جواب دینے کا شکریہ۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”گل زمان! تمہوڑی دیر پہلے تم نے وکیل استفسار کے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ مڑمہ اور مقتول کو مذکورہ بیڈروم میں پہنچانے کے بعد تم نے ان کے کھانے پینے کا بندوبست بھی کیا تھا؟“

”جی، کیا تھا۔“ اس نے بڑے فخر سے بتایا۔ ”وہ دونوں ہمارے فارم ہاؤس کے مہمان تھے۔ ان کی خاطر داری کرنا مجھ پر لازم تھا اور پھر چھوٹے مالک نے بھی مجھے ان دونوں کا خیال رکھنے کا حکم دیا تھا۔“

”مقتول کے معدے سے حاصل ہونے والے مواد کی کیمیکل ٹیسٹ رپورٹ میں لکھا ہوا ہے کہ اس نے شراب پی رکھی تھی۔ اس کے بلڈ ٹیسٹ میں بھی الیکٹری کی اچھی خاصی مقدار پایا گئی ہے۔“ میں نے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا تمہارے چھوٹے مالک نے ان دونوں کا خیال رکھنے کا جو حکم دیا تھا، اس میں انہیں شراب سرو کرنا بھی شامل تھا؟“

”نہیں.....! وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔“

”کیا تم مقتول کے لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ کو چیلنج کر رہے ہو؟“ میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

”تمہارے بیان کے مطابق جب مقتول فارم ہاؤس پر پہنچا تو اپنے ہوش و حواس میں اور چاق و چوبند تھا اور اس کے ٹیسٹ کی رپورٹ بتا رہی ہے کہ اپنی موت سے پہلے مقتول نے شراب پی تھی۔“

”میں اس بارے..... میں بھلا..... کیا کہہ سکتا ہوں۔“ وہ حد درجہ گھمبے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میرے اس سوال کا جواب تو تمہی کو دینا پڑے گا گل زمان!“ میں نے زور دے کر کہا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے.....! وہ دور کی کوڑی لایا۔

”مقتول اپنے ساتھ شراب کی کوئی چھوٹی سی بوتل لے کر آیا ہوا اور میرے علم میں لائے بغیر اس نے شراب پی لی ہو۔“

”ہاں، ایسا بالکل ہو سکتا ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس صورت میں جائے وقوعہ پر یا مقتول کی گاڑی میں اور یا پھر اس کی کسی جیب میں وہ چھوٹی سی شراب کی بوتل پڑی مل جانا چاہیے تھی جس کا ذکر تم نے ابھی کیا ہے..... ہاں یا نہ؟“

”ہاں..... مل تو جانا چاہیے تھی۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”گل زمان! تم جھوٹ بول کر جس کی کو بھی بھنا چاہتے ہو، میں اسے ہرگز ہرگز نہیں بچنے دوں گا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر سنسنی خیز لہجے میں کہا پھر اپنی جرح کو دوا کر کرتے ہوئے گولہ سے پوچھا۔ ”تم نے وکیل استفسار کو بتایا ہے کہ کوئی چلنے کی آواز نے تمہیں چوڑا یا تھا اور تم اس بیڈروم کی جانب بڑھے تھے جہاں تم نے کھانا ڈیڑھ گھنٹہ پہلے مڑمہ اور مقتول کو پہنچایا تھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

”وہ جھوک گئے تھے ہوئے بولا۔“ جی۔“

”اسی وقت تم نے مڑمہ کو دوڑتے ہوئے فارم ہاؤس کے گیٹ کی جانب جاتے دیکھا تو تمہیں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا؟“ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ”وکیل استفسار کے مطابق تم نے کمال بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مڑمہ کو گرفتار ہونے سے روک دیا اور خود تمہارے بیان کے مطابق مڑمہ کو تباہ کرنے کے بعد تم اسے کلائی سے پکڑ کر اسی بیڈروم میں لے گئے جہاں ان دونوں کو تم نے ٹھہرایا تھا اور وہاں تم نے مقتول نیل کی لاش پڑی دیکھی تھی۔ تم نے انھی تھوڑی دیر پہلے وکیل استفسار کو بھی بتایا ہے نا؟ اپنی بات سے پھر نے کی کوشش اس لیے نہیں کرنا کہ عدالتی کارروائی کے ساتھ ہی تمہاری زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔“

”جی..... جیسا آپ بتا رہے ہیں، میں نے ویسایا کہا ہے۔“ اس نے جان چھڑانے کے لیے گول بول جواب دیا۔

”لیکن میں بھلا اس کی جان کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”پولیس جب جائے وقوعہ پر پہنچی تو انہیں مقتول کی لاش اس بیڈروم میں پڑی تھی جس کی جہاں تم نے اسے ٹھہرایا تھا بلکہ مقتول کی لاش مذکورہ بیڈروم سے ملحقہ چھوٹے کمرے کے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ کیا پولیس کی آمد سے پہلے تم نے اس لاش کو بیڈروم سے نکال کر دوسرے

پڑا تھا۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور آج خلاف معمول کمرائے عدالت پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ فارم ہاؤس کا مالک نواز ش علی پہلی بار عدالت میں آیا تھا۔ اس کا بیٹا فیصل بھی ساتھ تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹا مقتول کے باپ فیڈرل منسٹر کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے۔ منج کی آمد پر عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ ”ڈیفنس، اپلیز ریوسین“ منج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرے فاضل دوست بے چارے کیا پروسیڈر کریں گے۔“ وکیل استغاثہ نے طنز بہ لہجے میں کہا۔ ”انہی تک تو ان کے گواہ ہی عدالت نہیں پہنچے۔“

”بیگ صاحب! آپ کے گواہ کہاں ہیں؟“ منج نے مجھ سے پوچھا۔

”جناب عالی! میرے تین گواہ اس وقت کورٹ روم میں موجود ہیں۔“ میں نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ”جن میں سے دو گواہ غائبانہ طور پر میرے بیگ کے اندر پڑے ہیں جبکہ تیسرا گواہ پیش کاری دائیں جانب دیوار کے ساتھ ٹین شین کھڑا ہے۔“

منج نے گردن کھما کر اس سمت دیکھا جس طرف میں نے نشاندہی کی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔

”وہ تو اس کیس کے انکوائری آفیسر سب انسپکٹر خورشید شاہ ہیں؟“

”جی بالکل!“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”شاہ صاحب میرے صفائی کے حاضر گواہ ہیں جناب عالی!“ ”مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ منج نے حیرت بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ”خورشید شاہ تو استغاثہ کے نمائندے ہیں۔“

”بے شک شاہ صاحب اس کیس کے تفتیشی افسر اور استغاثہ کے نمائندے بلکہ سرپرست ہیں۔“ میں نے رساں بھرے لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں ڈیفنس کونسلر کی حیثیت سے آئی او صاحب سے سوال تو کر سکتا ہوں۔ پچھلی ایک پیشی پر میں نے اس بات کا ذکر بھی کیا تھا کہ آگے چل کر میں ان سے کئی ایک اہم سوال کرنے والا ہوں۔ میرا یہ بیان عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے۔“

”ٹھیک ہے، آپ آئی او سے سوال وجواب کرنے کا حق رکھتے ہیں مگر اس سے ان کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں

کمرے میں ڈال دیا تھا؟“ ”ایسی بات نہیں ہے وکیل صاحب!“ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ ”پھر کیسی بات ہے؟“ ”شاید میں بولکھا ہٹ میں کچھ چیزوں کو آگے بچھے کر گیا ہوں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں ٹرمہ کو کھائی سے پکڑ کر جب بیڈ روم کی طرف گیا تو میں نے ٹیبل کی لاش کو بیڈ روم کے برابر والے کمرے ہی میں دیکھا تھا مگر میں نے ٹرمہ کو بیڈ روم میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔“

”یہ تمہارا فاضل بیان ہے؟“ ”جی وکیل صاحب!“ وہ جلدی سے بولا۔

”اور یہ بھی فاضل ہے کہ تم نے مقتول کو شراب پیش نہیں کی تھی؟“ اس نے ایک بار پھر اثبات میں جواب دیا۔ ”جی بالکل۔“ ”تمہاری اور عمر رسیدہ مالی سراج دین کی دوستی بھی فولا کی طرح مضبوط ہے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم دونوں ایک دوسرے کے راز دار ہو۔۔۔۔۔۔“

”اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”دی پوائنٹ از ٹوٹی ٹوٹو رازرا!“ میں نے روئے سخن منج کی جانب موڑتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔“

عدالت کا وقت ختم ہونے میں چند منٹ رہ گئے تھے۔ میں نے اپنی جرح موقوف کی تو منج نے وکیل استغاثہ سے استفسار کیا۔ ”وکیل صاحب! آپ کے اور کتنے گواہ باقی ہیں؟“

”استغاثہ کے تمام گواہ بھگت چکے جناب عالی!“ وکیل استغاثہ نے جواب دیا۔

”بیگ صاحب! اگلی پیشی پر آپ صفائی کے گواہ پیش کریں۔“ منج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے مختصر جواب دیا۔ ”اوکے سر!“

اس کے بعد منج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ ”دی کورٹ از ایڈ جرنل!“ جیڈر علی کے دیے ہوئے دونوں بندوں قدیر خان اور سراج دین نے میری توجہ سے کہیں بڑھ کر کارکردگی دکھائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی مؤکلہ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے مجھے الگ سے صفائی کے گواہوں کا انتظام نہیں کرنا

معلومات اسلامی

س: بیل سراط کہاں واقع ہے؟

ج: جہنم کے اوپر۔

س: مرتد کسے کہتے ہیں؟

ج: وہ دین اسلام قبول کرنے کے بعد جو فرض دین اسلام سے پھر جائے۔

س: جنت کی سب سے بڑی نعمت کیا ہے؟

ج: اللہ کا دیدار۔

س: پانچ وقت کی نمازوں میں کتنی رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں؟

ج: بارہ۔

س: پانچ وقت کی نمازوں میں کُل کتنی رکعتیں پڑھی جاتی ہیں؟

ج: 48

س: وتر کی نماز فرض ہے یا سنت؟

ج: واجب ہے۔

س: مکبر کسے کہتے ہیں؟

ج: تکبیر پڑھنے والے کو۔

س: نماز میں ”قومہ“ کسے کہتے ہیں؟

ج: ذکر کو کے بعد کھڑے ہونے کو کہتے ہیں۔

س: دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کو کیا کہتے ہیں؟

ج: جہلہ۔

س: فرشتوں کو معصوم کیوں کہا جاتا ہے؟

ج: اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں گناہ کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھی۔

س: کیا جنوں اور فرشتوں میں سے بھی کوئی نبی ہے؟

ج: نہیں۔ نبی صرف انسانوں میں سے ہوتے ہیں۔

س: سب سے پہلے نبی کا نام؟

ج: حضرت آدم علیہ السلام

س: سب سے پہلے رسول کا نام؟

ج: حضرت نوح علیہ السلام۔

مرسلہ۔ سلیم قادری، پشاور

آئے گا۔“ منج نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ”وہ ہر صورت میں اس کیس کے انکوائری آفیسر ہی رہیں گے۔ آپ انہیں صفائی کا گواہ ہرگز نہیں کہہ سکتے۔“

”ٹھیک ہے جناب عالی!“ میں نے پسائی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس کیس کے تفتیشی افسر محترم خورشید شاہ صاحب سے چند سوالات کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔“

”اجازت ہے۔“ منج نے مقتول انداز میں کہا۔

میں نے اپنے بیگ میں سے دو پھولے ہوئے پھولے رنگ کے لفافے نکال کر منج کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے بڑے ادب سے کہا۔

”جناب عالی! آج کی عدالتی کارروائی کے اختتام تک میں اپنے ان دو غائب صفائی کے گواہوں کو اناتنا آپ کے پاس رکھوانا چاہتا ہوں۔ مجھے امید تو نہیں کہ کبھی مرحلے پر ان کی ضرورت پیش آئے گی لیکن بعض اوقات انسان کی امیدیں ٹوٹ بھی جایا کرتی ہیں۔ آپ اسے حفظ بالقرم کی پالیسی سمجھ لیں۔“

منج نے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔ ”ان لفافوں کے اندر کیا ہے؟“

”ایک لفافے میں آڈیو کیسٹ ہے جس کو پہلے کرنے کے بعد دو جگہ یاروں سراج دین اور گل زمان کی راز دارانہ گفتگو سنی جاسکتی ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ان دونوں کی باتوں سے ظاہر ہو جائے گا کہ میری مؤکلہ کا بیان صد فیصد درست تھا۔“ فیصل اور ٹیبل نے اپنی عیاشی کے لیے ٹرمہ کو اٹھا کر وا کے اس فارم ہاؤس پر پہنچایا تھا اور دوسرے لفافے میں.....!“ میں نے لمبائی توقف کر کے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اس لفافے میں نوید احمد نامی اس رکشا ڈرائیور کی پوسٹ کارڈ سائز تصویر، اس کے رکشا کا نمبر، رکشا کے کاغذات کی کاپیاں، ڈرائیونگ لائسنس کی کاپی، گھر کا مکمل پتہ اور دیگر اہم معلومات بند ہیں جو تو قہر کے روز ٹرمہ کو آئی

آئی چندر گپت روڈ سے اغوا کر کے مقتول ٹیبل کی گاڑی تک لے کر گیا تھا۔ نوید احمد کافی عرصے سے مقتول اور اس کے دوست فیصل کے لیے کام کر رہا تھا اور اس کا طریقہ واردات وہی تھا..... باڈی اسپرے اور مختلف قسم کے ستے پر فیوز بیچنے کا بہانہ۔“

منج کا ہنسنے سے بغیر میں وٹنس باکس کی جانب بڑھ گیا

منج کا ہنسنے سے بغیر میں وٹنس باکس کی جانب بڑھ گیا

منج کا ہنسنے سے بغیر میں وٹنس باکس کی جانب بڑھ گیا

منج کا ہنسنے سے بغیر میں وٹنس باکس کی جانب بڑھ گیا

منج کا ہنسنے سے بغیر میں وٹنس باکس کی جانب بڑھ گیا

منج کا ہنسنے سے بغیر میں وٹنس باکس کی جانب بڑھ گیا

جہاں اس کیس کا تقاضا تھا۔ اس پر خورشید شاہ میر اختیار کر رہا تھا۔
میں نے آئی او کو مخاطب کرتے ہوئے مقتول انداز میں یوں شروع کیا۔

”شاہ صاحب! آپ نے جو چالان عدالت میں دائر کیا تھا، اس چارج شیٹ کے ساتھ ملزم کے فکس پرٹش کی رپورٹ موجود نہیں ہے حالانکہ اگر میری موکلہ نے نیل نامی اس نوجوان کو قتل کیا ہے تو آؤ قتل، مقتول کے بڑے، اس کی سونے کی گھڑی اور اس کمرے کے متعدد مقامات پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات کا پایا جانا لازم تھا جہاں مقتول کو قتل کیا گیا تھا۔ نمبر دو... مقتول کی موت پانچ اور چھ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور ملزم کو ٹھیک چھ بجے پولیس نے گرفتار کیا تھا۔ اس دوران میں ملزم کو اپنے ہاتھ دھونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اگر گرفتاری کے فوراً بعد ملزم کے ہاتھوں کا پیرافن (paraffin) ٹیسٹ کیا جاتا تو یہ معلوم کیا جاسکتا تھا کہ اس نے گن چلائی تھی یا نہیں۔ استغاثہ کی ان تمام کوتاہیوں، غفلتوں اور نالائقیوں کو ایک طرف رکھ کر میں آپ سے صرف پوسٹ مارٹم رپورٹ کے حوالے سے چند سوالات کرنا چاہوں گا۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر آئی او سے سوال کیا۔

”شاہ صاحب! آپ پوسٹ مارٹم رپورٹ پر تو یقین رکھتے ہیں نا؟“

”سٹنڈرڈ اینڈ ٹین پرسنٹ!“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”آپ نے مقتول کی لاش کا معائنہ کیا تھا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مقتول کا قدرتنا تھا؟“

”چھف دواچ۔“ اس نے جواب دیا۔

”پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول پر پوائنٹ بلیک ریج سے فائر کیا گیا تھا۔“ میں نے آئی او کے گرد اپنی جرح کا گمیرا اٹک کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟“

”جی بالکل۔“

”مذکورہ رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ گولی مقتول کی پیشانی سے ٹکرائی اور بھول ٹھنڈے ناک کی سیدھ میں سفر کرتے ہوئے اس کی کھوپڑی کے مٹی سے باہر نکل گئی۔“ میں نے کہا۔ ”مقتول کے سر کے اندر گولی کی حرکت خط مستقیم میں تھی۔ آپ نے جانے دوغہ پر مقتول کی لاش خصوصاً اس کے سر کا باریک بینی سے جائزہ لیا تھا۔ آپ سے

میر سوال یہ ہے کہ کیا گولی نے واقعہ مقتول کی کھوپڑی کے اندر اپنا زور اور ذرا سا بھی تبدیل نہیں کیا تھا؟“

”جی نہیں، بالکل نہیں۔“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔

میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے درزیوں کا ٹاپ لینے والا فیتا (انچی ٹیپ) نکالا اور آئی او کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”شاہ جی! میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ کپڑے سے باہر آئیں اور اس فیتے سے ملزم زینبی کا قدناپ کر مہمت سے لوگوں پر احسان عظیم فرمائیں۔ ان لوگوں میں، میں بھی شامل ہوں۔“

میری اس عجیب و غریب فرمائش پر آئی او الجھن کا شکار نظر آیا تاہم اس نے ایکوز ڈاکس میں کھڑی ملزم زینبی کا قدناپ کے بعد یہ آواز بلند کیا۔
”پانچ فٹ ایک انچ!“

”جناب عالی!“ میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے یہ آواز بلند کیا۔ ”پانچ فٹ ایک انچ قامت کی مالک ملزمہ اتنی گھوڑیج سے ایک چھ فٹ دو انچ قد کے نوجوان پر اس طرح گولی چلائی نہیں سکتی کہ گولی ذرا سا بھی زاویہ تبدیل کے بغیر کھوپڑی کے آرد پار ہو جائے۔ یہ کام کسی ایسے شخص کا ہے جو کم دیش مقتول ہی کے جتنا قدر کھتا تھا۔ دیش آل رور آؤ!“

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر کورٹ دوم کے اندر ایک بھونچال سا آگیا۔ اسی طوفان کے اندر میں نے فیڈرل مشر کو صنعت کار نوآزش ملی کے بیٹے پر چیتے ہونے دیکھا اور سنا۔

”حرام زادے.....!“ وہ فیصل سے مخاطب تھا۔

”تم ہی میرے بیٹے کے قاتل ہو۔ تم نے میرا ٹین اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا نہیں۔“

اس کے بعد کراسے عدالت میں اور کیا کیا ہوا ہوگا، آپ اس کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ نوآزش ملی اور وفاقی وزیر کے درمیان بعد ازاں کون کون سے قانونی معرکے ہوئے، یہ ایک الگ داستان ہے جو پھر بھی انہی صفحات پر آپ کو پڑھنے کو مل جائے گی۔ میرا فوکس اپنے مقصد پر تھا کہ مجھے اپنی موکلہ کو بے گناہ ثابت کرنا ہے اور میں نے اپنا یہ مقصد پایا تھا۔

میں نے اس فیڈرل مشر کو ہرگز یہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ فیصل نے نیل کو موت کے گھاٹ اتار کر اس کا ٹین نہیں اجاڑا تھا بلکہ اس بربادی کی داغ بیل تو اسی وقت ڈل گئی تھی جب اس نے اپنے بیٹے کے کالے کرتوتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

(تحریر: خدام بٹ)

اسم گل

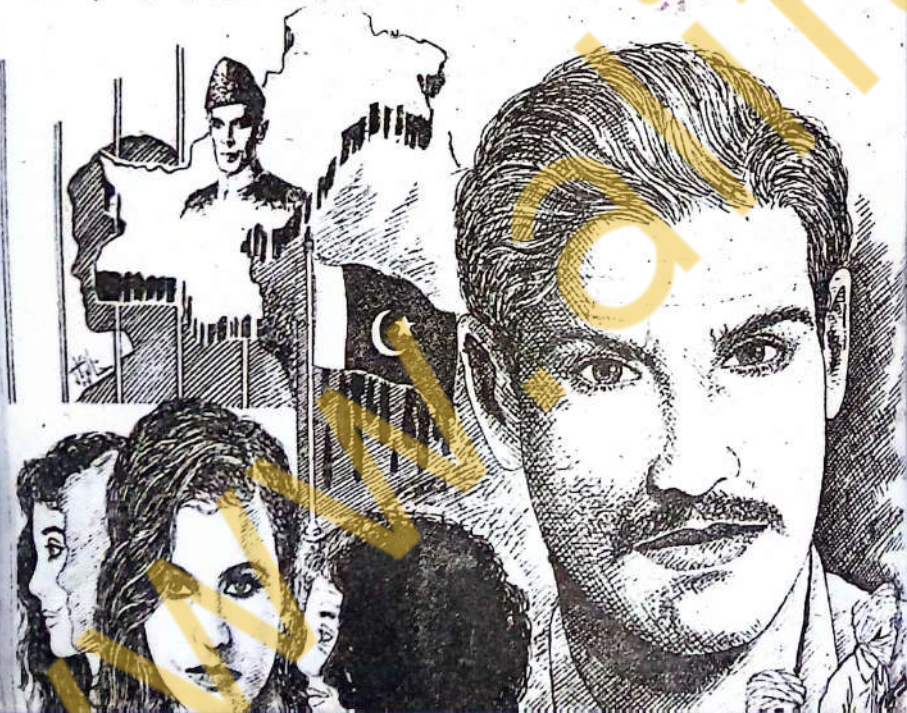
ناہید سلطانہ اختر

ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا اپنا گھر ہو... جسے وہ سچائے، سنوارے... اور جس طرح مرضی چاہے رہ لے... مگر وہ دکھ کے کتنے کنپن لمحے ہوتے ہیں جب اسے اپنے ہی ہاتھوں سے بنائے ہوئے آشیاں سے بے دخل کر دیا جائے... جس جگہ انسان کی پیدائش... کھیلنے کودنے... بڑھتی عمر کے ساتھ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی تگ و دو... کسی کی محبت کے یادگار لمحات وابستہ ہوں... اور ایک دن اس سے ان قیمتی یادوں کی متاع ہی چھین لی جائے... اسے اس کی جنت سے نکل جانے پر مجبور کر دیا جائے وہ وقت کتنا مشکل ہوتا ہے... وہ بھی مجبور تھے اپنا گھر... اپنا شہر... اپنے لوگوں کو چھوڑ کر ایک انجانی مسافت کی طرف ہجرت کرنے پر۔

موسم گل کا انتظار کرتے کرتے مایوسیوں کے اندھیروں

میں بھٹکنے والے چند بد نصیب مسافروں کی دنگل داستان

ہجرت کا دکھ کوئی علی حسن سے پوچھتا۔ پہلی ہجرت کے وقت وہ بچہ تھا مگر اس ہجرت کی صعوبتوں کی موبہم یادیں ساری زندگی اس کی یادوں کی اسکرین پر نشتر کر رہی تھیں۔ تقسیم کے ہنگاموں میں ہندو بلوایوں کے خوف سے ٹلی حین کا باپ اپنا ہجر پڑا گھر چھوڑ کر بیوی اور تین بچوں کے ساتھ ہجرت کر کے ہندوستان سے اپنے نو آزاد وطن پاکستان کے اولین دارالخلافہ کراچی پہنچا تھا۔ کراچی ان دنوں نہایت ہانکا جھیلنا سا شہر تھا۔ سندر



”کیا لوگ نک کرتے ہیں تمہیں؟“ اس نے اپنے بچوں کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے دوسرے بچوں سے پوچھا۔ ان سب کے سر ہل گئے۔

”بڑی بات ہے بچو! آپ سب بہن بھائی ہو۔ بہن بھائی مل جل کر پیار و محبت سے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو تنگ توڑی کرتے ہیں۔ چلو شاپ! ہاتھ ملاؤ ایک دوسرے سے۔“

ڈرے سے کھڑے بچے پہلے جھپٹکے پھر ایک دوسرے کو کھنکھناتے دیکھتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے آگے بڑھے اور علی حسن اور اس کے بھائی بہن سے ہاتھ ملانے لگے۔

”آئندہ کبھی ان سے پیسے بھی مت چھیننا۔ یہ پڑھنے کے لیے اسکول جاتے ہیں۔ آدھی چھٹی میں انہیں بھوک لگتی ہے۔ تم لوگ ان سے پیسے چھین لیتے ہو تو یہ پوری چھٹی تک بھوکے رہتے ہیں۔ بڑی بات بیٹا! ایسا نہیں کرتے۔ آئندہ دوست بن کر رہو گے نا؟“

ان سب کے سر اٹھاتے ہوئے۔

”شاپ! شاپ!“ علی حسن کے باپ نے ان میں سے ہر ایک کا باری باری سر چھتھایا۔

ان سب نے باری باری علی حسن اور اس کے بھائی بہن سے ہاتھ ملا اور یگانگت کی فضا میں ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ اس دن کے بعد علی حسن اور اس کے بہن بھائی کو کبھی صحت سے تو دیکھتے تھے، تنگ نہ کرتے تھے۔

☆☆☆

وقت گزرنے کے ساتھ حالات بہتر ہو گئے۔ مقامی افراد نے ہجرت کر کے آنے والوں کے لیے اپنے دل اور سوجھ بوجھ کشادگی پیدا کر لی اور آنے والوں نے اپنی حکمت اور مال مال تہذیبی ورثے کے باعث نئے وطن میں اپنی واضح شناخت بنالی۔

علی حسن کا باپ زیادہ نہیں مگر تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا۔ ماں کہنے کو ان پڑھ مگر نہایت دور اندیش تھی۔ دونوں کو تعلیم کی اہمیت کا ادراک تھا۔ جانتے تھے کہ آنے والے وقت میں تعلیم سب کا رائج الوقت ہوگی۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کو مقدم رکھا۔ تینوں ہی لائق تھے۔ والدین کی دلچسپی اور راہنمائی نے انہیں سختی بنایا۔ باپ ان کی مادی ضرورتیں پوری کرنے کی کوشش کیے ساتھ ان کے لیے ایک متوازن رول ماڈل بننے کی کوشش کرتا۔ ماں گھر کا نظام درست رکھتی اور گھر میں عمدہ تہذیبی ماحول فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتی۔ اپنی اپنی جماعت میں بہترین تعلیمی

کارکردگی کا مظاہرہ ان کا جنون قرار پا گیا۔ امتحانی نتائج کا اعلان ہوتا تو تینوں بہن بھائیوں کے ہاتھ میں اول آنے کا انعام ہوتا اور ان کے چہرے خوشی سے تباہاں ہوتے۔ علی حسن کا باپ کبھی ضرور تاجپوش کے اسکول جاتا تو اسے بچوں کے حوالے سے نہایت احترام ملتا۔

اسکول، کانچ پھر پیشہ ورانہ تعلیم کے اداروں سے گزر کر علی حسن انجینئر بن گیا اور اس کا بھائی ڈاکٹر۔ بہن جس نے ماسٹر کیا تھا، ایک تعلیمی ادارے سے وابستہ ہو گئی۔

اب حالات علی حسن کے گھر کے بھی بہتر تھے اور ملکی حالات بھی شیک ہی تھے۔ علی حسن کے باپ نے اپنا گھر بنالیا تھا۔ اب ان کی رہائش تین بیڑ روڑ کے ایک مکان میں تھی جہاں متوسط گھرانے کو مطلوب سہولیات موجود تھیں۔ تینوں بچوں کے برسر روزگار ہو جانے سے گھر میں خوشحالی بھی تھی۔ علی حسن کے والدین کو اب بچوں کی شادی کا ارمان تھا۔ ماں بہن تھی، پہلے بیٹی کی رخصتی ہو پھر بھائی گھر لائی جائیں۔

چھوٹے بیٹے ذکی حسن نے میڈیکل کالج میں تعلیم کے دوران اپنے ساتھ پڑھنے والی ایک لڑکی رویہ کو پسند کر کے والدین کی گواہی آدھی ڈے داری خود لے لی تھی۔ ماں باپ کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ زندگی جنہوں نے اکٹھے گزار لی ہے، وہ خود ہی ایک دوسرے کا انتخاب کریں تو اس سے اچھی بات کیا۔ علی حسن کو انتخاب کی کوئی جلدی نہ تھی۔ ماں باپ، عائشہ کے لیے کسی اچھے برکی دعا بھی کرتے تھے، تلاش بھی۔

بالآخر عائشہ کے لیے ایک رشتے والی کے ذریعے ایک مناسب رشتہ آیا۔ وہ تہذیب جدا تھی، زبان جدا تھی مگر یہ کوئی انہونی نہ تھی۔ برسوں کے اکٹھے سفر نے زبان اور تہذیب کے فرق کو مٹا دیا تھا۔ علی حسن کے والدین نے اپنے پرائیوٹ میں ایسی بے شمار شادیاں جوئے دیکھی تھیں۔ علی حسن کے والدین نے بیٹی کے لیے وہ رشتہ منظور کر لیا اور شادی ہو گئی۔

علی حسن کی شادی انجینئرنگ کے پروفیسر کی بیٹی سے ہوئی۔ زمانہ طالب علمی کے ایک پروفیسر کی بیٹی رانفہ سے ہوئی۔ پروفیسر صاحب نے بیٹی کے رشتے کے لیے خود علی حسن سے بات کی اور بیٹی کا رشتہ لے کر بخش تیس علی حسن کے گھر آئے۔ زمانہ بہت بدل گیا تھا۔ یہ کہنا مناسب کہ الٹ گیا تھا۔ علی حسن کے والدین کی جوتیاں لڑکی کی تلاش میں گس جاتی تھیں اور اپنے قریبی رشتے داروں سے بھی بیٹی کے رشتے کی بات کرنا محبوب سمجھا جاتا تھا۔ اب لڑکی والے خود

بیٹی کا رشتہ لے کر لڑکے کے گھر پہنچنے لگے تھے۔ علی حسن کے والد نے اس کے پروفیسر کو نہایت تحکیم دی اور علی حسن کے لیے ان کی بیٹی کو اپنی بہو بنالیا۔

ذکی حسن کی شادی بھی اس کی پسند کی لڑکی رویہ سے ہوئی۔ دونوں خوش تھے کہ ان کی باہمی پسند کو والدین نے قبولیت کا درجہ دے کر انہیں ایک دوسرے کا شریک زندگی بنانے میں روڑے نہیں اٹکائے تھے۔

☆☆☆

آنے والے برسوں میں معاشرت نے بہت رنگ بدلے۔ وہ معاشرہ جس کا حسن بزرگوں کی روایات تھیں، دھیرے دھیرے اس حسن سے محروم ہونے لگا۔ پسندیدہ اقدار معاشرت نا پسندیدہ قرار پا گئیں اور نا پسندیدہ کو قدر مل گئی۔ نئی نسل جسے اپنے بزرگوں کی روایات کا اٹین ہونا چاہیے تھا، خیانت پر مائل ہو گئی۔ معاشرے کی صورت ایسی بدلی کہ زندگی کچھ سے کچھ ہو گئی۔

تاہم ان بدلتے معاشرتی حالات میں بہت سے دامن بچا کر چلنے والے بھی تھے۔ علی حسن ایسا ہی گھرانہ بھی انہی میں سے تھا۔ علی حسن کے پانچ بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور تین بیٹے۔ شاہ میر سب سے بڑا تھا، پھر رانفہ تھی، اس کے بعد شہیر پھر عائشہ اور سب سے چھوٹا تھویر۔ علی حسن اور رانفہ کو پون تو اپنے پانچوں بچے ہی بے حد عزیز تھے لیکن شہیر سے انہیں خصوصی اور غیر معمولی انس تھا اور اس کی دلچسپی۔

شہیر پیدائشی طور پر پیڑ یا ٹرک برین ٹیور..... بچوں کی دماغی رسائی کا شکار تھا۔ بچوں میں دماغی رسائی کا علاج کرنے والے نیوروسرجن کی رائے تھی کہ اگر دوا اور تاپکاری سے شہیر کا علاج نہ ہو سکا تو جراحی کرنا پڑے گی جس میں صحت یابی بھی ہو سکتی تھی اور خدا نا خواستہ شہیر کی زندگی بھی داؤ پر لگ سکتی تھی۔ پہلے مرٹے میں دواؤں اور تاپکاری سے علاج شروع ہوا۔ علی حسن اور رانفہ نے وظائف اور دعاؤں کی ذور تمام کی۔ بہت مشکل وقت تھا مگر علاج معالجے کے ساتھ ماں باپ کی دعاؤں نے کام دکھایا۔ شہیر کے معالج کا کہنا تھا کہ شہیر جس درجے کی دماغی رسائی میں مبتلا تھا، اس کا جراحی کے بغیر ہی شیک ہو جانا معجزہ تھا۔ اس معجزے نے علی حسن اور رانفہ کے دل میں شہیر کے لیے اس کے بھائی بہنوں کی نسبت زیادہ جگہ بنالی تھی۔ بچپن میں تو وہ ان دونوں کا ڈار رہا ہی تھا، جوان ہو کر بھی سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر ماں اور باپ دونوں کی جان پر ہن جاتی۔

علی حسن اور رانفہ نے پون تو اپنے پانچوں بچوں کی تعلیم پر توجہ رکھی تھی تاہم شہیر کی پیدائشی حالات اور بعد میں بھی کمزوری صحت کی وجہ سے اس پر پڑھائی کا زیادہ بوجھ ڈالنے سے گریز کیا تھا۔ بڑا بیٹا شاہ میر انجینئر تھا اور ایک مقامی ادارے میں ملازم۔ رانفہ آرکیٹیکٹ تھی۔ علی حسن کے ایک دوست کے بیٹے سے شادی کے بعد وہ نیوزی لینڈ چلی گئی تھی۔ شہیر کی کام کے بعد ایک مقامی بینک میں ملازمت کر رہا تھا۔ عائشہ اور تھویر دونوں نے اپنے لیے طب کا میدان منتخب کیا تھا۔ عائشہ ہاکس جاب کر رہی تھی۔ تھویر میڈیکل کالج میں تعلیم کے آخری مرحلے میں تھا۔ علی حسن اور رانفہ خوش تھے کہ اولاد کی تعلیم و تربیت پر ان کی توجہ بار آور ثابت ہوئی تھی۔ ایک بیٹی کو اس کے گھر بار کا کرنے کے بعد وہ باقی چار بچوں کے لیے بھی نیک خواہشات رکھتے تھے۔

☆☆☆

وطن کے لیے قربانیاں دے کر آنے والوں اور ان کی اگلی نسل کے لیے دقت کے ساتھ حالات اگرچہ بہتر ہو گئے تھے مگر ان کے حقوق اب بھی اکثر پامال کرنے کی کوشش کی جاتی۔ وطن کے لیے اپنا خون بہانے والوں نے نا انصافی کے خلاف علم اٹھالیا۔ علی حسن کو آج بھی وہ وقت یاد تھا جب صبح کو اسکول جاتے وقت اور بھی کبھی دوپہر کو گھر واپسی کے وقت بھی مقامی بچے اسے اور اس کے بھائی بہن کو روک کر ان کے گریبان پکڑتے ہوئے ”پناہ گیر“ کہا کرتے تھے۔

ان پناہ گیروں اور ان کی اگلی نسل نے اپنے تہذیبی ورثے، علم اور لیاقت کے بل بوتے پر وطن عزیز میں اپنا نقشہ بنایا۔ پناہ گیری سے جہاں گیری کا خواب اپنی آنکھوں میں سمویا لیکن اس خواب کو تعبیر کرنے کی راہ میں کچھ انہوں اور کچھ غیروں کی ریشہ دوانیوں نے وہ کانٹے بچھائے کہ خواب نذاب بن گئے۔ پھٹا پھٹا خون چمن وشت بے اماں بن گیا، گھر متزلزل بن گئے۔ گھر سے باہر جانے والوں کی تو خیر رہی ہی نہ تھی، گھر کے اندر رہنے والے بھی بے اماں ہو گئے۔

رمضان کا آخری عشرہ تھا۔ عید کا تہوار نزدیک تھا۔ علی حسن اپنے گھر کے نزدیک واقع مسجد میں اپنے خیمہ جوان بیٹوں کے ساتھ نماز عشاء اور ترواٹ ادا کرنے کے بعد گھر واپس لوٹا تو کھٹنی بجانے پر حسب معمول گھر کی ملازم لڑکے نے گیت کھولا۔ علی حسن اور اس کے تینوں بیٹے گھر میں داخل ہو کر اندر جا ہی رہے تھے کہ گیٹ بند کرنے ملازم لڑکے کو

ہندو کی نوک پر لے کر چار اسلحہ بردار نقاب پوش بھی اندر آگئے اور انہوں نے علی حسن اور اس کے تین بیٹوں کو بھی ہاتھ اٹھا دیئے پر مجبور کر دیا۔ سب کو اندر لے گئے۔ مردوں کو دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کر دیا۔ رافضہ کو ماں کہہ کر تخت پر بٹھا دیا۔ عاتکہ کو ان میں سے ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ دیگر دو میں سے ایک مردوں کو ہندو کی نال پر لے رہا، باقی دو گھر کی تلاشی اور لوٹ مار کرنے لگے۔

علی حسن نے ہمت کر کے مردہ ہی آواز میں کہا۔ ”جو لیتا ہے، لے جاؤ۔ میرے بچوں کو نقصان نہ پہنچانا۔“

جواب ملا۔ ”چپ کر بڑھ!“

پھر کافی دیر لوٹ مار کرنے والے کھٹ پٹ کرتے رہے۔ رافضہ سے منتقل الماری کی چابی مانگی، جو انہیں سیٹا تھا سمیٹ لیا۔ کمرے کی طرف سے عاتکہ کی کھٹی کھٹی چیخ سنائی دی تو رافضہ تخت پر ڈھس گئی۔ علی حسن کی ٹانگیں لرزیں اور وہ نیچے گر گیا۔ تین بیٹوں نے حرکت میں آنے کی کوشش کی تو ان پر پیرا دیئے اسلحہ بردار نے کہا۔ ”خبردار! ہلنا مت۔“

شعبہ اس کی ڈانٹ کو خاطر میں نہ لایا۔ پلٹا۔ اور اس نے مزاحمت کرتے ہوئے بہن کی طرف جانا چاہا۔

ترتر ترتر۔۔۔ ہندو کے گولیاں نکلیں اور شعبہ کے کمزور جسم کے پار ہو گئیں۔ ہمسایہ گھروں میں کھڑکیاں، دروازے بند اور بتیاں گل ہو گئیں۔ شہر کی سسوم فشاںیں یہی دتیرہ بن گیا تھا۔

تو ان کون تھے، کہاں سے آئے تھے؟ کچھ معلوم نہ تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے میں علی حسن کے گھر کی آباد دنیا کو تاراج کر کے بھاگ نکلے۔ شعبہ کا مردہ جسم۔۔۔ اور۔۔۔ عاتکہ کا وحشت زدہ بکھرا ہوا جو علی حسن کی تو دنیا پا پاں ہو گئی۔ شعبہ تو اس کا اور اس کی بیوی کا دھڑکنے والا تھا۔

خاتم نہایت بے دردی اور ہیبت سے اسے موت کی نیند سلا گئے تھے۔ علی حسن اور رافضہ کے دل کی تو دھڑکن ہی گویا معدوم ہو گئی تھی۔ اور اس پر مستزاد عاتکہ کے وجود پر طاری وحشت!

حادثہ نہیں، قیامت تھی۔ ایک ہستے ہستے گھرانے کو بلا سبب غم کی آفتاب تاریکی میں دھکیل دینا۔ رافضہ کو چپ لگ گئی۔ عاتکہ اپنے باپ اور بھائیوں سے نظریں چراتی بھرتی۔ اس نے ہاؤس جاب بھی ترک کر دی تھی۔ شعبہ کی موت سے دونوں بھائی بھی بے حد دل گرفتہ تھے۔ تو برا کٹر پاؤں پیچ کر جھپٹا ہٹ سے کہتا۔ ”دو تو خوار بہت معصوم اور بے ضرر مسابھائی تھا۔ اس نے کسی کا کیا کڑا تھا یا!“

وہ چار معلوم افراد جنہوں نے علی حسن کے گھرانے کو الم گزیدہ کر دیا تھا، کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کچھ پتا نہ چل سکا۔

عروس البلاد جس نے علی حسن اور اس کے گھر والوں کو اس وقت پناہ دی تھی جب وہ مہاجرت کی بے پناہ صعوبتوں سے گزر رہے تھے۔ علی حسن اور اس کے بال بچوں کا اس شہر سے دل اٹھ گیا۔ بیٹے بار بار کہتے۔ ”ابا! یہاں نہیں رہنا، کہیں اور چلیں۔“

عاتکہ کی آنکھوں سے بھی یہی کچھ جھلکتا۔ فقط رافضہ تھی جو دل گرفتگی سے کہتی۔ ”میرا بچہ شعبہ تو یہیں سو رہا ہے۔ اسے چھوڑ کر میں کہیں اور کیسے چلی جاؤں؟“

علی حسن نے اسے سمجھایا۔ ”بچے یہاں نہیں رہنا چاہتے رافضہ! ان کا دل اچاٹ ہو گیا ہے یہاں سے۔ کسی سکون کی جگہ چلتے ہیں۔“

رافضہ نے اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے علی حسن کو دیکھا اور بولی۔ ”شعبہ کے بعد کہیں سکون ہے؟“

”عاتکہ کو دیکھو، شعبہ میرا اور توہر کا خیال کرو۔ ہندوستان میں اتنی بڑی حویلی اور دوسری جا مکاں ہیں جسے والد صاحب کی۔ صرف اپنے بچوں کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر چلے آئے تھے یہاں۔ ہمیں بھی اپنے بچوں کی خاطر ہی جینا ہے۔“

شاہ میر کے ادارے کا ذیلی دفتر اسلام آباد میں بھی تھا۔ اس کا تبادلہ وہاں ممکن تھا۔ کوشش سے عاتکہ اور توہر کے نقلی مراحل کی تکمیل بھی اسلام آباد میں ممکن ہو سکتی تھی۔ بڑی بیٹی رابعہ بھی جو والدین اور بہن بھائیوں کا دکھ بٹانے کو کچھ عرصے کے لیے پاکستان آئی ہوئی تھی، اسی حق میں ہوئی کہ ان سب کو اسلام آباد منتقل ہو جانا چاہیے۔

جس شہر میں علی حسن کا بچپن اور جوانی گزری تھی، اسے خیر باد کہہ کر کہیں اور جانا خود علی حسن کے لیے بھی دل چیرا کر دینے والا مرحلہ تھا۔ قلمی بہت سی یادیں والہانہ تھیں اس کی عروس البلاد سے۔ یہاں اس نے اپنی ملازمت کے اڑتیس سال گزارے تھے۔ اس سانسے سے دو ماہ قبل ہی تو وہ ملازمت سے سبکدوش ہوا تھا۔ سوچتا تھا اب ایک ایک کر کے بچوں کے گھر بنانے کی خوشی دیکھے گا، بیہودیں گھر آئیں گی، چھوٹی بیٹی کو وداع کرے گا۔ وہ اور رافضہ اپنے بچوں کے بچے دیکھیں گے۔ زندگی گل و گلزار ہوگی مگر۔۔۔!

اسلام آباد نقل مکانی سے علی حسن نے اکیلے ہی اسلام آباد کا پھیرا لگایا۔ رہائش کا انتظام بھی تو کرنا تھا۔ ایک نوآبادی میں اس نے کرائے پر مکان لینے کا معاملہ طے

کر لیا۔ عاتکہ کی ہاؤس جاب اور توہر کی بقیعہ تعلیم اسلام آباد میں مکمل کرانے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ توہر کے لیے ہاسٹل میں رہ کر اپنی باقی تعلیم وہیں مکمل کرنا ضروری ہوا۔ رافضہ کو توہر کا گھر والوں سے دور ہاسٹل میں رہنا گوارا نہ تھا مگر مجبوری تھی۔

ریل کے چار نفیسی سلیر میں اپنے اہل خانہ اور اسباب سفر سمیت سفر کے دوران علی حسن کا دل بری طرح دکھتا رہا۔ رافضہ، شاہ میر، عاتکہ، سب کو چپ لگی تھی اور آنکھوں میں اداسی تھی۔ شاہ میر اور عاتکہ سلیر کی کھڑکی کے نزدیک بیٹھے مسلسل باہر دیکھتے جا رہے تھے۔ کھانے کے وقت رافضہ نے ڈسپوزیبل پلیٹ میں انہیں کھانا نکال کر دیا تو انہوں نے تھوڑا تھوڑا کھا کر چھوڑ دیا۔ شاہ میر اور عاتکہ اپنی اپنی برتن پر اوپر جا کر لیٹ گئے تو رافضہ بھی سر کے نیچے تکیہ رکھ کر پڑ گئی۔ علی حسن بیٹھا رہا۔ اسے نہ جانے کب کب کی پرانی باتیں یاد آرہی تھیں۔ تقسیم کے بعد نو آزاد وطن کی جاب سفر کرتے وقت وہ بچہ تھا مگر اس سفر کی دھندلی دھندلی یادیں اب بھی اس کے ذہن کے پردے پر متم تھیں۔ تب بھی ایسی ہی خاموشی اور اداسی تھی۔ ہجرت کا دکھ بھی عجیب ہوتا ہے۔

شاہ میر نہ جانے کب سو گیا۔ رافضہ بھی کروٹ لے کر شاید سوئی گئی تھی۔ اوپر کی برتن سے ایک چمبی ڈائری نیچے گری تو علی حسن نے اٹھائی۔ ڈائری میں جہاں بال پوائنٹ قلم لگا کر لکھا گیا تھا، وہاں ایک صفحے پر قطعہ موجود تھا۔

کون کہتا ہے شہر چھوڑ گیا ہوں جاناں شہر تو رگ کی طرح جاں میں میری بستا ہے تجھ سے ہے عہد وفا وہ مجھے نبھاتا ہے جاؤں جس اور بھی دل میں تو ہی بستا ہے

شاہ میر کی ہینڈ رائٹنگ علی حسن بخوبی پہچانتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شاہ میر اپنی ایک یونیورسٹی ٹیوٹر کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار رافضہ پر کر چکا تھا۔ علی حسن نے ڈائری اوپر کی برتن پر سوئے شاہ میر کے سینے پر رکھ دی۔ مہاجرت میں آدمی کو کیسے کیسے جذباتی صدموں سے گزرنا پڑتا ہے۔

☆☆☆

نئے شہر میں پاؤں جمانے میں کچھ وقت لگا۔ کراچی سے اسلام آباد نقل مکانی کی تیاری کے دوران علی حسن کے ایک دوست نے اس سے کہا تھا۔ ”بھائی میاں! کہاں جا رہے ہو۔ اسلام آباد ڈیڑھ سٹی ہے، ڈیڑھ۔ بالکل مردہ یار۔۔۔ مغرب کے بعد سڑکوں پر گاڑیاں کم اور سناٹا زیادہ

ہو جاتا ہے اور جڑواں شہر پنڈی کا تو یہ حال ہے کہ ٹریک میں جنس جاؤ تو لکنا محال۔ ایک لمبی سڑک فیض آباد سے جو جاتی ہے تو مال روڈ کو مڑنے والی سڑک پر ہی جا کر دم لیتی ہے۔۔۔ اور بھائی میاں! یاد رکھنا، اپنا شہر اپنا ہی ہوتا ہے۔ اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو مگر جب اپنے شہر میں آدمی کی جان، مال اور عزت محفوظ نہ ہو تو کوچ کر جانا ہی بہتر۔“

”چلو، اللہ بھلی کرے۔ جہاں جا رہے ہو وہاں تمہیں اور تمہارے بال بچوں کو سکون کی زندگی ملے۔“

”آمین۔“

اسلام آباد میں شروع کے دن علی حسن اور اس کے اہل خانہ کو بہت کھن گئے۔ ان کا دل ہی نہ لگتا۔ ڈار سے بچھڑی

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک سالہ کے لیے 12 ماہ کے رسالے بشمول جلد ہفت روزہ پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3000 روپے

بیرون ممالک کے لیے زمر سالانہ 30,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

0334-5498977 **مرزا اشرف عباس**

0301-2454188

0333-2256789 **مرزا شمس العزیز خان**

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز پور **ایکسپریس ڈسٹری بیوٹنگ اتھارٹی**

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

کونجوں کی طرح وہ ڈار کی یاد میں پھر پھڑپھڑاتے۔ اسلام آباد شام پڑتے ہی شہر خوشحال بن جاتا۔ دکانیں بند، سڑکوں پر ٹریفک اتنا کم کہ کسی سگنل پر بیٹھ کر آتی جاتی گاڑیوں کو شمار کیا جاسکتا تھا۔ شہر کے نقش و نگار لطیف و شیرازوں کا سا حسن اور پاکیزگی رکھتے تھے۔ راستے سیدھے اور سادہ تھے۔ انجانا بھی منزل پر پہنچ جاتا۔ عاقل کو طبعی حسن نے خود ڈرائیونگ سکھادی تھی۔ بہت کم وقت میں وہ نہایت استاد سے ڈرائیونگ کرنے لگی تھی۔ اسلام آباد اقل مکانی کا بڑا فائدہ یہی ہوا تھا کہ عاقل کو کافی حد تک اس خول سے نکل آئی تھی جس میں اس سامنے نے اسے محصور کر دیا تھا جو طبعی حسن اور اس کے کہنے کے ہر فرد کے لیے ایک دلخراش یا دین گیا تھا۔

واللہ نے جیسے اپنا دل چاہا۔
 ”ای شہید کبھی ہوں بابا“ شاہ میر نے کہا۔
 شاہ میر کے ذاتی اوصاف کے باعث اس کے پاس
 نے اپنے ہی خاندان کے ایک گھرانے میں اس کا رشتہ طے
 کر دیا۔ بڑے لوگ تھے، لڑکی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور منقاری
 ہوئی۔ میں جاب کر رہی تھی۔

اسلام آباد کی جدید نقشہ گیری سے لوگوں کی اکثریت ناواقف و مرغوب تھی مگر علی حسن کوئی نقشہ گری دکھی کرتی۔ اس کے گھر کو جانے والی سڑک کے دونوں جانب کھڑے کھینچے ہوئے درودخت انڈر پاس کی تعمیر کی نذر ہو گئے تھے۔ ان درختوں کی شاخوں پر چمکنے والے پرنڈے بے گھر ہو کر نہ اپنے گھر سے بے گھر ہو گئے تھے۔

اسلام آباد کی بدلی ہیئت پر علی حسن کے گھر میں اکثر گفتگو ہوتی۔ علی حسن کہتے: ”اسلام آباد کی قدرتی خوبصورتی بڑی بے دردی سے کھاپڑا چلا دیا اداروں نے۔“

”ہاں! دنیا کے چند خوبصورت دارالحضاروں میں سے ایک ہے ہمارا اسلام آباد“ خور کہتا۔

”کراچی کو بھلانے میں حق عافیت ہے بابا!“ شاہ میر کہتا۔
 علی حسن جو کہ شاہ میر کو دیکھتا۔ اس کی آنکھوں
 میں علی حسن کو اس کی ناراضی کا درد اٹھتا دکھائی دیتا۔
 ”حالات خراب نہ ہوتے تو میں ہرگز کراچی کو نہ
 چھوڑتا۔“ علی حسن کہتا۔

ذکرِ
 ذکریاں تو دراصل تعلیمی اسناد کی رسید ہیں،
 ورنہ علم تو وہی ہے جو غل سے ظاہر ہو۔
 میں نے سیکھا
 میں نے زندگی میں یہ چند باتیں سیکھی ہیں۔
 (1) ماں باپ کے علاوہ کوئی وفادار نہیں۔
 (2) عزت صرف پیسے کی ہے انسان کی نہیں۔
 (3) انسان جس کے لیے دل سے ٹھلس ہو، وہ
 دکھ ضرور دیتا ہے۔
 (4) لوگ اچھی سیرت کے بجائے اچھی صورت
 کو ترجیح دیتے ہیں۔
 (اشفاق احمد کی تحریر سے اقتباس)
 مرحلہ۔ جاوید اختر انا، پاکستان شریف

”چھوڑیں بابا! کراچی کو بھول جائیں۔ اب تو ہم
 بچے کے اسلام آبادی ہو گئے۔ ہمارے شاعری کارڈ میں
 لکے، ہمارے نوٹ میں ہیں۔“
 ”اور ہماری تو دونوں بھویں بھی اسلام آبادی ہیں۔“
 رافعہ مسکراتے ہوئے اپنی دونوں بھڑوں کو دیکھتی۔
 ”بابا! ہمارے تو بچے بھی پیدا کئی اسلام آبادی
 ہیں۔“ تو خیر اپنے تین اور شاہ میر کے دو بچوں کی بابت کہتا۔
 ”بس بابا! اسلام آباد ہماری اور ہمارے بچوں کی
 فاصل ڈال رہی نہیں ہے۔“
 بے رافعہ چونک کر شاہ میر کو دیکھتی۔ ”کیا کہتا رہے۔۔۔۔۔
 کیا ہے اسلام آباد؟“

”آخری منزل امی!“ شاہ میر ماں کو نہایت محبت اور احترام سے دیکھتا۔ ”ڈیوٹی نیشن کا مطلب ہوتا ہے وہ مقام ای جی، جہاں پہنچنے پر آدمی کی مسافرت ختم ہو جائے۔“

”اچھا، اچھا..... مشکل انگریزی الفاظ کے معنی سمجھو دارمی میں لگ کر بھول گئی ہوں نا بیٹا! جاہل ہو گئی ہوں۔“ رافضہ کچھ خفت سے کہتی پھر اعتراف کرتی۔ ”ویسے بھی انگلش میں بس ایسا ہی نمبر لکھا ہے۔“

”ای جی! آپ نے اپنا علم ہمیں جو منتقل کر دیا۔“ شاہ میر ماں کو نہایت عقیدت سے دیکھتا۔

”ارے نہیں بیٹا! تم سب بہن بھائیوں نے اپنی محنت اور لیاقت سے حاصل کیا ہے علم۔“

بھولی بہری یادوں سے اپنا دل خوش کرنے کو کھلی، حسن

اکثر ایسے بچوں کے سامنے ایام بارینہ کے شہر کراچی کا بیان اس طرح سے کرتا کہ ماسی کا کراچی ایک طلسماتی شہر بن جاتا۔
 ”سمندر سے اٹھنے والی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے بندر روڈ سے ہو کر جب ہمارے گھر کے آگن میں پہنچتے تو ایسی مٹھی نیند آتی کہ آنکھ کھولنے کو جی نہ چاہتا۔ آج کل کا کراچی توڑی ہوتا تھا ان دنوں کہ جگہ جگہ گھرے کے ڈھیر، پانی کی قلت، بجلی کی آنکھ بچو، گیس کی لوڈ شیڈنگ..... آلودگی ہی آلودگی، بیماریوں کی کان۔ ان دنوں تو سڑکیں، گلیاں، راستے سب صاف ستھرے ہوتے تھے۔ ٹرام ڈرائیور اور ٹکٹ باؤ یونیفارم پہنتے تھے۔ یونیفارم تو ڈاکے کی بھی ہوتی تھی۔ خاکی زین کی یونیفارم پہنے اور اپنے گلے میں بستہ لٹکائے وہ ڈاکہ تقسیم کرنے آتا تو یہاں سے وہاں تک بس ایک ہی پکار ہوتی..... ڈاک باؤ! ہمارا بھی کوئی خط ہے؟ خط کا انتظار لوگ ایسے کرتے جیسے کسی سچے بچے کے دوست کا کیا جاتا ہے۔ سستانی اتنی تھی کہ میں اب کے ساتھ قصاب کی دکان پر جاتا تو مجھے یاد ہے بڑا گوشت دس آنے سیر اور چھوٹا دو سو اور دو بے کا سیر بھر ملتا تھا۔ گوشت بھی ایسے تندرست جانور کا کہ بونی بونی چجتی تھی۔ ہنڈیا پکٹی تو دس گھروں میں خوشبو جاتی اور بتا دیتی کہ آج بچلے میں کسی گھر میں گوشت پکا ہے۔“
 ”ان دنوں تو چینی میں بھی خاص لذت ہوتی تھی۔“
 رافہہ کہتی۔

”بابا! اب تو کراچی بالکل ہی بدل گیا۔“ تحویر طلسمی شہر کا پاپلٹ پر رنج کا اظہار کرتا۔
 ”ارے بیٹا! کراچی کیا، سارا زمانہ ہی بدل گیا۔ اسلام آباد جب ہم آئے تو کیا تھا، اب کیا ہو گیا۔“
 ”زمانہ تو ابھی اور بدلے گا بابا!“ شاہ میر پیشگوئی کرتا۔
 ”اللہ مغفرت فرمائے، دادا جان کہا کرتے تھے ان کا زمانہ بہت اچھا تھا۔ میں اس وقت بچہ تھا۔ دادا جان کی بات سن کر سوچتا تھا کیا اچھا ہوتا ہوگا ان کا زمانہ۔ خود ہی تو جانتے ہیں کہ ان کی اماں جان صبح، شام دونوں وقت چکیگر میں روٹی پر چٹنی رکھ کر دیا کرتی تھیں کھانے کو۔ میں سوچتا تھا زمانہ تو ہمارا اچھا ہے۔ روٹی کے ساتھ رکالی میں دال بھی ملتی ہے، بھری ترکاری بھی ہے اور کبھی کبھی شوربے والا گوشت کا سالن بھی۔ اب لیٹین آتا ہے کہ دادا جان کا زمانہ واقعی ہمارے زمانے سے زیادہ اچھا ہوگا۔“

علی حسن کے بچوں کے بچوں میں سے کوئی طلسم توڑنے آ جاتا اور دور طلسم کی داستان سننے والی مجلس طلسم توڑنے والے بچے کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

☆☆☆

اسلام آباد میں رہتے رہتے علی حسن اور اس کی نصف بہتر رافہہ کے بالوں میں برف کی سی سفیدی نے مستقل قبضہ جما لیا۔ شاہ میر اور تحویر کی ٹکوں میں بھی کبھی کبھی سفیدی جھانسنے لگی۔
 وقت گزرنے کے ساتھ افراد اور اقوام کی ترقی کا کلیہ صائب گھر علی حسن جس معاشرے کا فرد تھا، وہاں یہ کلیہ منکوس ثابت ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ملکی حالات دن بہ دن ترقی کے بجائے تنزلی کا شکار ہوتے گئے۔ امیر اور غریب۔ متوسط طبقہ مقتدر ایوانوں میں بیٹھے بالانشینوں کی خود غرضیوں، لوٹ کھسوٹ اور شاہ خریجوں کے بھاری بیوٹوں تلے چل کر قصہ پارینہ بن گیا۔

علی حسن کا وطن جو بھی اوروں کے لیے رول ماڈل ہوا کرتا تھا، فقر و غارت کا شکار ہو رہا۔ اپنے دور طفولیت میں جرمنی کو قرض دینے والا خود دست نگر بن گیا۔ قرض دینے والے آنکھیں دکھاتے، اپنی منواتے قومی اثاثے اونے پونے فروخت یا رہن رکھے جانے کی نوبت آگئی۔ روز افزوں مہنگائی کا عفریت غریبوں کا خون چوس کر انہیں جاں سلب کرنے لگا۔ ایک دوسرے کی پگڑیاں اچھالنا چلن بن گیا۔ اس پر مستزاد غریب کا خون چوسنے کو لمبے ہاتھ کیلے دانت۔ دور اندیشوں نے خطرات بھانپ کر سامان سیٹھا شروع کر دیا۔

باہر مٹیم بنیاں والدین کو اپنے پاس بلاتیں کہ ملک کے حالات اچھے نہ تھے۔
 ”اس سے بڑا اور کیا ہوگا بیٹے کہ ہم اس ملک کی قدر نہ کر سکے جو اسلام کے نام پر جو جوش آیا تھا۔“ علی حسن کی آواز بھرا جاتی۔ ”کیا نہیں دیا ہمارے رب نے ہمیں۔ بہترین محل وقوع، سمندر، دریا، پہاڑ، سونا آبی زمین۔ چار بھر پور موسم، قیمتی معدنیات کے خزانے، ذہین افراد، توانا جوان جو ذرا کی تحریک و ترغیب پر جوئے شیر نکالنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہم نے اس ممکنہ خدا داد کی قدر نہیں کی بیٹا!“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں بابا! سو فیصد درست..... پر اس وقت وہاں سے آپ سب کا کلنا بہت ضروری ہے۔ پھنس گئے تو بہت بڑا ہوگا۔ وطن تو ہمارا ہی ہے نا بابا! وہاں کسی بھی وقت آنے جانے سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔ ہم جب چاہیں وہاں جا سکتے ہیں، جب تک چاہیں وہاں رہ سکتے ہیں۔ دوسرے ملک میں قیام کی اجازت ذرا مشکل ہوتی ہے۔ بہر حال میں اور عائشہ کوشش کریں گے کہ کسی طرح

آپ لوگ یا تو میرے پاس آجائیں یا پھر عائشہ کے پاس..... جہاں بھی ویزا مل سکے۔ کوئی دوسرا آپشن ضرور ہونا چاہیے آپ لوگوں کے پاس۔“
 پریشانی کی کوئی بات نہیں، ہم ٹھیک ہیں بیٹا!“ علی حسن نے رابہہ کو تسلی دینا چاہی۔

”بابا! میں پڑھ رہی تھی کثرت چند ماہ کے دوران کئی لاکھ لوگ ملک چھوڑ چکے ہیں اور یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔“
 عائشہ نے علی حسن کو داس ایب کال کے دوران کہا۔
 ”بیٹا! پیچیس کروڑ کی آبادی سے پانچ سات لاکھ کا کسی دوسرے ملک چلے جانا کوئی بہت بڑی خبر نہیں۔ لوگ بہر معاش کے لیے ترک مکانی کرتے ہی رہتے ہیں۔ میڈیا اسے خواہ وہ ادا رہے رہا ہے۔“

”آپ لوگ بھی عارضی طور پر ہی ترک مکانی کر لیں۔“
 ”بار بار مکان بدلنا تکلیف میں ڈالتا ہے بیٹی! گھر مریستی۔“ سسرے سے جھانا پڑتی ہے۔
 ”دل جل کر جمالیں گے بابا! بس آپ لوگ کوشش کریں میرے یا رابہہ باجی کے پاس آئے گی۔ یہاں ہم سے جو کوشش ہو سکی ہو کریں گے۔“

”ہماری فکر نہ کرو، یہاں سب ٹھیک ہے۔“
 ”ٹھیک نہیں ہے نا بابا! روزانہ پریشان کن خبریں سننے کو ہوتی ہیں پاکستان کے بارے میں۔“
 ”پریشانی کٹا ہے۔“

”کچھ حقیقت بھی ہے بابا! امی کہتی ہیں نا..... رائی ہو تو پہاڑ جتا ہے۔“

”دو جہز میں کر چکا ہوں بیٹے! پہلی تقسیم ہند کے وقت اپنے بزرگوں کے ساتھ، دوسری اپنے بال بچوں کے ساتھ کراچی سے اسلام آباد۔“

”بابا ضروری تھا؟“
 ”ہاں، ضروری تو تھا۔“

”کراچی سے اسلام آباد آ کر ہم لوگ کتنے پُر سکون اور گئے تھے۔ وہاں تو ہر وقت خوف و وحشت کی گواہی سر پر لگی رہتی تھی۔“ عائشہ بولی۔

”ٹھیک کہتی ہو بیٹا!“

”اب بھی ضروری ہے بابا! یہاں اتنی عجیب عجیب خبریں سننے کو ہوتی ہیں پاکستان کے بارے میں لی وی پر۔ اب تو قومی اثاثے فروخت کیے جا رہے ہیں۔ ہمارے دکن تو اتنا ہشتے ہیں ہم پر کل ہی کی بات ہے۔ سیری ایک انڈین بڑوں مارکیٹ میں ملی تو ہنس کر کہنے لگی..... اب ہم کو

تم پاکستانی لوگوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہی۔ تمہارا دلش تو اتنا تلاش ہو گیا ہے کہ گھر کی چیزیں بچ رہا ہے..... اپنی قومی اثاثوں کے بارے میں سناؤ پڑھا کہ برائے فروخت ہے۔ ہاں بابا! وہی بڑوں جس کا میں ابھی ذکر کر رہی تھی، کہنے لگی..... تم کیسے لوگ ہو یا رابہہ! لوگ تو ایسے ردی پتھر بھی نہیں بیٹھے جیسے تمہاری گورنمنٹ قومی اثاثوں کو اونے پونے فروخت کر رہی ہے۔ آپ کو کس بات کا انتظار ہے؟“

”مجرے کا بیٹے! یہ وطن جس بنیاد پر معرض وجود میں آیا ہے، وہ ہماری امید، یقین اور ایمان ہے۔ پاکستان قائم و دائم رہنے کے لیے بنا ہے بیٹا! ان شاء اللہ دکن اپنے منہ کی کھائیں گے۔ تم پریشان نہ ہوا کرو ہمارے بارے میں۔“
 ”بابا! پریشان نہ ہونا اپنے اختیار میں توڑی ہے۔ جب بھی آپ لوگوں کا خیال آتا ہے مگر ہونے لگتی ہے۔“

☆☆☆

رابہہ اور عائشہ دونوں بیٹنیں ہی بھائیوں کو بیرون ملک شفٹ ہونے کی ترغیب دیتیں۔ شاہ میر اور اس کی بیوی دونوں ہی خود بھی اس حق میں تھے۔ ملکی حالات کچھ امید افزا نہ تھے۔ کچھ عرصہ قبل تو ملک دوایا ہونے کی خبریں اتنے زور و شور سے پھیلانی جا رہی تھیں کہ خوف محسوس ہونے لگا تھا..... اور ان دنوں تو شاہ میر کی مغربی ملک نہ سکی، آسانی سے جگہ دینے والے کسی بھی ایشیائی ملک نقل مکانی کے لیے از حد سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی کی ایک بہن اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ قطر میں مقیم تھیں۔ شاہ میر وہاں نقل مکانی پر غور کرنے لگا تھا۔ بیوی نے کہا کہ پاکستان میں اپنی ملازمت سے رخصت لے کر جائے گی۔ قطر میں پاؤں جم گئے تو وہ اس ملازمت سے استغناء دے دے گی۔

شاہ میر کے برعکس تحویر پاکستان ہی میں رہنا چاہتا تھا۔ شاہ میر کی بیوی کی طرح اس کی بیوی دو رنگ و دو میں اور معاشی تنگ دو میں شوہر کا ہاتھ بنانے والی عورت نہیں تھی مگر ہر حال میں شوہر کی مرضی کے تابع رہنے کی خواہش تھی۔ شوہر کی طرح اسے بھی کسی اور ملک جانے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

شاہ میر نے اپنی فیملی کے ساتھ بیرون ملک جانے کا ارادہ علی حسن پر ظاہر کیا تو وہ بولا۔ ”سوچ لو بیٹے! گھر سے نکل کر گھر کی قدر کھلتی ہے۔ نئی جگہ جا کر قدم بھانے میں بعض اوقات برسوں لگ جاتے ہیں۔“

”بابا! ستر سال سے اوپر تو یہاں بھی ہو گئے، سینٹ نہیں ہو سکے۔“

”میرے بچے ہیں اچھا لکائے اور پیٹنے کو ملتا ہے۔“

”بچوں کے مستقبل کا بھی تو سوچنا پڑتا ہے۔“

علی حسن کے چاروں بچوں میں شاہ میر سب سے علم طبع، والدین کا فرمانبردار اور مشکل حالات سے کھڑا کرنے والا بیٹا تھا مگر اپنے بال بچوں کے محفوظ مستقبل کی فکر آدمی کو اسی طرح سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

”بیٹے! اقبال نے کہا تھا..... ہیروستہ وہ شجر ہے امید بہار رکھ۔“

”بابا! بے چارے شجر کا حال تو دیکھیے کیا کر دیا ہے۔ پھل پھول کی تو بات چھوڑیں، لودھ کھوٹ نے سچے تک نہیں رہنے دیئے شجر پر۔ اقبال کو کیا معلوم تھا کہ ان کے خواب کی یوں دجیاں نکھیریں گے لوگ۔“

علی حسن نے ایک ٹخنڈی سانس بھری۔ ”بیٹا! امید بچ دینا تو تم سے اور دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے۔ ہم سب کو اپنے وطن کے لیے دعا کرنی چاہیے۔“

”بہت دعا کرتا ہوں بابا! بلکہ ایک میں ہی کیا، دنیا کے ہر کونے میں بیٹھے ہمارے ہم وطن دعا گو ہیں اپنے وطن کے لیے۔ ہم کہیں بھی چلے جائیں بابا! ہماری جڑیں تو یہیں گڑی ہیں۔ پاکستان ہماری پہچان ہے۔“

علی حسن کی رضا نہ پا کر شاہ میر نے بیرون ملک جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

☆☆☆

علی حسن کے دونوں بیٹوں شاہ میر اور تھویر کا کسی سیاسی جماعت یا لسانی وفد بھی گروہ سے دور دریک کوئی تعلق نہ تھا۔ دوران تعلیم اپنے تعلیمی اداروں میں ہم نصابی سرگرمیوں میں ضرور پیش پیش رہے تھے مگر باپ کی مناسب ہدایت و راہنمائی کے باعث انہوں نے سیاست کی دلدل میں پاؤں پھنسانے سے ہمیشہ گریز کیا تھا پھر بھی نہ جانے کیوں ایک روز شاہ میر اپنے آٹھ سالہ بیٹے میر کے ہمراہ مسجد میں نماز عشا کی ادائیگی کے بعد گھر واپس جا رہا تھا کہ گھر سے چند قدم کے فاصلے پر دو نامعلوم افراد میر کو چھوڑ کر شاہ میر کو اپنے ساتھ لے گئے۔ علی حسن ابھی مسجد کے اندر ہی تھا۔

میر اکیلا ہی گھر واپس پہنچا تو رافضی نے اس سے پوچھا۔ ”بابا! اور دادا جان کے ساتھ کیوں نہیں آئے تم؟“

”دادا جان مسجد میں ہیں۔ بابا کو دو آدمی اپنے ساتھ لے گئے۔“

”کون آدمی؟“ رافضی نے چونک کر پوچھا۔

”چائیس۔ بابا ان سے بول رہے تھے، آپ کون ہیں؟“ انہوں نے بابا سے کہا، آپ ذرا ہمارے ساتھ آئیں۔“

”پھر؟“

”پھر انہوں نے بابا کو گھڑی میں بٹھایا اور اپنے ساتھ لے گئے۔“

”تمہارے بابا کے کوئی دوست ہوں گے۔“ رافضی نے اطمینان سے کہا۔

”دادی! انہوں نے بابا کو دھکا دے کر گاڑی میں بٹھایا تھا۔“

”ہیں.....! اب رافضی کو تشویش ہوئی۔

”ہاں دادی! میں نے خود دیکھا تھا، دوست دعا تو نہیں دیتے۔“

”تم نے دادا جان کو بتایا؟“ رافضی تشویش میں پڑ گئی۔

”وہ تو مسجد میں تھے۔“

”پریشان نہ ہوں اے! شاہ میر کی بیوی نے ساس کو پریشان دیکھ کر تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”کوئی بھلا دھکا دے کر کیوں بٹھائے گا انہیں گاڑی میں۔ ان کی تو بہت عزت ہے محلے میں۔ میر کو یونہی ہم بھابھوگا۔“

”مگر میر یہ بھی بتا رہا ہے کہ شاہ میر نے ان سے کہا آپ کون ہیں؟“ رافضی بولی۔

”ساش، بہو بات کر رہی تھی کہ علی حسن مسجد سے گھر آ گیا۔ اسے یہ قسم چٹائی تو وہ بھی نگر مند ہو گیا۔ شاہ میر کے فون پر کال کی تو فون بند ملا۔

گھر والے ابھی تشویش اور اضطراب میں تھے کہ شاہ میر کے موبائل سے علی حسن کے نمبر پر کال آ گئی۔ شاہ میر کی عادت تھی جب بھی فون کرتا سلام کرنے سے آغاز کلام کرتا لیکن اس وقت ایسا نہ ہوا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بابا! مجھے کچھ لوگ اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں.....

کیوں؟ کہاں؟ میں نہیں جانتا۔ میری ریکویسٹ پر انہوں نے مجھے آپ کو انعام کرنے کی اجازت دی ہے بس۔“

”بیٹا! کون لوگ ہیں؟ میری بات کراؤ ان سے۔“

علی حسن نے کہا۔

”مگر فون بند کر دیا گیا تھا۔

علی حسن، رافضی اور دونوں بہوؤں سب پریشان ہو گئے۔ تھویر اسپتال میں ڈیوٹی پر تھا۔ علی حسن نے اسے فون کیا۔ وہ بھی کھبرا گیا۔ ”میں آتا ہوں بابا!“ اس نے باپ کو تسلی دی۔

”جلدی چتا کریں، کون لوگ ہیں، کہاں لے گئے

ہیں میرے بچے کو؟“ رافضی دو ہانسی ہونہری تھی۔ ”رات سر پر اٹھیں میرے بچے کو اپنی امان میں رکھنا۔“

علی حسن کو اپنے دوست جمیل الدین کے بیٹے کا خیال آ رہا تھا۔ خوب رو کر مل جواں تھا۔ بیچ وقت نمازی، والدین کی اگلی نیند اولاد، پھول سی تازہ کی بیوی کا شوہر۔ شادی کو دہرا ہی سال تھا۔ بیوی امید سے تھی۔ جمیل الدین کا رو باری آدمی تھے، دین دار تھے۔ اللہ نے مادی وسائل سے خوب نواز رکھا تھا۔ ایک مذہبی جماعت سے ان کی گہری وابستگی تھی۔ داسے، درے، سنے دل کھول کر جماعت کی خدمت کرتے۔ بیٹا بھی انہی کا ہمنوا تھا۔ حق کو حق اور ناحق کو ناحق کہنے سے گریز نہ کرتا۔ نہ جانے کب سے نظر میں تھا۔ ایک شام اپنی فیکٹری سے گھر واپس آ رہا تھا کہ نامعلوم افراد اسے گاڑی سے اتار کر اپنے ساتھ لے گئے۔ جاتے ہوئے اس نے باپ کا نمبر ملا یا مگر بات نہ کر سکا۔ جمیل الدین ”ہیلو، ہیلو“ کہتے رہ گئے۔ گاڑی تو جانے واردات سے مل گئی مگر جواں بیٹے کا پتا نہ چلا۔ جمیل الدین نے بیٹے کی تلاش میں کیا نہیں کیا۔ کس کس سے نہ کہا سنا، کچھ پتا نہ چلا۔ بہو امید سے تھی۔ بیٹا پیدا ہوا۔ جمیل الدین کی بیوی نے بیٹے کی کشمکش کو روٹی دنیا سے گئی۔ کچھ عرصے بعد جمیل الدین بھی سدھارے۔ ہنسا ہنسا گھر اجڑ گیا۔

علی حسن کا دل کاب رہا تھا۔ خدا نہ کرے شاہ میر کے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہو۔ اس کا کچھ پتا نہ چلے۔ وہ اور رافضی بھی شاہ میر کے غم میں اسی طرح دنیا سے روتے گزر جا چکے جیسے جمیل الدین اور ان کی بیوی گزر گئے تھے۔ بیٹے کے غم میں روتے روتے جمیل الدین کی بیوی کی نظر بھی جاتی رہی تھی۔

جمیل الدین تو امیر آدمی تھے۔ بیٹے کی تلاش میں انہوں نے اپنے تمام وسائل کو آزمایا۔ صاحبان اقتدار تک پہنچے اور بیٹے کی بازیابی کے لیے سائل بنے کوئی دروازہ نہ لٹکتا تھا۔ میں پس و پیش نہ کی مگر ہر کوشش اکارت گئی۔

علی حسن کو فکر و اس گیر تھی کہ جب جمیل الدین جیسا آدمی اپنے بیٹے کو بازیاب نہ کر اسکا تو وہ شاہ میر کو کیونکر تلاش کر پائے گا۔ شاہ میر تو اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا۔ اسے لے جانے کا کوئی جواز تو سمجھ میں نہ آتا تھا۔

شاہ میر کی بیوی نے اپنے گھر والوں کو اطلاع دی۔ علی حسن نے بھی بہو کے والد کو تفصیل سے آگاہ کیا۔ بااثر خاندان تھا۔ سرحمی نے علی حسن کو تسلی دی اور کہا۔ ”میں آپ کے پاس آ رہا ہوں۔ پولیس کو رپورٹ کرنا اشد ضروری ہے۔ کوئی عینی گواہ ہے اس واقعے کا؟“

شاہ میر کے سر نے علی حسن کو اپنے ہمراہ پولیس اسٹیشن لے جا کر دھتے کی ایف آئی آر درج کرائی پھر مسترد اور بااثر احباب و اقارب سے رابطے شروع کر دیے۔

”شاہ میر میرا داماد نہیں، بیٹا ہے۔ اس کا بال بھی بکا ہوا تو میں کسی کو نہیں بخشوں گا۔“ شاہ میر کے سر نے ایک

”باہر کل کر پوچھتا ہوں۔ میر بتا رہا ہے کہ وہ اور شاہ میر جیسے ہی اپنی اسٹریٹ میں داخل ہوئے، گھر سے چند قدم دور دو افراد ان کے پیچھے پیچھے آئے اور انہوں نے شاہ میر سے کہا..... آپ ذرا ہمارے ساتھ آئیں..... شاہ میر نے ان سے پوچھا آپ کون ہیں..... تھی ایک گاڑی اسٹریٹ میں آئی اور ان دو افراد میں سے ایک نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور دوسرے نے شاہ میر کو کھلے دروازے سے گاڑی کے اندر دھکیل دیا۔“

”پھر؟“

”پھر ایک آدمی پیچھے بیٹھا اور دوسرا ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر اور گاڑی تیزی سے چلی گئی۔“

”قریبی گھروں کا کوئی آدمی تھا اس وقت وہاں؟“

”میر تو کہتا ہے کوئی نہیں تھا مگر میں باہر جا کر پوچھتا ہوں کسی سے۔“

علی حسن گھر سے باہر نکلا۔ اسٹریٹ سنسان تھی۔ مسجد کی طرف گیا تو وہاں دو لوجوان لڑکوں نے بتایا عشا کی نماز کے دوران سیاہ رنگ کی ایک نئی کار، مسجد کے باہر کھڑی تھی اور کار ڈرائیور نماز کی ادائیگی کے لیے گاڑی سے اترنے کے بجائے گاڑی میں ہی بیٹھا دیکھا گیا تھا۔

تھویر ڈیوٹی سے فراغت لے کر جلدی گھر آ گیا۔ کچھ دیر بعد شاہ میر کے ساس، سر بھی اپنے بیٹے کے ساتھ پہنچ گئے۔ شاہ میر کا سسرال ہمہ خاندان آفتاب است کے مصداق تھا۔ ساس، سسر دونوں سول سروس میں رہے تھے۔ زمانہ حال زیادہ تر زندگی گزار رہے تھے گھر مراہمی بھی سوالا لاکہ کا..... معاشرتی تعلقات کے حوالے سے اب بھی نہایت فعال تھے۔ اولاد بھی لائق اور وہیل سیلڈ تھی۔ رشتے داروں میں ایک سے بڑھ کر ایک اثر رسوخ والے لوگ موجود تھے۔ شاہ میر کی بیوی خود ہی ایچ ڈی تھی۔ مقامی یونیورسٹی میں اپنے شعبے کی لائق ترین استاد بھی جاتی تھی۔ علی حسن کے گھرانے اور شاہ میر کے سسرال کے اسٹیشن میں خاصا فرق تھا لیکن علی حسن گھرانے کے رکھ رکھاؤ، شرافت اور دین داری نے شاہ میر کو ایسے خاندان کا داماد بنادیا تھا جس کا اثر رسوخ بہت اونچا تھا۔

شاہ میر کے سر نے علی حسن کو اپنے ہمراہ پولیس اسٹیشن لے جا کر دھتے کی ایف آئی آر درج کرائی پھر مسترد اور بااثر احباب و اقارب سے رابطے شروع کر دیے۔

”شاہ میر میرا داماد نہیں، بیٹا ہے۔ اس کا بال بھی بکا ہوا تو میں کسی کو نہیں بخشوں گا۔“ شاہ میر کے سر نے ایک

بہت با اختیار شخصیت سے نہایت جارحانہ لہجہ میں کہا۔
 علی حسن بیٹے کی سلامتی کے لیے فکر مند تو تھا مگر
 پریشانی کی ان گھڑیوں میں اسے شاہ میر کے سسرال
 والوں سے بہت حوصلہ ملا۔

☆☆☆

اگلے چار پانچ دن علی حسن کے گھرانے کے لیے
 قیامت منگنی تھے۔ خوش قسمتی سے اس قیامت منگنی میں
 ہنزدادری یا دوسری کوئی گھٹیل نہ تھی۔ رافدہ ان چند دنوں
 میں بچو بی تو گئی۔ جام نماز سے اٹھتی پھر سجدہ ریز ہو جاتی۔
 شاہ میر کی بیوی نے نہایت حوصلہ دکھایا۔ خود پریشان اور
 فکر مند ہونے کے باوجود سراسر کی ہمت بندھائی۔
 رافدہ بار بار ہاتھ مل کر علی حسن سے کہتی۔ "شاہ میر تو
 اپنے بیوی بچوں کے ساتھ باہر جانا چاہتا تھا، جانے دیتے
 تھے۔ آپ نے اسے روکا، آپ نے منع کیا۔ اسے باہر چلا
 جاتا تو اس عذاب سے توجہ جاتا۔ کیا بگاڑا تھا میرے بچے
 نے کسی کا۔" علی حسن بیوی کا گھر رو نہ کر پاتا۔
 رافدہ اور عائشہ کو شروع میں تو اس واقعے سے بے خبر
 رکھا گیا لیکن تیسرے چوتھے دن جب رافدہ بڑی بیٹی رافدہ
 سے فون پر بات کرتے ہوئے اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر
 رونے لگی تو رافدہ کو تشویش ہوئی۔ رافدہ کے ہاتھ سے موبائل
 علی حسن نے لے لیا تھا۔
 "ہیلو۔" رافدہ کی آواز سے تشویش اور بے تاب جھلک
 رہی تھی۔

"ہاں بیٹا! میں سن رہا ہوں۔" علی حسن نے کہا۔
 "امی کو کیا ہوا بابا؟ کیوں رونے لگیں، گھر میں سب
 خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں ہے بیٹا!"

"کیوں کیا ہوا؟"

علی حسن کو بتانا پڑا۔
 "بابا! اسی لیے کہ میں ہم دونوں ہمیں کہ آپ لوگ
 چھوڑ دیں وہ ملک۔" رافدہ صدمہ میں تھی۔

"بیٹا! یہ ملک ہمارا وطن ہے۔"

"زمین کا وہ ٹکڑا جہاں آپ اور آپ کے پیارے
 آپ کے ساتھ بیٹھے ہوں، وہی آپ کا وطن ہوتا ہے۔"
 رافدہ نے ماں کے بھی کبے الفاظ دہرائے۔

"میں نے تمہیں یہ سبق تو نہیں پڑھایا تھا بیٹے۔" علی
 حسن رنج سے بولا۔ "وطن وہ ہوتا ہے جہاں ہماری جڑیں
 گڑی ہوئی ہیں، جہاں ہم بغیر کسی جبر و استبداد آزادی سے

اپنے دینی عقائد کے مطابق زندگی جی سکیں۔"
 "آپ نے دیکھ لیا نا کیسا جبر و استبداد ہے وہاں۔
 شاہ میر جیسے میرے بے ضرر بھائی کو بغیر کسی وجہ کے اٹھا لے
 گئے۔ میرے اللہ! میں کیا کروں۔ اتنی دور بیٹھی ہوں، اپنے
 بھائی کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتی۔" رافدہ بلک کر رونے لگی۔
 "تم نے دیکھا۔۔۔۔۔ دوری اور فاصلے کیا قسم ڈھاتے
 ہیں۔ اپنے وطن سے نکل کر آدمی اپنے پیاروں کا دکھ سکھ بھی
 شیر نہیں کر سکتا۔"

"اسی لیے میں اور عائشہ کہتی تھیں یہاں آ جا میں۔"
 رافدہ اپنے موقف پر اڑی رہی۔
 علی حسن نے ایک سرد آہ کھینچی۔ "گھری نگری پھر
 مسافر۔۔۔۔۔ گھر کا رستہ بھول گیا۔"

عائشہ نے رافدہ سے زیادہ سخت رد عمل کا اظہار کیا۔
 بھائی کی محبت میں بھول گئی کہ باپ سے ہم کلام تھی۔ "بابا!
 آپ ذمے دار ہیں شاہ میر بھائی اور ان کی بیٹی کو اتنی بڑی
 تکلیف کے۔ وہ بے چارے تو مانگیٹ کرنا چاہ رہے
 تھے، آپ نے انہیں منع کیا۔ مجھے تو میر کا خیال آتا ہے۔ کتنا
 پیار کرتا ہے وہ بھائی کو۔" مس کر رہا ہوگا انہیں۔"
 "میر تو باپ کے سینے پر سر رکھے بغیر سوتا نہیں تھا۔"

علی حسن بولا۔

"اب؟"

"اللہ صبر دیتا ہے۔"

"صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے بابا! جہاں بچوں سے
 ان کے باپ چھینے جا سکیں، عورتوں کو بے آسرا کیا جائے، ظلم
 کی کوئی حد نہ ہو، نا انصافی عروج پر ہو۔۔۔۔۔ وہاں کب تک
 صبر کرے بندہ؟" عائشہ رو ہانسی ہو رہی تھی۔

"پریشان نہ ہو بیٹا!"

"آپ ہمیشہ یہی کہہ دیتے ہیں۔ انسان ہوں، جب
 تک دل دھڑک رہا ہے، اپنی خوشی میں خوش اور ان کی
 تکلیف سے پریشان ہوتی رہوں گی۔ شاہ میر بھائی کی فکر
 میرے دل سے لگ گئی ہے۔ اب تو سونے بھی نہیں دے گی۔"
 "اللہ خیر کرے گا۔"

"غیر ہی ہو بابا! اللہ پاک میرے بھائیوں کو سلامت رکھے۔"
 "جن بھائیوں کے لیے دعا کرنے والی بہنیں
 سلامت ہوں، وہ اپنی بہنوں کی دعاؤں کے حصار میں
 رہتے ہیں۔"

"بھائی کو فون کرتی ہوں ان کے نمبر پر۔ وہ تو بہت
 پریشان ہوں گی۔"

"ظاہر ہے۔۔۔۔۔ لیکن بیٹا! ایک بات بتاؤں گے۔
 شاہ میر کی بیوی کے حوصلے و استقامت نے مجھے حیران کر دیا
 ہے۔ آزمائش کی ان سخت گھڑیوں میں اس نے رونے
 دھونے کے بجائے ہم سب کو سہت رکھا ہے۔ اچھی عورت
 اللہ کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔"
 "بے شک۔"

"اور اچھا سہیاد تو اس سے بھی بڑی نعمت۔ شاہ میر
 کے سسرال والوں نے تو اس کے بارے میں معلومات
 حاصل کرنے کے لیے دن رات ایک کر رکھا ہے۔ اثر و رسوخ
 والے لوگ ہیں۔ جو ہم نہیں کر سکتے تھے شاہ میر کی تلاش کے
 لیے، وہ اس کے سسرال والوں نے کیا ہے۔ سرچین سے
 نہیں بچے رہے۔ اس کو فون، اس کو اپروچ۔ بڑی دور
 ہی پہنچے ہیں ان لوگوں کی۔ میں تو حیران ہو گیا ہوں ان کے
 تعلقات کی رسائی دیکھ کر۔ ہلا رکھا ہے ان لوگوں نے انہیں
 جو اپنے کان پر جو نہیں رہنے دیتے۔"

"شاید اسی وقت کے لیے اللہ نے شاہ میر بھائی کا
 رشتہ اس خاندان میں کرایا تھا۔"

"رب کائنات کی حکمت وہی جانے۔"

"بابا! اب ڈیٹ کے لیے آپ کو بار بار فون کر کے
 جی کرتی رہوں گی۔"

"کسی بھی وقت میرا بیٹا!"

"لو پو بابا! پتا خیال رکھیے گا۔"

"لو پو میری بیٹی! پریشان ہونے کے بجائے دعا کرو۔"

"ان شاء اللہ۔"

☆☆☆

پانچواں دن تھا۔ رات دو ڈھائی کا عمل۔ اطلاع گھنٹی
 بجے پھر کے بڑے ایک یا دوں اچھ کھڑے ہوئے۔ نیند
 ان دنوں بھی کو بس پونہمی سی آرہی تھی۔ رافدہ تو بستر پر لیٹنے
 کے بعد بھی اسانے اٹھی اور آیات قرآنی پڑھتے پڑھتے نیم
 خواب کی میں جاتی۔ موت اور حادثے کے بعد شروع کے
 دن بہت ٹھن ہوتے ہیں، رفتہ رفتہ قرار آتا ہے۔ علی حسن
 کے گھر والے شاہ میر کے لیے ابھی بے قراری کی منزل ہی
 ملے تھے۔

"اُمی خیر! اس وقت کون آ گیا؟" رافدہ نے گھنٹی کی
 آواز پر کہا۔

علی حسن اور تو پر پاؤں میں چپلیں پہن کر تیزی سے
 کارپورج میں نکلے اور ان کے پیچھے پیچھے گھر کی تینوں
 مسرت بھی۔ سب تیزی سے گیٹ تک پہنچے۔

"کون؟" گیٹ کھولنے سے قبل تو میر نے احتیاطاً پوچھا۔
 "میں۔ شاہ میر۔" جواب ملا۔
 علی حسن نے بے تابانہ گیٹ کی کنڈی کھینچی۔ کارپورج
 میں چلتے بلب اور آس پاس گھروں سے آتی بیرونی تینوں کی
 روشنی میں شاہ میر ان سب کے سامنے کھڑا تھا۔ گیٹ پر ایک
 گاڑی بھی موجود تھی۔

"ٹیکسی والے کو پیسے دیں۔" شاہ میر نے کہا۔ تو میر
 پیسے لانے کو لپکا۔

شاہ میر گھر میں آ گیا۔ بڑے حال۔۔۔۔۔ چہرہ ستا ہوا،
 جیسے عقوبت خانے سے آ رہا ہو۔

"شکر ہے۔۔۔۔۔ شکر ہے میرے رب!" علی حسن نے
 دعا مانگے ہاتھ اٹھاتے ہوئے آسمان کے رخ پر دیکھا۔

"آؤ۔۔۔۔۔ آؤ بیٹا!" اس نے شاہ میر کا بازو پکڑا۔
 سب اندر آ گئے۔ بتیاں روشن کر دی گئیں۔ شاہ میر
 تھکا تھکا سا صوفے پر بیٹھ گیا۔

"کہاں تھے بیٹا؟ کون لوگ تھے جو تمہیں لے
 گئے؟" علی حسن جاننا چاہتا تھا۔

"جہنم سے گزرا یا ہوں بابا!" شاہ میر نے کہا۔
 "کہاں۔۔۔۔۔ کہاں لے گئے تھے وہ لوگ تمہیں؟"

"کون تھے وہ؟" علی حسن نے پوچھا۔
 "کچھ معلوم نہیں۔ جاتے وقت بھی میری آنکھوں پر
 سیاہ پٹی باندھ دی گئی تھی۔۔۔۔۔ آج بھی۔"

"تمہیں چھوڑا کیسے اور کہاں؟"

"ویرانہ تھا، انحراف تھا۔ بہت دیر چلنے کے بعد
 آبادی میں پہنچا۔ وہاں ٹیکسی ملی۔ میں بہت تھک رہا ہوں،
 شاور لینا چاہتا ہوں۔"

"ہاں، ہاں بیٹا! تمہارے چہرے سے ٹھن لگ رہی
 ہے۔۔۔۔۔ مگر تمہیں لے کیوں گئے تھے؟ چھوڑ کیسے دیا؟"

"چھوڑتے وقت انہوں نے بس اتنا کہا۔۔۔۔۔ ہمیں
 اٹھانا کسی اور کو تھا، تمہیں غلطی میں اٹھالائے۔"

"مائی گاڈ!" تو میر بڑبڑایا۔

"ہیو!" علی حسن نے شاہ میر کی بیوی کو مخاطب
 کیا۔ "یہ وقت تو نہیں ہے فون کرنے کا مگر تم اپنے گھر بتا دو
 کہ شاہ میر آ گیا ہے۔"

"جی بابا!"

"شاہ میر! تمہاری بازیابی کے لیے تمہارے سسرال
 والوں بالخصوص تمہارے سر نے جس طرح دن رات ایک
 کیا ہے، اس کا احسان میں تو کم از کم زندگی بھر اتار سکوں

گیا۔ تم بھی ساری زندگی ان کے شکر گزار رہنا بیٹے!"

"ویسے بھائی! ان کا یہ کہنا کہ اٹھانا کسی اور کو تھا، غلط نہیں میں آپ کو لے آئے، سمجھ سے بالاتر ہے۔ اصل بات یہی ہے کہ بھائی کی فیملی کی طرف سے ایسا باؤ پڑا کہ وہ آپ کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔" "تویر نے کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں ہو کیا رہا ہے۔" شاہ میر کنبیوڑ ڈھٹا۔

"جبر ہے جو اڑتا ہوتا ہے بھائی!" "تویر نے کہا۔

"میں شکرانے کے نفل پڑھ لوں۔" رافہہ بولی۔

"سمیر کیسا ہے؟" شاہ میر نے نہانے کے لیے اٹھتے ہوئے بیوی سے پوچھا۔

"آپ کے بغیر مشکل سے سوتا تھا۔" وہ گلو گلو آواز میں بولی اور یکایک ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

علی حسن نے اٹھ کر بہو کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور شاہ میر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "خوش قسمت ہو بیٹا کہ تمہیں ایسی شریک حیات ملی ہے جس کے حوصلے اور استقامت نے تمہارے بوڑھے باپ کو کبھی شرمایا۔"

"ہماری بھابی بہت بہادر ہیں۔" تویر کی بیوی نے جیٹھانی کی تحسین سے اپنا قد بھی بڑھا لیا۔

شاہ میر کے دونوں بچے باپ کی صحیح سلامت واپسی سے بہت خوش ہوئے مگر سمیر اتنا خوفزدہ ہو گیا تھا کہ نماز کے وقت شاہ میر کو مسجد نہ جانے دیتا۔ ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیتا اور گڑگڑانے لگتا۔ "نہیں بابا نہیں..... وہ آپ کو پھر گاڑی میں لے جائیں گے۔"

علی حسن نے کہا۔ "دیکھا..... اثرات کہاں تک جا رہے ہیں۔ بیودو ہنود کو اب ہمارے خلاف سازشوں کی پہلے جتنی ضرورت نہیں رہی۔ ہمارے اپنے لوگوں کی حرکات ہی ہمارے بچوں کو دینی مراکز سے خوفزدہ کیے دے رہی ہیں۔"

گھر والوں نے وقتاً فوقتاً سمیر کو سمجھا بھجا کر مسجد کا خوف اس کے فتنے سے ذہن سے نکالا۔

شاہ میر کی بخیریت واپسی کا شکرانہ معذور افراد کے ایک ادارے میں ایک وقت کا کھانا بھیجا کر ادا کیا گیا۔ رافہہ اٹھتے ہی جتنے خدا کا شکر ادا کرتی جس نے نہ صرف شاہ میر بلکہ سارے گھرانے کو کسی بہت بڑی آزمائش سے بچا لیا تھا۔

شاہ میر کبھی کبھی مذاق میں کہتا۔ "ایسا نہ ہو کہ چھوڑنے والے کسی دن واپس لینے کے لیے آجائیں کہ چھوڑنا کسی اور کو تھا، غلط نہیں میں ہم نے آپ کو چھوڑ دیا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں۔" بیوی اسے شاکی نظروں

اسے دیکھتی اور کہتی۔ "آپ کو کیا پتا وہ چند دن میں نے کس مذہب میں گزرا رہے۔"

"بابا تو کہتے ہیں تم نے بہت حوصلہ دکھایا۔"

"حوصلہ دکھانا اور بات ہے، اپنے دل میں لمحہ لمحہ مرنا اور بات۔ امی اور بابا بوڑھے ہیں۔ ان کی عمر نہیں ہے ایسے صدات سے گزرنے کی۔ تویر کو مرد ہونے کا ہنرمز رکھنے کے لیے اپنی پریشانی کو دبا پڑتا تھا۔ تویر کی بیگم کو گھر داری اور نہ صرف اپنے بچے بلکہ ہمارے بچوں کو بھی سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ کبھی کو تو حوصلہ دکھانا تھا۔"

"جو تم نے کر دکھایا۔" شاہ میر نے بیوی کو محبت سے دیکھا۔

"آئی لو پو شاہ جی.....! اور محبت کرنے والوں کو حوصلہ تو دکھانا ہی پڑتا ہے۔"

"تویر بھائی۔"

"میں آپ کے بغیر نہیں جی سکتی شاہ جی!"

"کیا میں جی سکتا ہوں تمہارے بغیر؟" شاہ میر نے کہا۔

"امی اور بابا کی کوئی نیکی اور دعا میں کام آسکیں۔"

ساری زندگی خدا کا شکر ادا کرتی رہوں گی۔"

☆☆☆

شاہ میر کا یہ بخیریت واپس آ جانا عجوبہ ہی تھا۔ کہتے تھے جو اسی طرح اٹھائے گئے اور پھر ان کا کچھ پتا نہ چلا۔ لاپتا افراد کی ایک لمبی فہرست تھی جن کی تلاش میں ان کے چاہنے والے در بدر پھر رہے تھے۔ بوڑھے والدین اپنے جوان بیٹوں کی تلاش میں، عورتیں اپنے باپ، بھائیوں اور شوہروں کی بازیابی کے لیے..... مصوم بچے اپنے باپ کے لکھ کو ترستے ہوئے..... بے شمار تھے، ان گنت تھے۔ مرنے والوں کے لیے تو آخر کار صبر آ جاتا ہے..... زندہ لے جاتے جاتے والوں کو مردہ کیسے یاد کر لیا جائے۔ وہ اگر مار بھی دیے جائیں تو اپنے پیاروں کی یادوں میں زندہ رہتے ہیں۔ صبر کیونکر آئے؟

شاہ میر والے واقعے نے علی حسن کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ خدا ناخواستہ..... خدا ناخواستہ وہ واپس نہ آتا تو؟ زندگی زخم بن کر رہ جاتی۔ لہجہ نہیں دیتی، ہر پل، ہر گھنٹی، ہر آن دل کو ناقابل بیان درد سے دوچار کرتی۔

دل کڑا کر کہ علی حسن نے دونوں بیٹوں سے کہا۔ "تم دونوں ایگریٹیشن کے لیے اپلائی کرو۔ دونوں کو ایڈمیشن ہو۔ آج کل بہت سے مغربی ممالک نے تارکین وطن کے لیے اپنے دروازے کھول رکھے ہیں۔ ان شاء اللہ تم لوگوں کو مشکل نہیں ہوگی۔"

شاہ میر اور تویر دونوں حیرانی کی تصویر بنے بے چینی سے بات بات سنتے رہے۔

دیر نہیں ہوئی چاہے..... جلد سے جلد..... کیونکہ حالات بدلتے دیر نہیں لگی۔ گورونما کے بعد تو اعتبار نہیں رہا کہ آنے والے نکل دنیا کی صورت کیا ہوگی۔

"بابا! میں آپ کو اور امی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتا۔" تویر نے کہا۔

علی حسن نے تویر کو ابرو چڑھا کر دیکھا۔ "میں نے تم سے پوچھا کہ تم جانا چاہتے ہو یا نہیں؟"

تویر جھینپ گیا۔

"میں نے کہا ہے ایگریٹیشن کے لیے اپلائی کرو....."

کہیں بھی..... جو اس تمہاری ہے۔ یہاں سے بہتر حالات ہیں مے تمہیں۔" علی حسن کے لہجے میں ہارے ہوئے کھلاڑی کی دل گرفتگی تھی۔

"بابا!....." شاہ میر نے کچھ کہنا چاہا مگر اسے بولنے کا موقع دینے بغیر علی حسن نے دل شکستہ لہجے میں کہا۔

"ہمارے بڑے خون کا دریا عبور کر کے اس وطن میں آئے تھے۔ امید تھی، آرزو تھی، تمنا تھی کہیں مگر خون چوسنے والوں نے اس کی زرخیزی کو بخر کر دیا۔ اپنی اپنی خود غرضی سے اس وطن کے توانا وجود کو کھوکھلا کر دیا۔ اسکول کے زمانے میں ہماری نسل اپنی معاشرتی علوم کی کتابوں میں پڑھا کرتی تھی..... ہم رو پہلے اور سنہری ریشوں والے دس کے پاسی ہیں۔ سنہری ریشہ تو ہماری لالچوں کے باعث ہمارے ہاتھ سے گیا، غلطیوں سے سیکھ کر ہم رو پہلے ریشہ کی بھی وہ حفاظت، وہ قدر نہ کر پائے جو کرنی چاہیے تھی۔ دنیا میں قدرتی وسائل کا سب سے مالا مال خطہ ہوتے ہوئے بھی ہم فقیر بن گئے۔ غیروں کے سامنے کاسہ لگائی پھیلانے کھڑے ہیں اور شرمسار نہیں۔" علی حسن نے توقف کیا، ایک سرد آہ کھینچی، پھر اسی دل گرفتگی سے گویا ہوا۔

"کہاں تک سنو گے، کہاں تک سناؤں....."

ہاجرت کی صورتیں جمیل کر اس سرزمین پر آنے والوں کے نام سنہری خواب کچی کچی ہو رہے ہیں..... اور یہ بھی سچ ہے کہ ہر نسل اپنی آنے والی نسل کے لیے خواب دیکھتی ہے۔ مگر ان چاہتا کہ میرے ٹوٹے خوابوں کی گرچیوں سے تمہارے پاؤں لہلہا ہوں..... اسی لیے چاہتا ہوں کہ تم لوگ چلے جاؤ۔"

"موری بابا! آپ چاہتے ہیں ہم بھی وہی خود غرضی

دکھائیں جو خون چوسنے والوں نے اس وطن کے ساتھ روا رکھی۔" "تویر بولا۔

"خود غرضی نہیں ہے، بھیا کہ ہے۔ جب دائرہ حیات تنگ ہونے لگے، جان، مال، آبرو کی ضمانت نہ رہے تو راستہ تلاش کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ تم میری اولاد ہو اور ایک باپ کو اپنی اولاد سے آگے کچھ نہیں دکھائی دیتا۔"

"معذرت بابا! ایسا نہ کہیں۔ وطن کے لیے تو باپ اپنی اولاد کو بھی قربان کر دیتا ہے۔" تویر نے کہا۔

"مجھے اپنی کمزوری کا اعتراف ہے۔ تم اگر مجھ سے پوچھو کہ میری زندگی کا سب سے بڑا وقت؟ تو میں کہوں گا..... شاہ میر کی کشمکش..... ان چند دنوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ذرا سوچو، ایک لمحے کو سوچو۔ خدا ناخواستہ شاہ میر واپس نہ آیا ہوتا تو اس وقت ہم کہاں اور کس کیفیت میں ہوتے۔ نظریات کچھ اور ہوتے ہیں بچے! مگر زندگی کے حقائق کچھ اور۔ میرا نظریہ یہ وطن ہے مگر میری زندگی کی حقیقت تم اور تمہارے بچے۔ میں تمہیں محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے بابا!" شاہ میر نے کہا پھر چھوٹے بھائی تویر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "بابا جیسا کہ رہے ہیں، کیسے لینے ہیں۔ ایگریٹیشن کون سی فورائل جاتی ہے..... لیکن ایک شرط ہوگی کہ امی اور بابا بھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔"

"بوڑھوں کو دیکھ نہیں کیا جاتا۔ زندگی بھی اپنی کھلی بانہیں سینے پر باندھ لیتی ہے ہم بوڑھوں کے لیے۔" علی حسن بولا۔

شاہ میر دھیرے سے مسکرایا۔ "ڈنٹ ویز ایل جاتا ہے بابا!"

"دیکھیں گے..... ویسے بھی....." علی حسن نے اپنا کلام ادھورا چھوڑ دیا۔

"ویسے بھی کیا بابا؟" تویر نے جھس سے کہا۔

"مجھے انتظار کرنا ہے۔"

"کس بات کا؟" "تویر چونکا۔

"موسم بدلنے..... پھول کھلنے..... اور تبدیلی کا..... وطن کے موجودہ حالات سے دھکی ضرور ہوں مگر نا امید نہیں۔ میرا دل کہتا ہے کوئی تو اٹھے گا..... حالات بدل سکیں گے..... پھول کھلیں گے..... اور جانے والے پلٹ کر آئیں گے..... میں تیسری بار ہجرت نہیں، انتظار کروں گا..... موسم گل کا!"

مہفل شہر و سخن

✽ ناہید یوسف..... اسلام آباد

کیوں کسی کو دکھ درد شاؤں اپنے
اپنی آنکھوں سے بھی میں دُخم چھاؤں اپنے
✽ شرمین خان..... پشاور

چپ سادہ کے بیٹھے تھے سبھی لوگ وہاں پر
پردے پر جو تصویر تھی کچھ بول رہی تھی
لہراتے ہوئے آئے تھے وہ امن کا پرچم
پرچم کو اٹھائے ہوئے نیزے کی انی تھی
✽ ناصر خان..... کوئٹہ

جو مری پیاس کو بھڑکائے نہ لب تک پہنچے
ایسے پانی کو تو میں آگ لگانا چاہوں

✽ مہتاب احمد..... حیدرآباد

ساتھ اس کے کوئی منظر کوئی پس منظر نہ ہو
اس طرح میں چاہتا ہوں اس کو تنہا دیکھنا
✽ عمران شیر والی..... لاہور

جو دل کے سمندر سے ابھرتا ہے یقین ہے
جو ذہن کے ساحل سے گزرتا ہے گماں ہے
✽ رمشا ذیشان..... کراچی

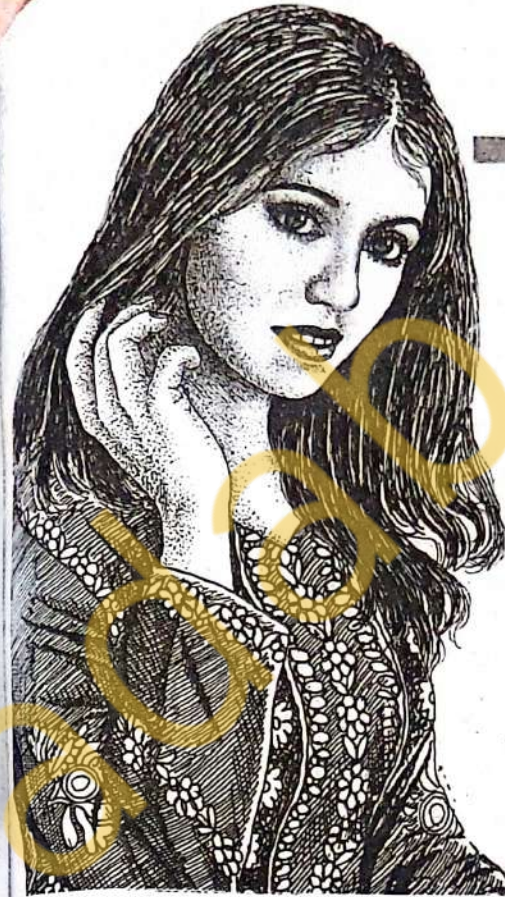
درد کا احساس مجھ کو درد سے پہلے بھی ہے
چوٹ وہ سہلا رہا ہوں جو ابھی کھائی نہیں
✽ حرا خان..... مری

میں بھلا کون کسی حرف پہ انگلی رکھوں
تو ہر کاتب مختار ہے جو تو لکھے
✽ عدیم شاہ..... اوکاڑہ

چمن کا دُشمن ہوا اک مسئلہ، میری طرف
اس نے کل دیکھا تھا کیوں اور آج کیوں دیکھا نہیں
✽ ایم یونس..... مردان

کتنا آسان ہے تائید کی خوش کر لینا
کتنا دشوار ہے اپنی کوئی رائے رکھنا
✽ آذین رضوان..... کراچی

اک تبسم، ہزار شکوں کا
کتنا پیارا جواب ہوتا ہے



✽ عبدالعزیز..... گوبرا نوالہ

ہزار سانچے پردیس میں گزرتے ہیں
جو ہوئے تو بھی ہم سے رابطہ رکھنا
✽ روبینہ ملک..... بہاولپور

مشغلہ اس نے عجب سوچ دیا ہے یارو
عمر بھر سوچے رہے کہ وہ کیسا ہوگا
جانے کس رنگ سے روئے گی طبیعت اس کی
جانے کس ڈھنگ سے اب اُس کو منانا ہوگا

✽ ذکیہ احمد..... پکوال

ایک کٹر چمیک کر دیکھو ذرا تالاب میں
کس قدر آہستی ہیں موجیں سینہ چتاب میں
✽ پرویز علی..... ملتان

داستانِ دل نہیں ہے آپ بنے تو کیا
ہم جنائے آسمان کا ماجرا کہنے کو ہیں

✽ وقاص علی..... روہڑی

آہستہ دیکھ ذرا، کیا میں غلط کہتا ہوں
ڈونے خود سے بھی کوئی بات چھا رہی ہے
دُخم کرے دل مرا ویسے دھڑکے
چمکری تیرے اشاروں سے ملا رہی ہے
✽ پروین خان..... ماہرہ

جڑے بھی گئے جاتے ہیں دیوار بدن پر
اور دستِ ستم مگر بھی دکھائی نہیں دیتا
آنکھیں بھی ہیں، رست بھی، چراغوں کی ضیا بھی
ب کچھ ہے مگر کچھ بھی بھائی نہیں دیتا
✽ عائشہ نواز..... کراچی

اتھار ہم کریں کہ ادھر سے ہو ابتدا
برسوں گزر گئے ہیں یہی سوچتے ہوئے
✽ فہیمہ ثاقب..... ملتان

نصرت سے کسی کے ہم نے کی ہے گفتگو برسوں
ری ہے ایک تصویر خیالی رو برد برسوں
✽ طوبی احمد..... بسکی

دل جو انتظار ہے، آنکھیں ہیں فرشِ راہ
آہستہ تو جانے والوں کے شہر میں
✽ ثناء صاقل..... کراچی

دست کے بعد پائی ہے رس گھولتی صدا
لیکن کچھ اتنی رخ کہ بس ہوش اڑ گئے
✽ محمد امین..... کراچی

انداز گفتگو کی نزاکت تو دیکھنا
اس ہنس کے بات بات پہ مل کھا رہے ہیں وہ
✽ شاہین تبسم..... سرگودھا

لپٹ آئے ہیں شاید انقلاب دید کے لمحے
نظر کی وسعتوں میں ڈوبتا جاتا ہے نظارہ
✽ شگور احمد..... چیچہ وطنی

اس شونخ کی ادائے تغافل کو کیا کہوں
دوسے کا ذکر آتے ہی انجمن بن گیا
✽ محمود خان..... ٹنڈوالہیار

لجے کا کرشمہ ہے کہ آواز کا جادو
"بات بھی کہہ جائے مرا دل بھی دُکھے تا"

✽ خرم نقوی..... سرگودھا

کئی جب بات مطلب کی تو وہ کہنے لگے ہنس کر
کہ سب کچھ اور ممکن ہے پر ایسا ہو نہیں سکتا
✽ خالد علی..... خوشاب

کچھ بھی کہتے نہیں ہم ان سے بہت کچھ کہہ کے
بات ہوتی ہے مگر بات کہاں ہوتی ہے
✽ مریم گفرار..... گوبرا خان

لاکھ ہونٹوں پہ تبسم کی کرن رقصاں ہو
درد بھر درد ہے چہرے سے نمایاں ہوگا
✽ طاہر علی..... دہاڑی

دلف کا بادل، بدن کی روشنی، آنکھوں کی شام
اس زمیں پر آسمان پھیلا ہے میرے سامنے
✽ عظیم احمد..... جنگ شلی

میں تو خائف تھا بہت، آپ نے ہنس کر لیکن
کر دیا بات کا آغاز، خدا خیر کرے
✽ ضیا آرا میں..... جیوٹ

دُخم کھا کر مسکراتا ہے ہمارا مشغلہ
مسکرا کر دُخم دیتا یہ تمہارا کام ہے
✽ احسان شاہی..... کراچی

ایک لمحہ ہی مسرت کا بہت ہے لیکن
لوگ جینے کا سلیقہ ہی کہاں رکھتے ہیں
✽ نورین ایوب..... بہاولنگر

یہ ناز ہے کہ بڑی آرزو میں جیتے ہیں
یہ فخر ہے کہ بڑی ذات سے تعلق ہے
✽ ناملہ وجاہت..... ڈی جی خان

برے چہرے پہ دکھائے کا تبسم ہے مگر
ہری ان آنکھوں میں یادوں کے دیے جلتے ہیں
✽ فوزیہ رحمان..... ساہیوال

پھول بننے کی خوشی میں مسکراتی تھی کلی
کیا خبر تھی یہ تغیر موت کا پیغام ہے
✽ حنا خان..... مری

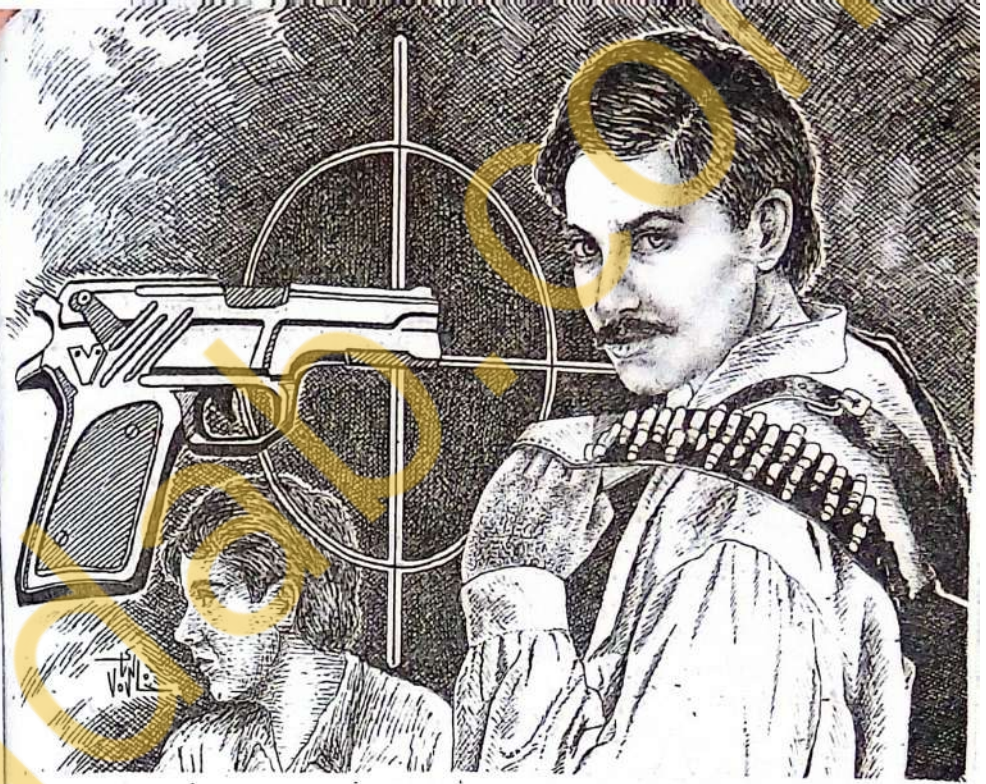
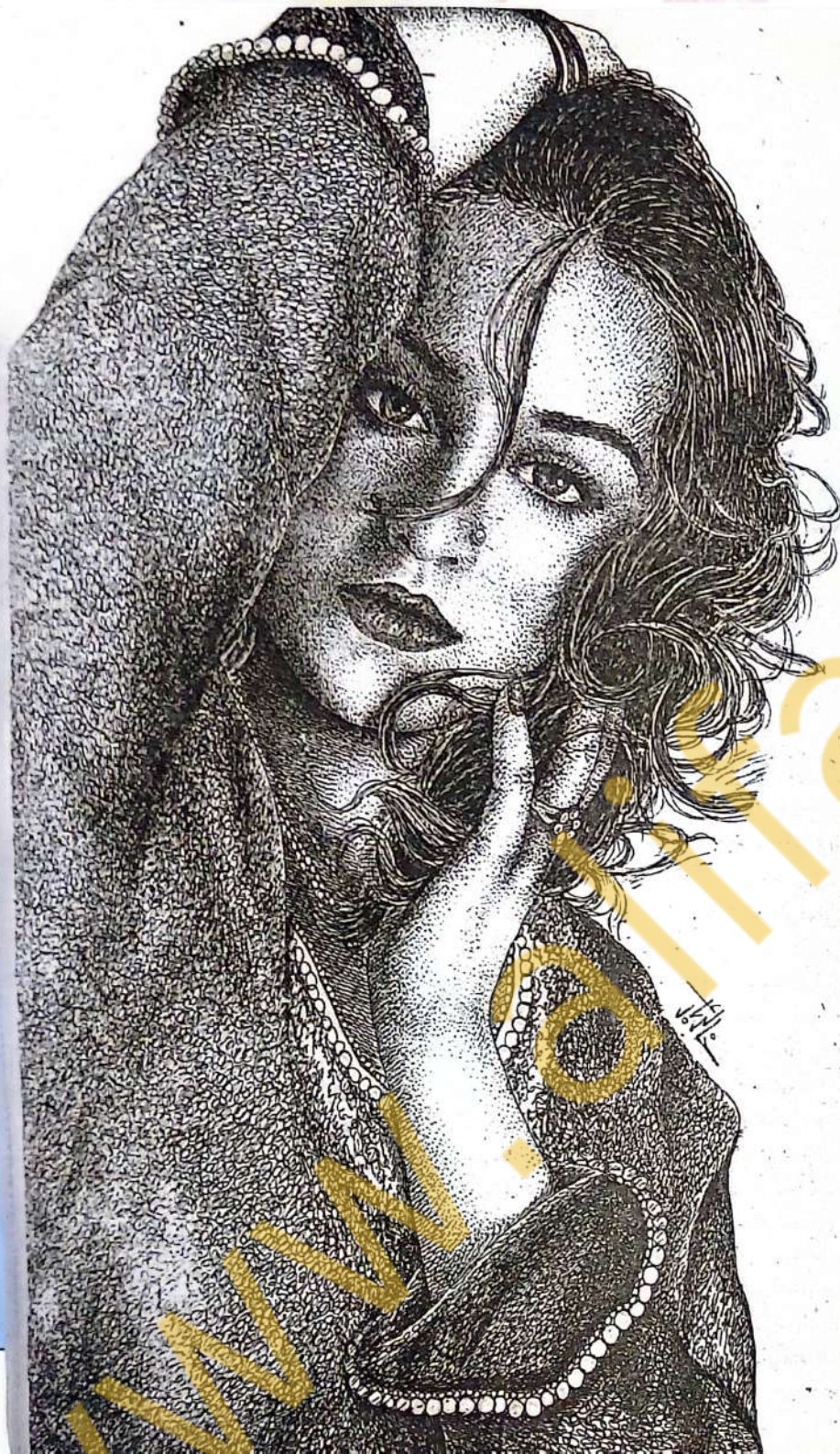
ہم سے تو بھولے سے بھی اس کو بھلایا نہ گیا
ہائے وہ لوگ جو ہر بات بھلا دیتے ہیں

کتابیں

نویں

20-24

نام:
پتا:



جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

بتیسویں قسط

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش
لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ
تقدیر سے زراہ تدبیر پر بھروسہ کرتے ہیں... وہ جو حالات
کی زنجیر میں قید ہو سیدہ درو دیوار تک محدود تھا تمام تر
معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ پخیزیں میں
مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے...
چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے
اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں...
سنگین ہنگاموں اور تحیز انگیز چالوں سے نا آشنا تھا... ایسا
بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ
گئیں... اس کے ذہن میں قید نا آسودہ خواہشوں کا بھنور اسے
کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے
والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا
کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور زندگی کی خول ریز سازشوں اور زحمت

زحمت ہونے والے ایک جنگ باز کی ولد و داستان

روشنیوں کا شہر کراچی..... اس نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے، ان گنت داستانوں کی اہمیت اس مہمان کو کے کسی کو نہ مل سہا رب خان یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب محلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے حامل باپ کا ایسا مختلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا مار پیٹ کا نشانہ بنتا رہتا۔ میری ایک بہن بھی راجہ مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری بہن نہیں تھی، خالد زائگی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک نگاہی سادے میں بیٹھے تھے اور ماں نے اسے میرے ساتھ ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ یہ راز صرف میری ماں اور راجہ ہی جانتے تھے۔ راجہ بچپن سے ہی مجھے ایک بھائی کی نہیں بلکہ کسی اور ہی ”لگا“ سے دیکھا کرتی۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن میں اب بھی اسے ایک ”بھین“ کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ میرا باپ، ماں کو مارا پیٹتا کرتا تھا۔ ایک دن ماں کو اس نے گھر اڑھن دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سیدھے تانے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا یہ دیکھ کر بڑے برسرِ بڑھ گیا اور اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے ایک حد تک جرائم کی طرف راہِ حاضروں یا قاتل میں جلدی سنبھال گیا مگر اس ”سنبھالنے“ کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک ٹیکسٹری میں معمولی ورکر تھے۔ گلی کے محلے میں ہی تین، تین عمر کے میرے بھائی تھے۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے کا راجہ اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری بہن اور آخری محبت تھی۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے اڈاکار بن گئے۔ اقبال نامی اور میرا گھر ہمارا ”باس“ کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چار بایرون (سلیم، راجہ، ماجد اور مجھے) ایک روز آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا جہاں ہمیں لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ گروہ نے ہمارے ناموں کے ساتھ عجیب و غریب قسم کے ”لاچے“ تھپی کر ڈالے۔ میں سہرا ب لہو کہلایا۔ سلیم کے ساتھ ”چھاپا“ تھپی ہو گیا۔ راجہ ”بوری“ ہو گیا جبکہ ماجد ”ماجہ“۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ جتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہمارے ٹیکسٹری مالک سینٹر سکندر سے بتائے کے لیے ”باس“ اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میری غیرت جاگی۔ میں نے سلیم و فیروز کو بھانسنے کی کوشش کی مگر وہ میرے ہی دشمن ہو گئے، تاہم میں نے سینٹر سکندر کے ساتھ ٹھک حلال کیا اور اسے سب بائیں بتا دیں۔ میں نے بروقت ہم کی اطلاع دے کر سکڑوں غریب ورکروں کی جان بچائی۔ گروہ سمیت میرے تینوں بایریری جان کے دشمن ہو گئے۔ سینٹر سکندر کی جوان سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری ”ٹنگ حلالی“ سے متاثر ہوئی۔ سینٹر سکندر کا سالہا سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب تھا۔ وہ سدرہ کی ماں کا سوتیلہ بھائی تھا۔ میں نے اس کی پلاننگ آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماہے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ فوزیہ مجھ سے متنفر ہو گئی تھی کیونکہ بعد میں راجہ نے اسے حقیقت بتا ڈالی تھی۔ میں لاکھ اپ ہوا۔ اسی دوران کوئی ”پھو خان“ نامی انجینیئر کی مدد سے کسی طرح قانون سے رہائی پائی۔ باس اقبال، سلیم چھاپا اور راجہ جوری میرے خون کی بوس گھٹتے پھر رہے تھے۔ میں راجہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ وہاں سدرہ کو کوئی مکان خالی پڑا تھا۔ ٹرین کراچی سے پنجاب کے لیے روانہ ہوئی اور صادق آباد میں فوزیہ اور راجہ سیلے سے پھڑ کر میں باا ”چوہری جی برادران“ کے نرسے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی تنگ سے چوہری شالامی نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام ناتھ تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چوہری جی برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادو میری ذمے داری بن گئی۔ وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اسے درحقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام بختیار تھا۔ بختیار راجہ جن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راجہ کو بھی میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ سیالکوٹ میں ایک ماں بیٹی سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ محلے دار تھیں۔ لڑکی بخت اور ماں شگفتہ خاتون۔ بخت کسی دیم نامی لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ دونوں فائننگ کلب کے ممبر بھی تھے۔ عقدہ کھلا کر شگفتہ، باس اقبال کی مشکوچہ تھی اور بخت جینی مگر شوہر کی بجرمانہ زندگی سے تنگ آ کر شگفتہ اپنی بیٹی بخت کے ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن گئی تھی۔ فائننگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جونی پر اودست بن گیا۔ بخت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات کرتی تھی۔ سیالکوٹ میں اقبال چوک پر اس کے باپ یعنی باس کا بنگلا تھا۔ ایک خفیہ گروہ ”کالی لہر“ سے میرا انکار ہو گیا۔ یہ جا دو نو نے کرنے والا گروہ تھا۔ عدیل جو کہ بخت کی شہس کا بھائی تھا ان کے ہاتھوں مارا گیا۔ بخت ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلہ کار تھا۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن گیا۔ کالی لہر کے رانٹا یا اور میڈم بھی سے میری دشمنی عروج پر تھی اور ان کے میرے خلاف جا دو نو نے بھی۔ میرا دشمن باس اقبال بھی ان کی جا دوئی ہاتھوں کی زد میں آ کر اسپتال پہنچ گیا۔ اس کی بیٹی بخت میری دشمن بن گئی جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون مجھے بھائی سمجھتی تھی۔ اب میری بیک وقت جنگ بازی..... باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چوہری جی برادران اور کالی لہر والوں کے ساتھ جاری تھی۔ میں راجہ کا پیچھا کرتے ہوئے رانٹا یا کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے اٹھا کر قاتل ہاؤس لے آیا۔ رانٹا نے متر پڑھنا شروع کر دیے۔ مجھے سر پر کچھ مار کر کر بے ہوش کروا گیا اور جب ہوش آیا تو وہ لوگ مار مار کر انے لگے کہ میں مر چکا ہوں اور میری روح ان کے قبضے میں ہے۔ عجیب عجیب شبیدہ بانیاں دکھائی گئیں، پھر مجھے حالت بے ہوش میں قبر میں دفن کیا گیا۔ انہوں نے کچھ کھلا کر میرے جسم کو مفلوج کر دیا تھا۔ وہاں بیچو نے حملہ کیا اور جب ہی بچی مدد ہوئی اور ایک ماں بیٹی نے مجھے قبر سے نکالا۔ میری حالت درگزر تھی۔ پھر میری محسن میرا علاج کرنے لگی۔ ان ماں بیٹی کو کچھ دس والوں نے

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

دور کر دیا تھا۔ وہاں کے چوہری کا بیٹا صمد یا ریشمی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ وہاں آ کر ہم لوگوں کو ہراساں کرنے لگا۔ ماں میرے علاج کی غرض سے خاص ہوئی لیکن سرحد پار نکل گئی۔ ماں خاص ہوئی لے آئی تھی اور اس نے دو اکا سلف اور نکل تیار کر لیا تھا۔ دالے مجھ پر جا دوئی اڑ رہا تھا اور میرے اندر طاقت کا خزانہ بھر گیا۔ جنگل میں عورت کی بیچ پر میں وہاں پہنچا تو دیکھا ایک تیندو عورت کو دوپٹے ہونے تھا۔ میں نے درمے سے کوشکھانے لگا دیا۔ دشمنی عورت صمد یار کی ماں شملہ خانم بھی۔ صمد یار کے گناہوں نے ماں کی مڑھی کو آگ لگا دی۔ میں انہیں تھانے لے گیا تاہم انہوں نے مجھے ہی لاکھ اپ کر دیا۔ میں تھانے سے بھاگ نکلا۔ مجھے شملہ خانم نے ایک ڈاکٹر کے کلینک پر بھرا دیا۔ جب تھوڑا بخشش کی تو چاچا ڈاکٹر ہمیں پھنسا نا چاہتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو گرفت میں لیا۔ دھیکہ بخشش میں ڈاکٹر جان سے چلا گیا اور میں ماں اور ریشمی کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میں استاد جونی کے ٹھکانے پر آ گیا۔ وہاں سے ہم کالی لہر والوں کے ایک ٹھکانے پر پہنچے تو وہاں نزاکت اور اڑاؤں کی لائیں تھیں۔ میں نے انتقام لینے کی ضمان لی۔ وہاں سے میں ایک تصانی صورت بد معاش کو اپنے ٹھکانے پر لے آیا۔ اس پر تشدد کر کے ہم سلومات لے رہے تھے کہ وہاں ہانڈیوں کی بارش ہو گئی۔ ہم نے دشمنوں کو مار بھاگا اور قبضے میں موجو بد معاش سے کالی حویلی کا پتہ معلوم کر لیا۔ ہم کالی حویلی پہنچ گئے۔ وہاں میرا رانٹا سے ٹکرا ہوا۔ رانٹا نے استاد جونی کو شہید کر دیا۔ میں نے رانٹا کی ایک ٹانگ کاٹ ڈالی تاہم رانٹا جیج ٹھکانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں دشمن کے ایک اور ٹھکانے پر پہنچا تاہم انہوں نے مجھے قابو کر لیا۔ میں ڈھکی بھکی ہو گیا۔ اچانک وہاں سلیم نے حملہ کر دیا۔ مجھے وہاں سے نکال لیا گیا۔ سلیم اور چوہری برادران نے مجھ سے مفاہمت کر لی تاہم اس کے پیچھے ان کو کوئی خاص مقصد تھا۔ راجہ بھی انہی لوگوں کے پاس تھی۔ سلیم اور میں نے راجہ جیو کو چھاپنے کی کوشش کی تاہم ہمیں ناکامی ہوئی۔ وہاں سے وہاں پر ایک جگہ۔ یو۔ بیس اور پولیس نظر آئی۔ وہ کسی لاش کو اغار رہے تھے۔ جینکو مار دیا گیا تھا۔ میں نے انتقام کی ضمان لی۔ میں نے تیسور کو چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کی ٹیکسٹری پہنچ گیا۔ وہ لوگ کوئی ”شے“ لے کر کہیں جا رہے تھے۔ میں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ ایک مقام پر میری گاڑی کا ٹرک پھڑک رہا تھا۔ میں نے پیدل ہی ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ اچانک دوڑتے ہوئے میں گڑھے میں گر کر سر پر چوٹ لگنے سے بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا راجہ تیسور اور ڈرائیور ہلاک ہو چکے تھے اور کینوس سے ڈھکی شے غائب تھی۔ راجہ تیسور کا ایک ساتھی زندہ میرے ہتھے چڑھ گیا۔ معلومات پر پتا چلا کہ کسی گروہ نے انہیں ہلاک کیا تھا اور یو۔ بیو گانا قدیم جسم لے اڑے تھے۔ میں نے میڈم بھی تک پہنچنے کے لیے ان کا پیچھا کیا اور ان کے ساتھیوں کی کشتی میں سوار ہو گیا۔ ہم انڈین حدود میں داخل ہو گئے۔ یو۔ بیو گانا بھیر بھی انہی کے پاس تھا۔ کئی ایک جگہ کی تو بیٹریوں نے حملہ کر دیا تاہم ہم بیٹریوں سے نشت لیا گیا۔ آگے چل کر ایک مگر چھپے ہم پر حملہ کیا اور کشتی میں صرف دو افراد بچے۔ ایک میں اور دوسری شینا۔ میں نے شینا کو اٹھی سیدی کھانی سنا کر اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ ہماری کشتی عدی کی طغیانی کے باعث تباہ ہو گئی۔ ہم ایک جگہ پہنچ گئے۔ شینا دشمنی ہو گئی۔ وہاں موجود میاں بیوی نے ہماری مدد کی۔ ہم ان کے گھر آ گئے تاہم وہاں خائف گروہ کے لوگ آ گئے۔ انہوں نے ہمیں پکڑ لیا تاہم میں ان کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ میں وہاں اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو وہاں مخالف گروہ کا باس اور ایک لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ جنگی اس کی جان کے درپے تھا۔ میں نے جنگی کو ٹھکانے لگا دیا۔ باس البرٹ رمندو اور اس کی ساتھی یو۔ بیو گانا کے مجھے کے پکڑ میں تھے۔ میں اور شینا انہیں جل دے کر نکل گئے۔ تاہم وہ پیچھا کرتے رہے۔ ایک جگہ جنگل میں باس کے ساتھی مارے گئے اور وہ ہمیں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ میں اور شینا ایک بستی میں پہنچ گئے۔ وہاں شینا کے ساتھی میری طرف سے مشکوک ہو گئے اور میرے پیچھے پڑ گئے۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ ابھی راستے میں تھا کہ سرحدی محافظین کی چوکی آ گئی۔ میں انہیں جل دینے میں کامیاب ہو گیا۔ میں ایک شخص رام راج کو پیسے دے کر رانٹا لگا کے لیے روانہ ہو گیا تاہم راستے میں انڈین فورس نے پکڑ لیا۔ ابھی وہ پوچھ گچھ کر رہی رہے تھے کہ وہاں حملہ ہو گیا اور میں ”الفا“ نامی تنظیم کی تحویل میں چلا گیا پھر وہاں مجھے مارنے کی کوشش کی گئی۔ میں وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔ راستے میں مجھے کچھ مار گریزے۔ انہیں دشمنوں کے چکل سے ٹال کر ہم وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ گوراپانی ایک سرکس کمپنی سے تعلق رکھتی تھی اور وہاں ایک گوریلو پکڑے آئے تھے۔ وحشی قبیلان کا دشمن ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے مدد کا کہا۔ میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ دشمنوں کی تحویل سے گاڑیاں ٹٹانے کے پکڑ میں مارا گیا۔ مارا گیا۔ رانٹا نے گرگینڈو کو قاتل کر لیا اور ہمارا دھکی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم مارا یا کے سرکس والی جگہ پہنچ گئے۔ وہاں میری رانٹا یا کے گھبرے لڑائی ہوئی اور وہ میرا دشمن ہو گیا۔ شہر سیدی غیر قانونی دھندے میں ملوث تھا۔ مارا یا کو اس کی حقیقت پتا چل گئی۔ سیدی نے انڈین پولیس کو میرے بارے میں آگاہ کر دیا۔ پولیس ریڈ پر میں چھپ گیا مگر گندگی میں جا کر اس سے جلدی بیماری لگ گئی اور میری حالت خراب ہو گئی۔ میں نے دواں کام کرنے والی لڑکی کو سیدی کے پیچھے لگا دیا۔ تو کی پاما کوٹل کر دیا گیا۔ مارا یا نے میرا علاج کرایا اور میں صحت مند ہو گیا۔ شہر سیدی اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ میں وہاں سے رانٹا مانی روانہ ہو گیا۔ میں ایک آبادی میں پہنچ گیا وہاں حالات کافی خدوش تھے۔ میرا وہاں اٹن کے گروہ سے ٹکراؤ ہو گیا۔ میں نے انہیں زیر کر دیا۔ دشمن کے علاقے میں رمندو سے میرا سامنا ہو گیا۔ وہ یو۔ بیو گانا کے مجھے کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شینا کو بھی اغوا کر لیا تھا۔

میں شینا سے فوزیہ کے حلق جانکاری لے رہا تھا کہ البرٹ رمٹو وہاں آگیا۔ میں نے اس سے غلط بیانی کے بارے میں پوچھا تو اس نے جوا بکہا۔
”کیسی غلط بیانی مائی بڑی؟“ وہ منافقانہ حیرت سے بولا۔ میں تپ کر رہ گیا۔ اسی لمحے میں بولا۔

”اتنے بولے بادشاہ مت جو رمٹو میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ اس رات چائلڈر اور الیانا شینا کو نہیں، فوزیہ کو اٹھالائے تھے، جب انہیں اس قیدی لڑکی (فوزیہ) کی میرے حوالے سے حقیقت کا علم ہوا تھا۔ چونکہ تمہارا میرے ساتھ نگر اور ہوجا تھا تم فوراً سارا قصہ سمجھ گئے۔“
”اوہ، بہت ذہین اور زود فہم ہو تم..... مان گئے۔“

رمٹو دکھائی دے نہ سکا۔

”بکواس بند کر دو اور مجھے بتاؤ فوزیہ کو تم نے کون سے غار میں چھپا رکھا ہے؟“ میں گرج کر بولا۔ برگنڈی نے یکدم اپنے ہولسٹر سے پستول نکال کر مجھ پر تان لیا۔

”ایزی مائی بڑی..... ایزی۔“ رمٹو دونوں ہاتھ بلند کر کے مجھ سے بولا۔ ”یہاں بنگا مہ کرنا ہم دونوں کو ہی مہنگا پڑے گا۔ یہاں ہماری کسی کو بینگ بھی پڑ گئی تو پورا قبیلہ ادھر بلا بول دے گا کیونکہ اس وقت ہم ایک کسی کے سوا رہے ہیں، ایک ہی قسم کی نازک صورت حال سے بھی دو چار ہیں۔“

اس کی مکاری پر میں دانت پیس کر رہ گیا۔
”ایک لمحے کی بھی تاخیر کے بغیر میری ساتھی کو یہاں پیش کر دو رمٹو اور میں کسی بات کی پروا نہیں کروں گا۔“ میں نے اسی طرح کر جتے لہجے میں کہا۔

”جی..... جی.....“ رمٹو نے طنزیہ انداز میں ہنکارا مگر لیکن پھر ایک دم سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔
”کسی خوش فہمی میں مت رہنا سہراب! ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور میں نے صرف تم سے ڈیل کی ہے اور ڈیل ہمیشہ دوست خائفین کے درمیان ہوتی ہے، دوستوں کے بیچ نہیں۔“

”میں پہلے ہی اس بات کا اندازہ کر چکا ہوں رمٹو! خوش فہمی کا شکار شاید تم تھے۔ وقت ضائع مت کرو ورنہ میں سب کچھ تمہیں نہس کر ڈالوں گا۔“ میں نے جلتے سیکتے لہجے میں کہا۔ میرے اندر جیسے ایک خوابیدہ آتش فشاں پھٹنے اور لاوا اٹھنے کو تیار تھا۔

رمٹو کی آنکھوں میں جارحانہ چمک ابھری۔ برگنڈی پہلے ہی حکم کے لیے تیار تھا۔ اس نے پستل کا سیٹھی لیور بھی ہٹا لیا تھا۔

”سہراب! اس طرح کی گیدڑ بھکیوں سے تم اپنا نقصان کر لو گے۔ میں تو بچ کر صاف نکل جاؤں گا۔ میرا اطمینان بہت قریب تیار موجود ہے لیکن تم ان وحشیوں سے بچ کر نہیں نکل سکتے کیونکہ تمہاری کوٹ یہاں پھنسی ہوئی ہے۔“
میرے اندر جارحانہ جنبش ابھری۔ برگنڈی کی آنکھیں میری ایک ایک حرکت پر جچی رہیں۔ اس کا پستل والا ہاتھ بار بار متحرک ہو رہا تھا۔ لمحہ بھر میں مجھے بے بسی کا احساس ہوا۔

البرٹ رمٹو بہر حال کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ ایک عالمی کیسٹلر تھا۔ ”سحرانی عقاب“ کے کلاندوں کا جال نہ جانے کہاں تک پھیلا ہوا تھا، اس کا اندازہ مجھے ہوتا رہا تھا۔ وہ کسی بھی وقت کہیں سے بھی اپنے لیے کلک بلوانے پر قادر تھا۔

”کیا چاہتے ہو تم؟“ میں نے اپنے تپتے ہوئے اعصاب اور پھرے ہوئے حواسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”گڈ مائی بڑی ایہ ہوئی نا بات۔ اسے ہی ڈیل کتے ہیں۔ آؤ، میرے ساتھ اندر بیٹھ کر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔“ اس نے مجھ سے کہا۔

میں نے شینا کی طرف گردن گھما کر دیکھا۔ ”اس کی حالت تو جہ طلب ہے رمٹو! اس کا زخم خراب ہو رہا ہے۔“ ”بجائیں میں جانے یہ۔“ میں نے برگنڈی کو اسے ہلاک کر ڈالنے کا حکم دے دیا ہے۔“ رمٹو دسفا کی سے بولا۔ میں لرز گیا، بولا۔

”تمہیں رمٹو! اسے مت ہلاک کرو۔ جب تک تمہارا مقصد پورا نہیں ہو جاتا ہے تک اسے قیدی بنائے رکھو۔“ ”اوہ.....! دو دو عشق کرنے چلے ہو مائی بڑی!“ رمٹو طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔

”یہ بات نہیں ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ میری ساتھی رہ چکی ہے اور اس کے مجھ پر کئی احسانات ہیں۔“ ”ٹھیک ہے، اگر تمہاری یہی وش ہے تو ایسا ہی

کسی۔“ رمٹو نے جواب دیا۔
”تمہارا شکر ہے رمٹو! لیکن پلیز، اس کی حالت ذرا سنبھالو۔ اس کا گھٹا زخم خراب ہو رہا ہے۔ یہ اس طرح مرجائے گی۔“ ”میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں کوئی ڈاکٹر نہیں ہوں۔“ رمٹو نے سرودھری سے جواب میں کہا۔ میں بے بسی سے ہونٹ کلٹنے لگا۔ شینا کو وہ آؤ انہیں کر سکتا تھا ورنہ وہ اپنے قبیلے میں لوٹ کر اپنا علاج کروا لیتی مگر یہاں قیدی میں رہتے ہوئے بھی اس کی جان کو خطرہ تھا۔ ہم میں سے کوئی ڈاکٹر نہ تھا

ذہنی حکمت سے واقف۔
”میرے پاس ایک تجویز ہے۔“ میں نے کہا۔
”وہ کیا؟“
”میں شینا کو اپنے ساتھیوں کے پاس چھوڑنا چاہتا ہوں۔ وہیں اس کا علاج ممکن ہو سکتا ہے اور تم بے فکر رہو، جب تک تمہارا مقصد پورا نہیں ہو جاتا، یہ میرے ساتھیوں کے پاس قید رہے گی۔“

میرا ارادہ شینا کو چودھری اسلام شاہ کی حویلی میں چھوڑنے کا تھا۔

”یہ کیا ہے تو قوفوں والی باتیں کر رہے ہو سہراب!“ رمٹو جھڑک کر بولا۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ایسا خطرناک رسک لوں گا؟“ ”دیکھو.....“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی

لیکن اس نے میری بات درمیان میں کاٹ دی۔
”بس، تم چلو میرے ساتھ۔ میں الیانا کو کہہ کر اس کی تھوڑی بہت مرہم پٹی کروائے دیتا ہوں۔ بعد میں اس کے بارے میں سوچ لیں گے۔“ کہتے ہوئے اس نے برگنڈی سے جانے کیا کہا پھر ہم اسی کشادہ غار میں لوٹ آئے جہاں تھوڑی دیر پہلے موجود تھے۔

”اب فوزیہ کے بارے میں بتاؤ۔ اسے تم نے کدھر یہ غمال بنا رکھا ہے؟“ استفسار یہ انداز میں کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں جمادیں۔
”بڑی! میں نے کہا نا، اس کی فکر نہ کرو۔ وہ محفوظ ہے۔ تمہیں میرے ساتھ ابھی ایک مہم پر چلنا ہوگا۔“

”میں اس سے ایک ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے رک رک کر دھڑکنے والے دل سے کہا۔

اس مردود نے نفی میں اپنے سر کو جنبش دی۔ ”پہلے تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔ جب تک کہ یوبورگا کا مجسمہ میرے قبضے میں نہیں آ جاتا۔“

برگنڈی ہنوز موجود تھا۔ الیانا اور چائلڈر نہ جانے کہاں تھے۔ ان کا اچانک ”غائب“ ہونا مجھے ابھی تک کلک رہا تھا۔

”تم کیا سمجھتے ہو، یہ مہم اتنی آسان ہے کہ ہم ابھی بھیڑیوں کے بھٹ میں جا ٹھہیں اور وہ مجسمہ آسانی سے چوری کر کے لے آئیں گے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اس میں وقت بھی لگ سکتا ہے۔ یہ بہت خطرناک کام ہے۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے کہ دکان سے جا کر کوئی من پسند کھانا آسانی سے اٹھا لے۔“
”میں سمجھ رہا ہوں۔“ رمٹو بولا۔

”جہیں آخر اتنی جلد بازی کی بات کی ہے رمٹو؟“ میں نے پوچھا۔ کیونکہ اس وقت چائلڈر کی باتیں میرے ذہن میں گردش کر رہی تھیں جو اس نے اپنی ساتھی الیانا سے مجھے سے متعلق کی تھیں۔

”اس جلد بازی کی وجہ بالخصوص میرے لیے بہت اہم ہے بڑی!“

مجھے کوئی شوق نہ تھا کہ اس منوس مجھے سے متعلق تجسس میں مبتلا ہوتا رہوں لیکن میں صرف اس کی دلچسپی اور کمزوری کو جانچنا چاہتا تھا جو بعد میں ماسواقی حالات میں شاید میرے کام آتی، بولا۔

”مجھے اس کی وجہ بتانا پسند کرو گے؟“

”دنیا کی دو بڑی بدنام زمانہ اعلیٰ جنس اس کے حصول میں اچانک ہی معروف ہو چکی ہیں۔“ وہ جواب میں بتانے لگا۔ ”مسیبیت اور تفتیش کی بات تو یہ ہے کہ انہیں یہ ہینک بھی مل چکی ہے کہ یوبورگا کا مجسمہ پتہ لگ کر اس دور دراز سرزمین میں ایک وحشی قبیلہ شکاری ملکیت میں ہے۔“ ”آخر اس مجسمے کی ایسی کیا اہمیت ہے کہ تمہاری طرح کے عالمی مجرم سمیت ملکی اعلیٰ جنس بھی اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئی ہے؟ کم از کم مجھے تو سونے چاندی کا کھیل نظر نہیں آتا۔“

”تمہارے ساتھی کدھر ہیں؟ دریا کے اس پار یا اس پار؟“ اس نے اچانک موضوع بدل دیا۔ میں نے بھی پروا کی نہ اصرار۔ جواب میں کسی حد تک سچ بولا۔

”اس پار۔“
”ہم۔“ اس نے ایک ہمدردی بھری۔ ”تو بھر پلے؟“
”کہاں؟“

”دشمنوں پر شب خون مارنے..... وہیں تمہاری گرل فرینڈ سے بھی ملاقات کرائے دیتا ہوں۔“ وہ بولا اور اس کے یوں بات بدلنے پر میرے تن بدن میں آگ کی لگ گئی۔ میں پھر کر بولا۔

”یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم رمٹو! مجھے چکر دے رہے ہو۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ.....“

”شت آپ!“ رمٹو گرج کر بولا۔ ”اپنا لہجہ درست رکھو۔ تم نے غلط معنی میں میری بات لی ہے۔“

”ابھی تم نے کہا تھا کہ فوزیہ تمہارے قبضے میں ہے۔“ ”میں نے کب کہا تھا؟“ وہ بولا۔ ”تم غلط سمجھے ہو۔“

اس خبیث کی بات پر میں نے اپنی طلسمی سنگی کیفایت پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وقت اور حالات نازک تھے۔ غصہ اور اچھٹا مناسب نہ تھا۔ وہ آگے بولا۔

آگے بڑھنے کی جرأت کرتے۔ یہ سارا فساد کالی لہروالوں ہی کا پھیلا یا ہوا تھا۔

برگنڈی سب سے آگے تھا۔ درمیان میں رمنڈو اور میں تھے۔ ہمارے عقب میں الیانا تھی۔ چائلڈز اور باقی دو ساتھی اپنے غار والے خفیہ ٹھکانے میں ہی تھے۔ جنگل بہت گھنا تھا۔ رات آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ فوزیہ سے جلد از جلد ملنا میرے اندر عجیب سریش بھی جگا تا اور دوسرے بھی کہ نہ جانے وہ کن حالوں میں تھی۔ جی بھی یا رمنڈو بد بخت نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ جب تک میں فوزیہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں دیکھ لیتا، میری تسلی نہیں ہونے والی تھی۔

جی بات یہی تھی کہ ابھی فوزیہ کے متعلق میں بالکل اندمیرے میں تھا۔ رمنڈو کی باتیں مجھے جو اس لگ رہی تھیں لیکن میں اس پوزیشن میں نہ تھا کہ زبردستی اس کے منہ سے سچ اگوا سکا۔

یہی وجہ تھی کہ میں جلد از جلد فوزیہ کے متعلق سچ جاننے کے لیے مردود رمنڈو کے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گیا تھا پھر حالات بھی ایسے تھے کہ کم از کم فوزیہ کو برآمد کرنے والی ہم خاموشی اور ازاداری سے نمٹائے جانے کی منتا ضعی تھی۔

رمنڈو نے واقعی بہت احتیاط کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنا خفیہ ٹھکانا شروع پاقیقلے کی آبادی سے بہت دور بنایا تھا۔ ہمیں چلتے چلتے جگمگاتی ہوئی جنگل اتنا گہرا تھا کہ صاف صاف کی روشنی اندھیرے کا ہی ساں باندھے ہوئے تھی۔ ہم راستے میں صرف ایک جگہ رکے تھے، اس کے بعد پھر چل پڑے۔ جب سورج نے مشرق سے ذرا سر اُبھارا اور کچھ آس پاس جنگل کے مناظر واضح ہونے لگے تو ایک مقام پر رمنڈو نے رک کر ہمیں مزید محتاط رہنے کا کہا۔

جہاں ہم دوسری بار ذرا دیر کو ٹھہرے تھے، دائیں جانب پہاڑی تھی، بائیں جانب جنگل اور سیدھ میں مل کھاتا راستہ تھا۔ ہم سب ہتھیار بدست تھے۔ مجھے صرف ایک پٹیل دیا گیا تھا۔ میرے پاس اضافی رائونڈ کا کوئی کلپ نہ تھا۔ اس میں رمنڈو کی کیا حکمت عملی ہو سکتی تھی، یہ میں بخوبی سمجھ سکتا تھا۔

”یہ راستہ انہی کی آبادی کی طرف جاتا ہے لیکن ہم یہ راستہ اختیار نہیں کریں گے۔“ رمنڈو نے ٹھہرتے ہوئے کہا پھر الیانا سے بولا۔

”الیانا! تم اور سہراب ان پہاڑیوں سے آبادی کی طرف بڑھو۔ میں اور برگنڈی لیفٹ ٹرن کر کے جنگل سے

”میں نے اپنی ساتھی الیانا کے حوالے سے تم سے کہا تھا کہ تمہاری کرل فرینڈ بالکل ٹھیک حالت میں ہے لیکن اس کا یہ مطلب کب تھا میرا کہ وہ میرے قبضے میں ہے؟ ہاں، جدر اور جس جگہ اسے قید کر رکھا ہے اس کے بارے میں الیانا کو علم ہے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ چلے گی۔“

میں سمجھ گیا کہ اس خبیث نے میری بے چینی دیکھتے ہوئے بات بدل ڈالی ہے۔ تب میں نے شینا کی بات دہرائی۔

”شینا نے مجھے بتایا تھا کہ اس رات جب چائلڈز اور الیانا سن گن لینے کے لیے دشمنوں کے علاقے میں گئے تھے تو وہاں ہی میں ایک لڑکی کو اٹھالائے تھے۔“

میرا خیال تھا کہ یہ سن کر وہ گڑبڑا جائے گا لیکن اس کے برعکس رمنڈو ہلکا سا قہقہہ مار کر ہنسا۔ بولا۔ ”وہ کوئی اور تھی۔ وہاں ہی میں آتے ہوئے ان سے ٹکرائی تھی۔ اسے ہلاک کرنے کے بجائے وہ اسے یہاں اٹھالائے۔ بعد میں اسے ہلاک کر کے اس کی لاش کو دریا میں پھینک دیا گیا تھا۔“

میں اس کی بات سن کر لرز گیا۔ ایک تڑپا دینے والا اندیشہ کہ دوسرے میرے اندر ابھرا کہ ہمیں خدا نخواستہ..... اس سے آگے مجھ میں سوچنے کا یا رائدہ ہا اور میں فوزیہ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ان کے ساتھ اسی وقت دشمنوں کے علاقے میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اگر فوزیہ وہاں مجھے مل جاتی تو میری تسلی ہو جاتی۔

”کتنے لوگ ہمارے ساتھ چلیں گے؟“ میں نے بالآخر پوچھا۔ مجھے راضی پا کر رمنڈو کی جتنی جتنی آنکھوں میں نیچت چمک سی ابھری۔

”میں، تم، الیانا اور برگنڈی۔“

”بھیا رسنبال لو۔“ میں نے ایک عجیب جوش بھرے لہجے میں کہا۔ وہ سب حرکت میں آ گئے۔

☆☆☆

میں بھی ان کے ہمراہ نہ جاتا کیونکہ یہ ہم میرے اکیلے کے کرنے کی تھی۔ میں نے کالی لہروالوں کی گرفت سے صرف فوزیہ کو ہی نہیں آزاد کرنا تھا بلکہ ان کے کرتا دھرتا میڈیم بھی اور ان کا ٹنڈو کو بھی موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔

کالی لہر کے ان دو افراد کے جہنم واصل ہوجانے کے بعد کالی لہر خود ہی ختم ہوجاتی۔ نیز اسلام پورہ ہستی کا بھی مسئلہ حل ہوجاتا۔ کالی لہروالوں نے ہی وہاں اپنی دہشت پھیلا رکھی تھی۔ وہ اپنے مذموم اور شیطانی مقاصد کی خاطر ان کی زمین پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ رہا شروع پاقیقلہ..... میرا نہیں خیال تھا کہ کالی لہر کے خاتمے کے بعد وہ اپنی حدود سے

آگے جا میں گئے۔ لیس گو۔“

الیانا نے فوراً مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ہم خطرناک تھی۔ رمنڈو اس حقیقت سے شاید واقف نہ تھا کہ اس وقت کالی لہروالوں نے مسلم بستی اسلام پورہ کے خلاف مجاز بنارکھا ہے اور وہ سوئے ہوئے نہیں ہوں گے۔ یہ صرف مجھے پتا تھا مگر میں نے انہیں بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ جیٹا میں بھی تھا۔

میں اور الیانا پہاڑیوں کی جانب بڑھ گئے۔ رمنڈو کے اس فیصلے سے میں خوش تھا کہ اس نے مجھے الیانا کے ہمراہ آگے روانہ ہونے کا حکم دیا تھا اور الیانا ہی وہ واحد لڑکی تھی جس نے فوزیہ سے اس رات ملاقات کی تھی۔

ایک موقع پر میں نے الیانا کو گرفت میں لے لیا اور اسے ہتھکڑیا۔ اس کی آنویک گن میں نے چھین لی۔ وہ شیرینی کی طرح پھیر کر بولی۔ ”خدا ہی..... تم ایسی حرکت کر کے باس کے عتاب سے نہیں بچ سکو گے۔“

میں نے اسے چٹائی ڈھلان پر گر کر اس پر سواری کر لی اور گردن دیوچ کر وحشت زدہ سبھ میں بولا۔

”الیانا! اس وقت میرے سر پر خون سوار ہے اور مجھے کسی کی پروا نہیں۔ اپنی بکواس بند کر اور مجھے سچ بچاؤ کہ فوزیہ کو تم لوگوں نے یہ غلام بنا کر کہاں چھپا رکھا ہے؟“

اس کے حلق سے کھٹی کھٹی آوازیں خارج ہونے لگیں۔ میں نے اس کی نرم خردی گردن پر سے اپنے ہاتھ کی گرفت ذرا ڈھکی چھوڑی تو وہ چھوڑا کھانتے اور ہانپتے ہوئے بولی۔

”میں پھر کہہ رہی ہوں، باز آ جاؤ ورنہ تمہارا حشر..... آہ..... میں نے نفرت سے ہونٹ کھینچ کر دوبارہ اس کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا اور اس وقت تک اس کی گردن دبائے رکھی جب تک کہ دم ٹھکنے کے سبب اس کا چہرہ سرخ اور پھر نیلا نہ پڑنے لگا۔ اس کی گردن کی رگیں بھی ابھر آئیں۔ تب ہی ایک جھٹکے سے میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔

وہ باقی بے آب کی طرح سخت چٹائی ڈھلان پر تر پڑے گی۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنی گردن پر تھے، یوں جیسے وہ اسے سہلا کر اپنی ٹوٹی ہوئی سانسیں بحال کرنا چاہتی ہو۔ میں بے رحمی کے ساتھ اسے جان کنی کے عالم میں تر پٹتا دیکھتا رہا پھر رفتہ رفتہ جب اس کی حالت کچھ سنبھل اور وہ بیٹھ کر ہانپنے لگی تو میں نے اپنی ٹھٹی میں اس کے بال پکڑ لیے اور اپنا چہرہ اس کے قریب لا کر ایک ایک لفظ غضب ناک انداز میں ادا کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے فوزیہ کے بارے میں سچ بتا دو الیانا! اب

کوئی ثالثیات مت کرنا مجھ سے۔ تمہیں ہلاک کرنے کے بعد میں تمہارے کسی ساتھی سے بھی یہ اگوا سکا ہوں۔“

وہ اس قدر واقعیت ثابت ہوئی کہ اس نے ایک لفظ بھی زبان سے ادا نہیں کیا۔ میں تھلا گیا اور اچانک میری نظر قریب ہی رینگتے ہوئے ایک سیاہ رنگ کے عجیب سے کیڑے پر پڑی۔ وہ اس قدر بدبخت اور کریمہ تھا کہ اسے دیکھتے ہی بدن میں جھرجری آجاتی۔ اس کی عقب سے دم ذرا لمبی تھی، چھ ٹانگیں تھیں، سر گول تھا۔ اس پر ایک نما کانٹے سے ابھرے ہوئے تھے۔ وہ میں نے دو انگلیوں سے دیوچ کر الیانا کے چہرے کے سامنے کر دیا۔

”یہ میں تمہارا منہ کھول کر اندر ڈال دوں گا۔ فوزیہ کے بارے میں مجھے سچ بتا دو۔ میرا وعدہ ہے تمہاری جان بخش دوں گا کیونکہ میری دشمنی تم سے نہیں ہے۔“

اس مکروہ کیڑے کو اس قدر قریب دیکھ کر پہلی بار الیانا کا چہرہ خوف سے پٹلا پڑنے لگا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کے گال دیوچے تو اس کا خوبصورت دہن وا ہو گیا۔ دوسرے ہاتھ سے کیڑے کو اس کے منہ کے قریب لے جانے لگا تو اس نے جلدی جلدی اپنے سر کو اٹھائی جیش دی۔ تب میں نے اسے بولنے کا موقع دیتے ہوئے اس کا گال چھوڑ دیا اور کیڑے کو پرے کیا۔

”نف..... فوزیہ..... کو باس نے اٹھوائے کا ہمیں علم دیا تھا لیکن پھر تم سے کمر اڈا ہو گیا۔“

”کیا مطلب؟ کیا فوزیہ واقعی اب تک انہی لوگوں کی قید میں ہے؟“ میں نے غرا کر پوچھا۔ ”یاد رکھا یہ جھوٹ نہیں ہوگا پڑ سکتا ہے کیونکہ تم ہی مجھے وہاں تک لے جاؤ گی۔“

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ وہ بولی۔

”تو پھر وہ لڑکی کون تھی جس کے بارے میں شینا نے مجھے بتایا تھا؟“

”وہ واقعی کوئی اور لڑکی تھی۔ وہ غلطی سے ہم سے ٹکرائی تھی اور میں اور چائلڈز اسے اٹھالائے تھے۔“

”مجھے بالکل یقین نہیں آ رہا۔“ میں نے پھر کر کہا۔

”چلو، میرے ساتھ۔ جس جگہ فوزیہ قید ہے، وہاں تک میں تمہیں لے چلی ہوں۔“

میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ میرا مقصد صرف فوزیہ کا حصول تھا، اس شخص مجھے کانٹوں سے لے کر الیانا پر قابو پایا تھا۔

”اگر تمہارا منہ مجھے دھوکا دینے یا سوتلے کی تلاش میں

ایسا کہہ رہی ہو تو یاد رکھنا الیانا اس بار میں تمہیں ہلاک کرنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کروں گا۔ فوزیہ کے بارے میں سچ اگوانے کے لیے ابھی تمہارے سامنے زندہ ہیں۔

ہم چل پڑے۔ کیزا میں نے پرے پیٹک دیا۔ الیانا ہنسی مچی۔ اس کی گن میں نے کندھے پر لٹکائی تھی۔ چٹل بھی چٹانے کا ابھی میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اسی لیے وہ میں نے بیلٹ میں اسرا اور اپنی نیام میں بندھا خنجر نکال کر۔ ہاتھ میں پکڑ لیا جو بعد میں، میں نے رمندو سے لے لیا تھا۔

الیانا آگے تھی، میں اس کے پیچھے۔ اب وہ میرے حکم پر مجھے آبادی کی طرف سیدھا اسی جانب لے جا رہی تھی۔ جہر فوزیہ متیدھی۔ فوزیہ سے ملنے کے تصور سے ہی میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ ہم آبادی میں داخل ہو گئے۔

اب ہر طرف سچ کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ لوگ جاگ چکے تھے۔ غور تیں، بچے، بوڑھے گھروں سے باہر نکلے۔ جوان مرد کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ آس پاس جھونپڑ اور خردوٹی چٹوں والے مکان..... باہر بندھے گھوڑے، بھینسیں غرضیکہ پورا جنگلی بستی والا ماحول تھا۔

دو تین جگہوں پر سچ پہرے داروں سے بھی ہمارا سامنا ہوتے ہوئے رہ گیا جن کے پاس جدید آتشیں کتیں بھی تھیں، بھالے بھی اور کمان، تیر بھی۔ الیانا کو نہیں معلوم تھا کہ یہ کیوں موجود تھے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ کالی لہرو والوں کے آدمی تھے جنہوں نے اسلام پورہ کی بستی سے جنگ کر رکھی تھی اور میری مدد سے اس رات آخری حملے کے بعد سے یہ لوگ بھی بچا ہوا ہو گئے تھے۔ انہیں ڈرتا تھا کہ اب اسلام پورہ والے ان پر ہلانہ بول دیں۔ بہر کیف، ہم خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔ بالآخر ایک دو مستطیل مکانوں کے درمیان بنی ہوئی ایک جگہ میں ہم داخل ہو گئے۔

رمندو نے مجھے اور الیانا کو جھرنے کا حکم دے رکھا تھا، یہ وہ جگہ نہیں تھی کیونکہ اب الیانا میرے حکم کے مطابق دوسرے مقام پر تھی۔ رمندو کو جب تک بھی نہ بڑی ہوئی کہ میں نے اس کی خوبصورت ساتھی کے ساتھ کیا ہاتھ کر دیا تھا۔

چونکہ ہمارا مقاد ایک ہی تھا، رازداری بھی شرط تھی اور سب کچھ خاموشی سے کرنا تھا، اسی لیے وہ اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ میں الٹا انہی کے خلاف ایسا کوئی جارحانہ قدم اٹھانے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کا ذمہ تھا جو میں نے خاک میں ملا دیا تھا۔

ایک جگہ الیانا رک گئی۔ ”کیا ہوا، تم رک کیوں نہیں؟“ میں نے سرکشی میں

کہا۔ الیانا نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے نیچی آواز میں کہا۔

”اس طرف چلے جاؤ۔ فوزیہ اس عمارت کی آخری کونھری میں موجود ہے۔ تمہیں وہ کھڑکی سے ہی نظر آجائے گی۔“

”کواس مت کرو۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔“ میں نے سرکشی میں اسے گھر کا۔ وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔ مجھے حیرت تھی کہ منزل کے قریب پہنچ کر اسے اب آگے بڑھنے میں کیا قناعت ہو رہی تھی؟

بالآخر وہ بولی۔ ”وہاں خطرہ پوشیدہ ہے۔ ہم دونوں میں سے کوئی پہرے داروں کی نظروں میں آسکتا ہے۔“ میں سمجھ گیا وہ چالاکی کر رہی تھی۔ میں نے خنجر کی نوک اس کی نرم خردوٹی گردن سے لگا دی۔ ”چلا جا کہ مت کرو الیانا ورنہ اور ہر ہی تمہاری خوبصورت گردن پر خنجر پھیر دوں گا۔“

وہ آگے بڑھی، میں اس کے پیچھے رہا۔ اس گلی نما راستے کا غلا اتنا ہی تنگ تھا کہ صرف ایک آدمی یا پھر دو آگے پیچھے چل سکتے تھے۔ الیانا کو میں نے آگے ہی رکھا، خود اس کے پیچھے رہا۔

سچی بات یہ تھی کہ میں اس وقت اپنے حواسوں پر قابو نہیں پا رہا تھا۔ میری کیفیات ناقابل بیان، عقل باؤفسی اور جسمانی طاقت جیسے ٹوٹ، ٹوٹ جاتی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا فوزیہ کو دیکھتے ہی میں اپنے آپ میں نہ رہوں گا۔ تنازعہ میں نے اس کی تلاش میں بتایا تھا اور زمانے و سفر کے سرو و گرم کی پروانگی تھی، نہ اپنی جان کی۔

میں اور الیانا بہت دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھا رہے تھے۔ چھت کی سمت ہمیں دو ایک پہرے داروں کی دن کے اجالے میں جھپک نظر آئی۔ ہم رک گئے اور پھر انہیں ٹپکا کر آگے بڑھ گئے۔

گلی کے آخری سرے سے پانچ قدم پر پہنچ کر الیانا پھر رک گئی۔ ”خدا کے لیے اب اور خدمت کرو۔ تم آگے جاؤ، دائیں جانب والی کھڑکی سے فوزیہ تمہیں نظر آجائے گی۔ میں چھت پر نگاہ رکھتی ہوں۔“

جیسا کہ مذکور ہوا، میں اب اپنے حواسوں اور اپنے آپ میں کہاں رہا تھا۔ اپنے تئیں لب بام پہنچ کر مجھ میں جیسے عقل و خرد کا بھی یار اندر رہا اور یوں میں مکار الیانا کی چالاکی میں آ گیا۔ ایک دیوالی کے سے عالم میں الیانا کو وہیں چھوڑ کر میں آگے بڑھ گیا۔ ابھی کھڑکی سے تین چار قدموں کے فاصلے پر ہی تھا کہ اچانک مجھے لگا جیسے میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ میں فضا میں ملحق ہو گیا ہوں، نہیں.....

میں تو نیچے ہی نیچے کھو تار پٹی میں گرے جا رہا تھا۔ اس کی تہ میں کیا ہو سکتا تھا؟ کیلے بالس، چمڑے، یا پھر نیزے یا پھر کچھ بھی نہیں۔ میں ہول کر رہ گیا۔

یہ دھوکا کس نے کیا تھا میرے ساتھ..... الیانا نے یا پھر دشمن نے؟ جیسے اس حقیقت کا علم ہو گیا تھا کہ وہ (الیانا اور چائلڈر) پہلے بھی یہاں آچکے ہیں یا پھر میں ہی ان پہنچا ہوں۔ دشمن محتاط ہو گیا ہو، بھلا کب وہ مجھ سے غافل رہا ہو۔ اسی لیے انہوں نے کھڑکی کے قریب خندق کھود ڈالی۔ یہ خندق میرے لیے موت اور قبر بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ ہزاروں سیلوں کے کھن ستر کے بعد جب میں منزل مراد تک پہنچ چکا تھا تو ایسی شکست ہولناک بھی تھی۔

تب ہی مجھے لگا جیسے میں کیلے ہانسون پر آن گرا ہوں۔ وہ میرے جسم میں کھب گئے یا پھر آ پار ہو گئے۔ یہ ناگاہ موت..... یہ اندھی موت..... بد قسمتی کے سوائے اور کیا ہو سکتی تھی۔ درد اور اذیت اس قدر ہوئی کہ میں چلا بھی نہ سکا۔ ممکن ہے گراہ پایا ہوں لیکن وہ بھی میں کب سن سکا۔ مجھے کوئی ہوش ہی نہ رہا تھا۔

☆☆☆

منا ہے موت کے بعد جب جسم سے روح پرواز کر جاتی ہے تو انسان یا ایک خود کو ہلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔ (خند بھی موت کا دوسرا نام ہے۔ پر عارضی) خواب کی کیفیات میں جو دیکھتا ہے، وہی روح کی کیفیات ہوتی ہیں۔ میں بھی شاید مر چکا تھا کیونکہ میں اس وقت خود کو ہوش میں تو پا رہا تھا لیکن درد، تکلیف اور محسوسات کا کوئی یارا نہیں تھا۔ نہ ہی زمین پر خود کو لگے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ بس، معلق تھا۔

پھر ہلکی ہلکی روشنی ہونے لگی۔ یوں جیسے دور کہیں مغرب میں سورج غروب ہو رہا ہو۔ شام ہو رہی ہو۔ عجیب سی سرخی حدنگاہ کے کناروں پر ”شید“ کی طرح دکھائی دیتی محسوس ہو رہی تھی۔ موت..... سب موت..... مجھے یاد تھا۔ میں کسی گہری کھائی میں جا گرا تھا جس کے اندر نیزے سے تھے یا پھر کیلے بالس..... بھلا کون زندہ بچ سکتا ہے اس قدر خطرناک ٹریک میں؟

یا ایک مجھے غلٹکی کا احساس ہونے لگا۔ اب سب ختم ہو چکا تھا۔ شاید دنیا سے میرا رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ یہ سب سوچ کر دل دکھ سے بھرنے لگا۔ خود کو تکی و اماں محسوس کیا۔ بالکل خالی ہاتھ۔

اچانک سیاہ تاریکی ملگجا ہٹ میں بند لے لگی۔ اجیارا

کم، تاریکی زیادہ۔ کچھ ایسی تھا، پھر میں ہوا، میں دیکھا ماحول رنر رنر کرکٹ کرنے لگا، گھمسنے لگا۔ پانچ بیس جی روح بھڑکی یا پھر پکڑ لگا رہی تھی۔

پھر چند ثانیے بعد ان مختلف روشنیوں کی چمک اند پڑنے لگی، پھر ٹھہر گئی۔ اندھیا رات پھر کچھ غالب ہوا۔ اب سب کچھ ٹھہر گیا تھا۔

اسی وقت دائیں جانب سے کوئی شے ابھرنے لگی، ناقابل بیان سی۔ میں اس طرف دیکھتا رہا۔ وہ شے دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں جیسے آسمان کے کناروں سے۔ لیکن نہیں، وہ ابھی تو نہیں لگتا تھا۔ بس ایک غلایا وہ بھی نہیں، کچھ اور تھا۔

شے قریب آئی اور کسی تخت کی طرح ابا کر ہوئی تو میرے ذہن کو ایک شناسائی کا ہلکا لگا۔ اس تخت پر ایک آرام دہ صوفہ سا رکھا تھا جس پر دو افراد بڑے کرکڑ سے براجمان نظر آئے۔ ابھی ان کی صورتیں پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ وہ ابھی روشنیوں اور تاریکی کے حکم میں تھے۔ پھر تخت ذرا اور قریب ہوا تو یلکات ہی میں ان دونوں برامتان افراد کو پہچان کر بری طرح خشک گیا۔

پھر یہی وہ وقت تھا جب آن کی آن میں میرے اندر سے موت، بعد از موت اور روح کا تصور جانے لگا۔ یہ دونوں مکروہ لوگ اس عظیم تصور میں نہیں آسکتے۔ یوں اس تصور کی جگہ شجہہ گری نے لے لی۔ ساتھ ہی مجھے مسرت کا بھی احساس ہوا کہ میں مرا نہیں تھا، میں تو زندہ تھا ورنہ ان دونوں خبیثوں کو کیوں گھروں کے کھٹکا۔

وہ دونوں راکٹ لنگرا اور میڈم بھی تھے۔ میری اس وقت جو بھی حالت تھی، وہ یقیناً انہی دونوں کی روانی شجہہ گری کی تھی جس سے میں پہلے ہی گزر چکا تھا۔ تاہم مجھے مسرت کے ساتھ حیرت بھی تھی کہ میں زندہ تھا، مرا نہیں لیکن میں زندہ کیسے بچ گیا؟ ایک ایسی کھودی گئی خندق لگا کھائی میں جس کی تہ میں سیدھے کیلے بالس یا نیزے نصب تھے اور جو سارے ہی میرے وجود میں ترازو ہو چکے تھے۔

”پہچان لیا تمہیں تو نے سہرا؟“ منار کا فٹنرے کی شکستہ آواز گونجی۔

”پہچان کیسے نہیں ہوگا، ہم تو اس کے پرانے خیر خواہ ہیں۔“ یہ میڈم بھی تھی جس نے طعنے اپنے دیرینہ ساتھی سے کہا۔ اشارہ میری طرف تھا۔

”وہ مجھے اندازہ تو تھا کہ تم یہاں ایک نایک دن ضرور آؤ گے کیونکہ یہاں تمہاری بھی گلی، تمہاری کڑوری،

تمہاری مجبوری..... اور..... تمہاری جانی بھی..... ہا ہا..... بدست سے لہجے میں کہتے ہوئے رانگا لنگڑا آخر میں قہقہہ مار کر ہنسا۔

اس شیطانی جوڑی کو دیکھ کر چلی سرت تو میرے اندر بے جا کئی کئی مہر اٹھیں تھا۔ اب یہ جو کچھ تھا، ان کی شہدہ گری بھی جس کی ایک جھلک میں کافی حویلی میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور رانگا اپنی اسی قسم کی شہدہ گری سے مجھ پر عارضی طور پر حاوی بھی ہوا تھا لیکن پھر میں نے اس کی وہ شہدہ بازی کا نام بنا ڈالی تھی۔ یہی نہیں، بلکہ ایک سخت اور خنزیر مقابلے کے بعد میں نے اسے ایک ٹانگ سے بھی محروم کر دیا تھا جس کے نتیجے میں اس نے اپنی انتہائی بڑاس لگانے کے لیے فوزیہ کو اغوا کر لیا تھا۔ کپھاڑے سے اس کی ایک کاٹی ہوئی ٹانگ کا زخم وہ ابھی تک چاٹ رہا تھا۔ بہر کیف، اس احساس نے مجھے کافی اعتماد بخشا اور اپنی قوت ارادی محسوس کرنے لگا۔ اسی سبب میں نے اپنے جسم کو ہلانا جانا اور حرکت دینے کی بھی کوشش کی کہ میں کس نادیہ طاقت میں جکڑا ہوا تھا مجھے اپنے وجود کو حرکت یا جنبش دینا تو درد ناک، یہ تک بھی اندازہ نہ ہو پایا کہ میں اپنے جسم میں تھا بھی یا نہیں۔

”مجھے بھی اس بات کا یقین تھا کہ تم میرے خوف سے میری ہی راہ نکلے ہوئے ہو گے۔“ بالآخر میں نے ان کیفیات میں رہتے ہوئے منہ کھولا۔ میرے ہونٹ بھی ہلے لیکن بول نہ سکا۔ جملہ اندیش ہوا، میری آواز تک نہ لگی لیکن شاید رانگا نے میری یہ بے بسی دیکھ لی بلکہ اسے معلوم ہی تھا۔ پھر وہ ہنس کر بولا۔

”تم کیا خود کو زندہ تصور کر رہے ہو؟ نہیں، ہم نے اپنی قوت سے تمہاری روح کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے، تم مر چکے ہو۔ ختم ہو چکے ہو۔“

میں اس کی لغو بیانی پر بولنے سے تو قاصر رہا مگر ایک زہریلی سی استہزا ایسے مسکراہٹ تو اپنے چہرے پر نمودار کر رہی سکتا تھا کیونکہ اس مسکراہٹ میں طمانیت بھی تھی اور ٹراحتادی بھی جس نے ان کے کردہ چہروں کی قاتحانہ مسکراہٹوں کو ایک دم مدھم کر دیا۔

”بہت خوش فہمی ہے تمہیں کہ تم زندہ ہو۔“ میڈم بھی کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔ ”تمہیں ہماری قوت کا اندازہ ہی نہیں ہے کہ ہم روح تک کو بھی جلا کر جسم کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔“

یہ مکروہ اور شیطان صفت کردہ تھا۔ بنگال کی اس دور

دراز سر زمین میں ممکن ہے انہیں کوئی جادو ٹوٹا آتا ہو، کسی سائنسی شہدے کی بھی مہارت رکھتے ہوں، جیسا کہ میں کافی حویلی میں اس کی ایک جھلک دیکھ ہی چکا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ تھا، اسی کی طاقت پر یقین تھا، وہی قادر المطلق تھا جس نے آج تک مجھے ایسے شیطانی چیلوں پر غالب رکھا تھا۔

ساری بے بسی اور لاچارگی کے باوجود میرے پاس انہیں تاؤ دلانے کا بڑا ہی خوب اور انوکھا ہتھیار لگا تھا۔ چونکہ میں فطرتاً ہی جنگ باز تھا، بے بس ہو جانے کے باوجود بھی غالب دشمن کو لٹکارے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ دونوں شیطان میرے چہرے سے شکست خوردگی اور سراسیمگی، میری آنکھوں سے خوف اور اداسی دیکھنے کے متمنی وقت تھے مگر میرے بدستور مسکراتے ہتھیار نے ان کے غرور اور فتح مندی کی دھجیاں نکیر کر رکھی تھیں۔

”اسے واقعی بہت تسلی ہے میڈم!“ رانگا بھی ایک دم غرا کر مجھے گھورتے ہوئے بھی سے بولا۔ ”چنگھٹوں بعد اسے عظیم پوجہ ہوگا کہ جسے والے چہرے پر اسی حالت میں رکھ کر آگ لگا دی جائے گی۔ تب اس کا غرو دھاک میں ملے گا۔“

”نہیں رانگا!“ چچی ڈانٹ جیسے لہجے میں بولی۔ ”پہلے اس کی جتنی کو اس کی آنکھوں کے سامنے پرہز کر کے آگ لگائی جائے۔ یہ بے بسی میں اپنی مجبور کو ترپے ہوئے مرتا دیکھے۔ اس کے بعد۔۔۔۔۔“

”یہی تو میں کرنا چاہتا ہوں۔“ رانگا ایک دم وحشت زدہ لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ وہ مجھ پر بہت بھرا ہوا اور ادھار کھائے ہوئے تھا۔ فوزیہ کے متعلق ان کی گندی زبان سے یہ سن کر میرے اندر طیش اور غضب ناک کی لہر سی اٹھی اور ایک بار پھر میں نے قوت ارادی کے ٹل بوتے پر اپنے جسم کو جنبش دینے کی کوشش کی۔ کچھ محسوس کرنے کے لیے تمام حسیات کو بروئے کار لانے کی ٹنگ دود کی مگر بے سود۔

فقط اللہ سے دعا کہ سوا اب شاید میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ خدا میری مدد ضرور کرے گا۔ بغیر کسی نقصان کے مجھے کوئی ایسا موقع وہ ضرور عطا کرے گا کہ میں ان شیطانوں پر غلبہ پالوں۔

میں نے اپنی مسکراہٹ ماند نہ پڑنے دی لیکن وہ دونوں قانع ہو گئے۔ روشنیاں بھی مدھم ہو کر معدوم ہو گئیں۔ اب میری آنکھوں کے سامنے تاریکی، گھوڑا تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ان

خبیث شیطانوں نے مجھے یہ کس عجیب کیفیت کا شکار بنا رکھا ہے۔ میں اپنی بہت کدائی کو جانچنے تک سے قاصر ہوں۔ میں نے بہیم کوشش کی کہ کسی طرح خود کو موجودہ پوزیشن پر بار کروں لیکن بے سود۔

اب خود کو تن بہ تقدیر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تاریکی بھی چاروں طرف ایسی ہی تھی جیسے میں قبر میں لیٹا ہوا ہوں۔ کچھ نظر بھی نہ آتا تھا اور ہلا جلا بھی نہیں جاتا تھا۔ نہ ہی میرے حواس خسر کام کر رہے تھے۔ عجیب سی کیفیت تھی۔ بالکل کسی تاریک اور اندھیری قبر میں لیٹے ہوئے مڑے جیسی۔ کچھ سنا بھی نہیں دیتا تھا۔ ہر سو خاموشی تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ تب ہی اچانک مجھے لگا جیسے میرے سونگھنے کی حس آہستہ آہستہ بحال ہو رہی ہے۔ میرے اندر یک دم جھماکا ہوا۔ میں نے سونگھنے کی کوشش کی تاکہ اطراف کے ماحول اور فضا کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

مجھے عجیب سی بو کا احساس ہونے لگا۔ معاً مجھے لگا جیسے میں ماحول کے درجہ حرارت کو بھی محسوس کرنے لگا ہوں۔ مجھے گرمی کا احساس ہوا۔ میں نے ایک بار پھر اپنے بدن کو ہلانے جلانے کی کوشش کا آغاز کیا تو میرا دل بے اختیار سرت تلے یکبارگی زور سے دھڑک اٹھا کہ میں اپنے دائیں پیر کو جنبش دے پا رہا ہوں۔

دشمن نے ضرور کسی دوا یا کسی مخلوق کے اثر میں رکھا ہوگا اور شاید یہ بھاگی ہوئی کا کمال تھا کہ میں اپنی سی کوشش سے، اپنی جسمانی طاقت کے سہارے، اپنی صحت کا اعادہ کرنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔

ممکن تھا کہ میری بہتر ہوتی حالت دشمن سے مخفی ہو۔ کیا خبر وہ یہ سمجھتے ہوں کہ ابھی میں کئی گھنٹے اسی کیفیت میں گرفتار رہوں گا۔ کیا خبر کسی اور دوا یا مخلوق سے میری حالت دوبارہ اصل کیفیت میں آئی ہو، لیکن شاید یہ بھاگی ہوئی اور میری اپنی طاقت اور قوت ارادی کا دخل تھا کہ میں دشمن کے اندازے کے برخلاف جلد ہی اس مردنی کیفیت سے نکلنے کی کامیاب ٹنگ دود میں تھا۔

بالآخر اگلے نصف گھنٹے تک میں اپنے نچلے دھڑا اور دائیں بازو کو ہلانے جلانے میں کامیاب رہا۔ میں نے ریڑھ کی ہڈی کے سہارے اٹھ کر بیٹھنے کی بھی کوشش کی لیکن ابھی وہ ٹن گئی۔

ہاں، میرے پورے وجود کو ”ٹن“ کر کے مفلوج سا کر دیا گیا تھا۔ یہ ٹن ہونے کی ہی کیفیات تھیں۔ یہ بات میرے ذہن میں آتے ہی میں نے اپنے جسم کو بہیم حرکات

دیتے ہوئے حرارت پہنچانے کا عمل جاری رکھا۔ مجھ پر جیسے دیوانی طاری ہو گئی۔ یہ اندھیرے میں چمکتے چمکتے طرح امیر اور کامیابی کا جوش تھا۔ بدن کا جو حصہ میں ہلا جلا پار تھا، اسی کو میں نے بار بار اور طاقت کے ساتھ حرکت دینے کی کوشش شروع کی تاکہ وہ دوسرے حصے کو بھی حرارت منتقل کر سکیں۔

میری اس حکمت عملی کا جلد نتیجہ برآمد ہوا۔ میں اگلے بیس منٹ بعد ہی اپنے پورے بدن کو حرکت دینے کی صلاحیت میں تو آ گیا لیکن اس میں سستی ابھی طاری تھی۔ وہ پھرتی ابھی پیدا نہیں ہوئی جو میرا خاصہ تھی۔

ابھی تو بھی بہت تھا۔ شکر تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں آزاد تھے۔ میں نے خود کو سخت نچنے والی جگہ پر لیٹے پایا۔ اب احتیاطاً کا تقاضا یہ تھا کہ میں اپنی حرکات میں محتاط رہوں۔ پھر دفعتاً ہی میرے منہ سے کراہ خارج ہوئی۔

حسیات کے بیدار ہوتے ہی مجھے اپنے جسم میں درد، اینٹھن اور تکلیف کا احساس ہوا۔ یوں، جیسے میرا پورا بدن گھماں ہو۔ چپے ہوئے درد بھی گو یا محسوسات کے ساتھ ہی جاگے تھے۔ تب ہی میں چونکا۔ مجھے یاد تھا کہ میں الیانا کے کنبے پر انتہائی بے قراری اور وارفتہ جلد بازی کے ساتھ ہی جس تیزی سے فوزیہ کے قید خانے والی کھڑکی کی جانب لپکا تھا، اسی تیزی سے کسی اندھی کھائی میں جا کر اٹھا اور پھر..... شدید تکلیف سے میری چپٹیں بھی کٹی گئیں۔ کھائی میں شاید کیلے بانس یا سیدھے نیرے نصب کیے گئے تھے۔ بلاشبہ یہ ایک جان لیوا ”ٹریپ“ تھا مگر خوش قسمتی سے میں بچ گیا تھا یا بچا لیا گیا تھا۔ شاید میرے دشمن عارضی طور پر میرے بہن بن گئے تھے۔ یقیناً انہوں نے شہدہ بازی دکھانے کے لیے پہلے میری جان بچانے کی کوشش کی ہوگی کیونکہ جب میں نے اپنے جسم میں درد والی جگہوں کو چھوا تو وہاں مجھے کی جڑی ہوئی کے مرہم کا لپ بھی محسوس ہوا۔ سب سے پہلے وہ عجیب سی بو میرے نچلوں سے نکرنے والی انہی جڑی بوٹیوں کی تھی جسے چھونے کے بعد جب میں نے سونگھا تو مجھے اس حقیقت کا احساس ہوا۔ یہ تقدیر کا طرفہ تھا شاید تھا کہ کبھی دشمن ہی محسن بن جاتے ہیں۔ اس ”اکسیر“ جڑی بوٹی میں بھی شاید جادوئی اثر تھا۔

بہر کیف، یوں دیر دیر سے میں نے تختہ دار کی جگہ سے حرکت کی۔ دکھائی اب بھی مجھے کچھ نہیں دے رہا تھا۔ کمر اتار کر ایک تھا۔ میں اپنے بیروں پر اٹھ کھڑا ہوا تو دل خوشی سے بھر گیا۔ نچے فرش تھا۔ اندھوں کی طرح میں نے اپنے دونوں ہاتھ پیراں کھینچے تھے۔ قوی حرکت کی، کوشش

تھی کہ کوئی کھڑا نہ ہوئے ہائے کہ دشمن چونک جائے۔
گھمائل وجود کا درپے ہوئے میں نے اپنی کوشش جاری
رکھی۔ روشنی ضروری تھی۔ ماحول کو سونگھا تو مزید ادراک ہوا
کہ میں کسی بہتر اور صاف سہری جگہ یا کمرے میں تھا۔
بہروں میں پتھر یا فرش محسوس ہوا تھا۔

معانی میرا ہاتھ دیوار سے ٹکرایا۔ میں چند لمحوں میں
نظم مریا۔ معدوری میں اب آنکھوں کے سامنے اجالا آنے
کی گئی۔ میں نے دیوار کے سہارے لگے ہوئے دوبارہ چلنا
شروع کیا۔ آخر تو اس کا دروازہ، کندھا لالک لگے گا۔

اچانک کسی ریگ سے میرا ہاتھ ٹکرایا۔ وہ زینہ تھا،
اور جارہا تھا۔ میں دھڑکتے دل سے اس پر چڑھنے لگا۔ وہ
دائیں جانب گھوم گیا پھر چند لمحوں کے بعد بائیں طرف۔
اس کے بعد ہی اچانک مجھے دائیں جانب روشنی کی ایک کرن
کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی ایک گونج سی۔ یہ گونج ایک سے
زائد افراد کے باتیں کرنے کی محسوس ہوتی تھی۔ میرا دل
اب جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ کوئی منزل قریب تھی۔
آزادی کا آسرا ہوا۔ میں اسی جانب آسکتی سے بڑھ گیا۔

یہاں قدم بچے نہیں تھے، مختصر سا فرش تھا۔ اندازہ ہوا
کہ احرار سے ہی ایک زینہ مزید اوپر کی طرف جاتا
تھا۔ بنگال کے جنگلات میں دور دراز کی اس پستی میں یہ گوشہ
مجھے جدید طرز کا لگا تھا۔
جس درز سے روشنی کی کرن اندر آ رہی تھی، میں نے
وہیں اپنی ایک آنکھ چپکا دی۔

اندرا کا ماحول اور منظر میرے سامنے تھا اور بالکل غیر
اختیاری طور پر میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار
آئی۔ اندر سامنے کی دو پشتوں پر بالکل اسی طرح چچی اور
رانگا لنگڑا برا بھلا تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے میں انہیں
ابھی تھوڑی دیر قبل عجیب منظر میں دیکھ چکا تھا۔

اب مجھے ان کی شہدہ گری کا اندازہ ہو چلا تھا۔ چونکہ
میرا پورا بدن سن کر دیا گیا تھا۔ جس تختے پر مجھے لٹایا گیا تھا،
میں اسے بھی محسوس نہیں کر پایا تھا اور اگر دتار کی پھیلا دی
گئی تھی۔ لیکن تجاس تختے پر مجھے لٹایا گیا تھا، اسے ہی کسی
طرح فضا میں ایک بڑے سے ہال میں معلق کر دیا گیا ہوا اور
ایک مخصوص طرز سے ان دونوں نے خود کو روشنیوں کے
سہارے مجھ پر ظاہر کیا ہو۔ مجھ پر موت کی دہشت اور میری
روح کے قبض کرنے کی قوت کا ان درمیں شیطانوں نے
ڈراما رچایا۔

میں کالی لہر سمیت ان دونوں پر بھی ہر وقت لعنت ہی

بھیجتا رہتا تھا۔ ایک عام سی ڈراما بازی سے یہ لوگ سمجھ رہے
تھے کہ میں ان کی باتوں سے خوفزدہ یا مرعوب ہو جاؤں گا
جبکہ میرا ایمان تھا کہ روح قبض کرنا صرف اللہ کے اختیار
میں ہے۔

اس وقت ان کے سامنے پانچ افراد سیاہ لباسوں میں
موزوں انداز میں ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ میڈم بھی
ان میں سے ایک کو مخاطب کرتے ہوئے ٹھکانا دہشتی سے
کہہ رہی تھی۔

”جاگو! تمہاری ٹیم بالکل ناکام ثابت ہوئی ہے۔
بات صرف اتنی نہیں ہے کہ جو لوگ ہمارے اس مقدس
یوہورگا کے مجھے کوہتھانے کے درپے ہیں، وہ اسے ایک
ناوروتا یا بھونہ سمجھتے ہیں۔“

میں اس کی بات پر چونک گیا۔ اب تک یہی حقیقت
میرے علم میں بھی تھی اسی لیے مجھے آس منوس مجھے سے
کوئی خاص دلچسپی نہ رہی تھی۔ اب نہ جانے یوہورگا کے سلسلے
میں اور کیا انکشاف سامنے آنے والا تھا۔ میں غور سے دیکھتا
اور سنتا رہا۔

چچی اسی روشنی سے آگے کہہ رہی تھی۔ ”تم ابھی تک
اس عالمی جرائم پیشہ گروہ کا ہی سراغ لگانے میں ناکام رہے
ہو جس نے ہمارے دیرینہ حریف سردار آٹوما کی بیٹی شینا
بے نی کویرغال بنالیا اور ابرک سمیت ہمارے اہم آدمیوں
کو ہلاک کر ڈالا۔ یہ تو چند ایک ساتھی ہمارے جو بچ گئے اور
بہادری کے ساتھ مجسمہ یہاں لے آئے ورنہ تو مقدس یوہورگا
کا مجسمہ بھی گیا تھا ہمارے ہاتھوں سے۔“

”مادام!“ جاگو نامی بے ترنگے سیاہ پوش نے
موزوں بانہ کہا۔ ”ہم نے ان کا سراغ لگایا ہے جنہوں نے شینا
بے نی کوٹوا کیا ہے اور ہمارے ساتھیوں کو ہلاک کیا۔“
”چتا ہے مجھے۔“ چچی ناگواری اور نفرت سے بولی۔

”سراغ لگا اور بات ہے، میں ہر قیمت پر بہت جلد ان کی
لاشیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر شینا بے نی ماری گئی تو میں
تمہارا مشن مکمل سمجھوں گی۔ ہمارے تعلقات شروپا کے ساتھ
بھی متاثر ہو جائیں گے۔“

”معزز مادام! صرف دو دن دے دیں۔“ جاگو کے
لہجے کا عزم بتا رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے، ثابت کر کے بھی
دکھائے گا۔

چچی نے بڑی نفرت سے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ جاگو
اپنے ساتھیوں سمیت موزوں انداز میں جھکا اور پیچھے ہٹ
گیا۔ اس طرف تاریکی بھی پھر کوئی آڑ، جدھر میری آنکھ نہ

دیکھ پائی۔
مجھے اس گفتگو سے اندازہ ہوا تھا کہ یہ لوگ اسی ابرک
ہائی آڈی اور ساتھیوں کی بات کر رہے تھے جن پر پوپک
میں صحرائی عتاب یعنی البرٹ رمنڈو نے مجسمہ ہتھانے کے
لے ہلا بولا تھا۔ اب بقول جاگو کے، انہوں نے ان کا سراغ
لگ لیا تھا۔ مجھے اس بات نے کافی دلی آسودگی پہنچائی کہ
رمنڈو اب بھی پانچ پائے گا۔

”ڈیئر چچی! ہمیں اس عالمی جرائم پیشہ گروہ (صحرائی
عتاب) سے کوئی زیادہ خطرہ نہیں۔ انہیں ہم جلد یا بدیر زیر
کر ہی لیں گے لیکن بلیک کیٹس اور ریڈ فوکس سے ہمیں
زیادہ خطرہ ہے۔“ رانگا لنگڑا، چچی سے کہہ رہا تھا۔ میں غور
سے سنتا رہا۔ میری بھویں پر سوچ انداز میں سکتی تھیں۔

”ہم۔“ چچی نے ہنکارا بھرا۔ ”انہی دونوں کے
بارے میں (بلیک کیٹس اور ریڈ فوکس) مجھے سب سے زیادہ
پریشانی اور تشویش ہے۔ رانگا! یہ بہت برا ہوا ہے۔ ہم ان
دونوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے
کہ آخر دنیا کی دو بڑی خفیہ ایجنسیوں کے لیے یہ مقدس
یوہورگا کا مجسمہ کیوں اتنی اہمیت اختیار کر گیا اور انہیں جیسے ہی
اس بات کی شہینک ملی کہ یہ ہمارے پاس ہے، تو ہم سے پہلے
رابطہ کر کے منہ مانی قیمت کے بارے میں پوچھا گیا۔ ظاہر
ہے کہ مجسمہ ہمارے لیے انمول اور مقدس ہے مگر آخر میں ان
کی دھمکی بھی مجھے خوفزدہ کر گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اصل
بات ہے کیا؟“

چچی کے لہجے میں حد درجہ فکر اور پریشانی تھی۔ رانگا
بھی شکر سے لہجے میں بولا۔

”ڈیئر! صورت حال تو واقعی بہت خطرناک ہو چکی
ہے۔ اسی لیے میں اسلام پورہ کی ہستی خالی کر وا کے عارضی
طور پر اصل مقدس یوہورگا کے مجسمہ کو خفیہ طور پر وہاں منتقل
کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے ہماری پلاننگ بھی یہی تھی کہ اس کی
جگہ ایک نکلی مجسمہ رکھ دیتے اور چالاکی سے اسی کا سودا کر
ڈالتے۔“ کہتے ہوئے رانگا لنگڑا ذرا دیر کو رک پھر اپنی
پریشانی کو ہاتھ سے مسلتے ہوئے بولا۔

”جرائم پیشہ افراد سے مقابلہ آسان ہوتا ہے رانگا!
لیکن جب حکومتی ایجنسیاں درمیان میں کود پڑیں تو ان سے
مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔“ چچی بولی۔ ”حالانکہ جب
انہوں نے اس کے حصول کے لیے ہمیں دھمکی دی تو میں نے
نگاہی ٹون میں ان سے بات کی اور صاف صاف کہہ دیا
کہ ہم اس بد معاشی پر پوری دنیا میں احتجاج کریں گے

کیونکہ دنیا میں کسی مسلک کے ساتھ یوں درپردہ نہیں کی
جاسکتی۔ انسانی اور مذہبی حقوق کے نام پر ہم انہیں بدنام کر
ڈالیں گے لیکن ہماری اس دھمکی کو وہ خاطر میں نہیں لائے
اور اسے جنگ کی لٹاکر کچھ کر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔“

”چچی ڈیئر! میں مصر کے لوور میوزیم کی لائبریری
اور فرانس کی ریبریاں آرٹ گیلری سے مقدس مجسمے کے
تاریخی دستاویزی ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا
ہوں۔“ رانگا بولا۔ ”جنگ عظیم دوم کے بعد برازیل کے
جنگلات کے ایک کنڈرات سے یہ مقدس یوہورگا کا مجسمہ
سب سے پہلے ہم ہی لوگوں نے دریافت کیا تھا جو بعد میں
ہم سے حکومتی ملکیت کے نام سے چھین لیا گیا۔ بڑی مشکوک
سے ہم نے اسے وہاں سے حاصل کیا تھا۔“ کہتے ہوئے لمحہ
بھر کو رک کر رانگا نے چچی سے پوچھا۔

”کیا تم نے انہیں بتا دیا تھا کہ ہم انہیں بلیک کیٹس
اور ریڈ فوکس کی حیثیت سے پہچان چکے ہیں؟“
”نہیں۔“ چچی نے نفی میں گردن ہلائی۔
”لیکن میرا خیال تھا کہ۔۔۔۔۔“

ابھی رانگا نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک زبردست ہلچل مچ
گئی۔ یوں لگا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ گولیوں کی بمباری
ترترہاٹ، چیخ و پکار، دھماکے کی آوازیں گونجتا شروع
ہو گئیں۔ یوں لگا جیسے کوئی نہ ختم ہونے والی ہلاکتوں کا سلسلہ
اچانک ہی شروع ہو گیا ہو۔

چچی اور رانگا لنگڑا بھی بری طرح اچھل پڑے۔ نہ
جانے ان بدبختوں کے کن خطرناک دشمنوں نے اچانک ہلا
بول دیا تھا۔ مجھے فوراً یہی فکر ہونے لگی۔ میرے عقب میں
بھی دھماکوں کی آوازیں ابھریں۔ چند لمحوں کے لیے تو میں
بھی بدحواس سا ہو گیا۔ اچانک ایک شدید دھماکے کی آواز
گونجی اور میں نے ان کے ہال نما کمرے کے دو دروازوں کو
پاش پاش ہوتے دیکھا۔ چچی اور رانگا جو پہلے ہی اس صورت
خال پر بری طرح بوکھلائے ہوئے تھے، اچھل پڑے۔

میں نے آن کی آن میں دس بارہ افراد کو جدید
ہتھیاروں کے ساتھ ہال میں دو مختلف سمتوں سے اندر داخل
ہوتے دیکھا۔ یہ سب چست لباسوں میں لباس تھے۔ ان
کے انداز و اطوار سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ سب ہتھیار بدست
انتہائی تربیت یافتہ تھے۔

میرا دل رک رک کر دھڑکنے لگا۔ کون ہو سکتے ہیں یہ
لوگ؟ صحرائی عتاب یا پھر آخر الذکر وہ بڑی مشہور بلیک
کیٹس اور ریڈ فوکس؟ جنہوں نے کالی لہر کو بھی اب تک

”سرمیشن بلیک اسٹون ازڈن! آگے کیا حکم ہے؟“
یہ آواز نسوانی تھی۔ یوں بھی اس کے خدو خال سے میں اس

بہر کیف، میں نے اس شے کے زخموں میں آنے سے

نہ جانے یہ منجوس مجسمہ اور کتنے لوگوں کی جان لینے والا تھا۔ میں خود اس سے بیزار تھا بلکہ میں نے تو خود سکون کی سانس لی تھی کہ یہ منجوس مجسمہ جن لوگوں (کالی لہر) کی ملکیت تھا، انہی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ مجھے بھی اس سے کوئی عرض نہیں رہی تھی۔ جہاں تک صحرائی عقاب اور چند دیگر لوگوں

معاہدے کی بجائے اسٹور نوکرے میں کسی کی ہنگامی آہٹ کا احساس ہوا۔ کڑھکی کی جانب روشنی تھی۔ میرے دیکھ لیے جانے کا پورا احتمال تھا لیکن ابھی سوچتے ہوئے ایک ہی پل گزرا تھا کہ کینکھت کسی نے ہنگامی کی طرح مجھ پر چھینچھین مارا اور پلک جھپکتے ہی کسی آہنی گیند نے دبوچ لیا۔

میری گردن میں وہ کھنکھس چکا تھا۔ وہ کسی کا بازو نہیں تھا۔ واقعی ایک ٹولادی کھنکھس تھا جسے بڑی پھرتی اور مہارت سے میری گردن کے گرد اس طرح کس دیا گیا تھا کہ میں گردن تو کیا، سر ہلانے سے بھی قاصر ہو گیا۔ حتیٰ کہ میرا دم بھی کھنکھس محسوس ہونے لگا۔

ٹھیک اسی وقت روشنی ہو گئی۔ میں دھک سے رہ گیا۔ یہ وہی لیڈر تھا جس کی مجھ پر نظر پڑ گئی تھی۔ میں اس کی چابکدستی سے متاثر ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی سی نارنج تھی۔ وہ نہر خند نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بیما نیل نال کی گئی تھی جس کا رخ میری طرف تھا۔

”کون ہو تم۔۔۔۔۔ ان کے ساتھی؟“ اس نے بھیڑیے جیسی غراہٹ سے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں ایک قیدی ہوں۔ اپنی ساتھی کو چھڑانے آیا تھا۔“ میں نے پھنسی پھنسی آواز میں فوراً جواب دینا ضروری سمجھا۔ مجھے ڈر تھا کہیں یہ سفاک انسان جس نے آن واحد میں یہاں اپنے کارندوں کے ساتھ ہلا بول کر تقریباً سب کو ہی موت کے گھاٹ اتارا تھا، کہیں مجھے بھی نہ مار ڈالے۔

”قیدی؟“ وہ الجھ سا گیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ یقین نہ آئے تو میری ساتھی کو دکھ لو۔ وہ دوسری ایک کھنکھس میں قید ہے۔“ میں نے یہ مشکل حلق پر زور دے کر جواب میں کہا۔

باہر شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی وقت ”ٹوں، ٹوں“ کی آواز ابھری۔ لیڈر اپنے کار کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں!“ اس نے کہا۔

اس کے کار والے مانک سے آواز ابھری۔ مانک کے ساتھ ہی شاید ”وائیٹ اپیکر“ بھی تھا۔ شور کے سبب غالباً اسے ضرورتاً آن رکھا گیا تھا جس کے باعث دوسری طرف کی گفتگو مجھے بھی سنائی دی۔

”سربلیک اسٹون کو یہاں سے لانا کرنا مشکل نظر آرہا ہے۔ قبیلے والوں نے ہلا بول دیا ہے۔ جگہ جگہ انہوں نے جنگل ٹپ لگا رکھے تھے جس کی زد میں آکر ہمارے کئی ساتھی ہلاک ہو گئے۔ ہماری گاڑی بھی تباہ ہو گئی۔ صرف میں، ٹون اور زیگان باقی بچے ہیں۔ مجبوراً ہمیں واپس عمارت کے اندر پلٹنا پڑا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔“

میں اس آواز کو پہچان سکتا تھا۔ یہ سریتا تھی۔ ابھی ذرا دیر پہلے ہی میں اسے لیڈر کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ اس وقت

وہ بڑے جوش اور فحش مندی کے نشے میں گئی ”مشن بلیک اسٹون“ کی کاسیائی کے بارے میں بتا رہی تھی اور اب اس کا لہجہ انتہائی بولکلاہٹ اور کھنکھس خوردگی کا مظہر تھا۔

”یہ بہت برا ہوا ہے۔ اس کی وجہ جلد بازی ہے۔ ہم رازداری نہ برت سکے۔ ہمیں عمارت پر خاموشی سے گورینا آپریشن کرنا چاہیے تھا۔ افسوس، مجھ سے فاش غلطی ہو گئی۔ چیف سخت ناراض ہوگا۔ سریتا! ہمیں اب ہر ممکن طریقے سے مشن بلیک اسٹون کو کامیاب بنانا ہوگا ورنہ چیف ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔“

میں غور سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ دوران گفتگو لیڈر مجھ سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہوا تھا۔ اس کی گھن کارن بدستور میری جانب تھا۔

”سربلیک اسٹون کے کوشش کریں گے۔ ابھی فی الحال ہمیں عمارت تک محدود رہنا ہوگا۔ وحشی قبیلے کے لوگوں میں شدید غصہ اور اشتعال پایا جاتا ہے۔“ دوسری جانب سے سریتا کی آواز ابھری۔ ”یہ عمارت جس پر ہم نے حملہ کیا ہے، یہ ان کی عبادت گاہ بتائی جاتی ہے اور یہاں موجود لوگوں کو وہ اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں۔ آپ اس وقت کہاں ہیں؟ ہم اندر آچکے ہیں سر۔۔۔۔۔ اور۔۔۔“

لیڈر نے جلدی سے اسے اپنی یہاں موجودگی کے بارے میں بتایا اور میری جانب متوجہ ہو کر سرد و سفاک لہجے میں بولا۔

”تم رخصت ہو جاؤ۔ تمہاری ضرورت نہیں۔“ کہتے ہوئے اس نے اپنی گن کے ٹریگر پر انگلی رکھی۔

”ٹھہر جاؤ۔“ میں نے پھنسی پھنسی آواز میں یہ مشکل کہا۔ مجھے تسلیم تھا کہ آج سے پہلے میں ایسی خطرناک اور سنگین تر صورت حال کا شکار نہ ہوا تھا کہ خود کو یقینی موت کے سامنے اس قدر بے بس محسوس کر رہا تھا اور دل میں بھی یہ حسرت مجھے بری طرح اندر سے پھجھاڑے دے رہی تھی کہ فوڑیہ کا سراغ نکلے ہی میں اب بدقسمتی سے اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والا تھا۔

”یوہورگا کا جو مجسمہ تم نے یہاں سے اٹھایا ہے، وہ نکلی ہے۔“

وہ شاید مجھے مزید بولنے کا موقع دیے بغیر گولی مار دینے کا حتمی فیصلہ کر چکا تھا لیکن جیسے ہی میں نے اس کی وحشی رنگ پر ہاتھ رکھا تو بلیسی سے اس کی انگلی ہٹ گئی بلکہ یکدم گن کی نال بھی چپک گئی۔

میں نے دانستہ یوہورگا کے مجسمے کو بلیک اسٹون کے

بجائے اس کے اس نام سے پکارا تھا۔ اگرچہ مجھے ادراک ہو ہی چکا تھا کہ بلیک اسٹون درحقیقت یوہورگا کا مجسمہ ہی تھا۔ مقصد اسے فی الفور باور کرانا تھا تا کہ وہ بلیک جنٹل جسے گولی مارنے سے باز رہے۔

”قت۔۔۔۔۔ تمہیں یہ سب کیسے پتا ہے؟“ ایک انتہائی تربیت یافتہ اور جنگجو لیڈر کو ٹھوڑا ہچکلاتے پا کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اسے میری بات کو رد کرنے کی اہمیت نہ ہو سکتی تھی۔ وجہ بلیک اسٹون کا اصل نام لینا ہی تھا۔

”میں تم لوگوں کی اس سلسلے میں پوری مدد کروں گا۔ مجھے صرف اپنی ساتھی لڑکی جو میری منگیتر ہے، اسے حاصل کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں یہاں کے سارے رازوں سے واقف ہوں۔ یہاں رانا نکٹرا اور میڈم بھی نام کے دو اہم افراد اپنے ساتھیوں کے ساتھ موجود تھے۔ رانا نکٹرا کو تم نے موت کے گھاٹ اتار کر اچھا کام کیا ہے لیکن یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ جب تک ان کی دوسری ساتھی میڈم چمپی زندہ ہے جو اب مفرد ہے، وہ کسی بھی وقت یوہورگا کے سلسلے میں تمہاری راہ کا ٹانہ بن سکتی ہے لیکن مجھے ان لوگوں سے یا تم سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ ہاں، ہم ایک دوسرے کے اہم مقاصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے کی مدد ضرور کر سکتے ہیں۔“ یہ سب بتاتے ہوئے مجھے اچانک رمنڈو وغیرہ کا بھی خیال آ گیا۔ ایک لحظے کی خاموشی کے بعد پھر لیڈر سے بولا۔

”رمنڈو نامی ایک عالمی جرائم پیشہ شخص بھی اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ یہاں قدم رکھ چکا ہے۔ شروپا سردار کی بیٹی شینا اسی کے قبضے میں ہے۔ ہم اس کے بدلے میں شروپا سردار جس کا نام آٹوما ہے، معاملہ البرٹ رمنڈو کی طرف موڑ سکتے ہیں۔ اس طرح تمہاری منزل آسان ہو جائے گی اور میری بھی۔ لیکن یہ سب میری مدد کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔“

اسی وقت کھنکھس کی آواز ابھری۔ میری گردن کے گرد پٹے کی طرح کسا ہوا کھنکھس کھل گیا جسے میں نے دونوں ہاتھوں سے اتار کر اس کی طرف اچھال دیا اور اپنی گردن سہلانے لگا۔

تب ہی بھاری قدموں کی آہٹ ابھری۔ وہی حیدر اپنے دو ساتھیوں، غالباً ٹون اور زیگان کے ساتھ اندر داخل ہوئی لیکن مجھ پر نگاہ پڑتے ہی بری طرح کھنکھس اور اپنی گن کا رخ میری جانب کر دیا۔

”گن جھکا دوسرے تار! یہ اب ہمارا ساتھی ہے۔ ہم بری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔“ اچانک لیڈر نے سریتا سے کہا۔

اس کا لہجہ انتہائی کھنکھس خوردہ تھا۔ سریتا کی حسین کشادہ آنکھوں میں الجھن، حیرانی اور کچھ ہراس سا منظر آئے لگا۔ سریتا کسی اپنے لیڈر کو اور کسی میری جانب کھنکھس لہڑکا اسے مجھے اپنا ساتھی کہنا اور میرے گلے سے خود کار کھنکھس ہٹانا میرے اندر سریتاں چکا گیا تھا۔

”یہ کون ہے سر؟ آپ نے اس کی باتوں پر اتنی جلدی دشواری کیسے کر لیا؟“ سریتا اسی لہجے میں بولی۔ ”کہا خبر یہ مکر کر رہا ہو اور انہی کا ساتھی۔“

”سریتا!“ یکنفیس لیڈر گر جا۔ سریتا چپ ہو گئی۔ ”کہا تم مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتی ہو کہ میں ایسے نازک موقع پر اتنی ہن جاؤں گا؟“

”نن۔۔۔۔۔ لو۔۔۔۔۔ سر! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو بلیک اسٹون کے سلسلے میں۔۔۔۔۔“

”تمہارا وہ مشن بری طرح ناکام ہو چکا ہے۔“ لیڈر نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔ ”دھنکلی ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے میرے اور اس بارے میں مختصر ترین الفاظ میں اسے بتا دیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ لیکن ہم کیسے اس کی بات کا یقین کر لیں؟“ سریتا بہت جالاک معلوم ہوتی تھی اور محتاط بھی لیکن شاید وہ صورت حال کی غایت درجے کی نزاکت کو سمجھنے سے قاصر تھی لیکن لیڈر زیادہ ذہین اور زیرک دماغ تھا۔ اسے ادراک ہو چکا تھا کہ میں یہ سب جھوٹ نہیں کہہ سکتا تھا۔ پھر لیڈر نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہم ابھی اس کی باتوں کی تصدیق کر لیں گے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس نے جھوٹ نہیں کہا ہے۔“

میں نے یہ اعزازہ لگاتے ہی کہ یہ لوگ انڈین تھے، میں نے اپنا تعارف اور تعلق پاکستان کے بجائے بنگلادیش سے ہی بتایا اور نہ میرے اور فوڑیہ کے لیے کوئی نئی معیبت کھڑی ہو سکتی تھی۔

باہر شور بدستور بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے فوڑیہ کی طرف سے تشویش آمیز بے چینی لاحق ہونے لگی۔ میں نے کہا۔

”خدا کے لیے مجھے اپنی منگیتر کو تلاش کر لینے دو۔ کہیں اس ہنگامے کے دوران اسے کوئی جانی نقصان نہ پہنچ جائے۔“ میں نے لیڈر کی منت کر ڈالی۔ اس نے میری طرف ایک نگاہ ڈالی پھر سریتا سے پوچھا۔

”بلیک اسٹون کہاں رکھا ہے؟“

”عمارت کے اندر گاڑی کھڑی ہے، اس میں موجود

ہے۔" سرتیانے جواب دیا۔
 "اوکے۔ تم زیگان کو لے کر اس کے ساتھ جاؤ، میں
 فوتن کو لے کر گاڑی کی طرف جاتا ہوں۔ مجھے اب کفرم کرنا
 ہوگا کہ یہ بلیک اسٹون اسکا ہے یا نہیں۔"
 "لیکن سربا ہران دس تباہیوں کا جہوم موجود ہے۔
 وہ کسی بھی وقت یہاں ہلا بول سکتے ہیں۔" سرتیانے کہا۔
 "میں اور دوسرے سامی انہیں سنبالنے کی کوشش
 کرتے ہیں۔" لیڈر نے کہا۔ "لیکن اپنا مقصد حاصل کیے
 بغیر یہاں سے نہیں جاسکتے۔ چف ہر صورت میں مشن
 بلیک اسٹون کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہے۔"
 اس کی بات پر سرتیانے فوراً اشارت میں اپنے سر کو
 جنبش دی۔ میں نے لیڈر کا پردہ دل سے شکر یہ ادا کیا اور پھر
 سرتیا اور اس کے سامی زیگان کے ساتھ دروازے سے
 باہر نکل گیا۔
 مجھے سرتیا یا زیگان کو ساتھ لے جانے کی کوئی ضرورت
 نہ تھی۔ لیڈر نے میرے فرار ہونے کے خدشے تلے اسے ایسا
 حکم دیا تھا۔ میں تیزی سے باہر نکلا۔ سرتیا اور زیگان میرے
 عقب میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ہنوز جدید نہیں دہی
 ہوئی تھیں اور میں نہتا تھا۔ مجھے اس کی پروا نہ تھی۔
 میں دیوانہ وار دوڑتا ہوا ایک مختار انداز سے اسی
 گھیارے نما گوشے تک جا پہنچا جہر ذرا دیر پہلے الپانا
 میرے ہمراہ تھی اور دھوکے سے مجھے اس نے آگے پیش
 قدمی کی ترغیب دیتے ہوئے گہری کھائی میں گرا دیا تھا۔
 اسی جانب کوٹھڑی کی کڑکی تھی لیکن اب میں نے
 دوبارہ وہی بے وفائی نہکی اور بجائے سیدھا کڑکی کی طرف
 بڑھنے کے، اس کے عقبی سمت جا پہنچا۔
 اس دوران میں نے محسوس کیا کہ ایک دو بار سرتیا اور
 زیگان نے ایک دوسرے سے کچھ کہا تھا۔ مجھے اس بات پر
 تھوڑی حیرت تو ہوئی تھی کہ یہ دونوں آپس میں انگریزی
 زبان میں بات کر رہے تھے اور زیگان کالب دلچہ بالکل غیر
 ملکی تھا مگر میں نے زیادہ توجہ نہ دی۔ ظاہر ہے مجھے ان
 لوگوں کے کسی معاملے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں تو بس
 فوزیہ کو آزاد کروا کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ بعد میں
 سب میری طرف سے بھارت میں جاتے۔
 یہاں مجھے ایک سنگل پٹ دروازہ دکھائی دیا۔ میرے
 اندر جنون بھرا ہوا تھا۔ حالانکہ سرتیا اور زیگان کے پاس نہیں
 موجود تھیں لیکن مجھ میں اب ہر کار یا کہاں رہا تھا۔
 میں نے دیوانہ وار آجمل کر ایک زور دار نکر

دروازے کو دوسے ماری۔ وہ نوٹ کر اندر جا کر ا اور میں
 بھی۔ میری اس جنون خیز حرکت کو خیر و سریتا اور زیگان نے
 بھی دیکھا ہوگا اور تحیر ہوئے ہوں گے۔
 اندر تاریکی تھی لیکن سرتیانے مارچ روشن کر دی۔
 کوئی ہولے سے خوف یا کسی اور سبب کراہ رہا تھا۔ یہ نسوانی
 آواز، یہ نرم و نازک لہجہ..... جو بغیر ایک لفظ ادا کیے میں پل
 کے پل پہچان چکا تھا۔ اس آواز کو میں کیسے بھلا سکتا تھا۔ اس
 لہجے کو میں کیونکر فراموش کر سکتا تھا۔ یہ آہنگ تو میرے دل
 و دماغ میں مہر و قاف کی طرح ثبت ہو چکا تھا۔
 بہت گندا کرا تھا۔ کرا کیا کوٹھڑی تھی، جنگ و تارک،
 جس زندہ، نیچے چھت، اور گرد گھاس، کاٹھ کاڑا اور جانے کیا
 الا بلا بکھرا ہوا تھا اور انہی میں وہ ایک نرم و نازک وجود بھی
 جیسے بکھرا ہوا تھا۔ پڑھو، حیات در ماندہ سا اور آس دیاں
 کا مارا ہوا وجود، جس کی ہیت لکڑی بس جیسے ایک امید آخر
 پر گھٹکی کی تھی۔
 وہ ایک بوسیدہ، اکھڑے اکھڑے پلاسٹر والی سیلن
 زندہ دیوار سے لگی بیٹھی تھی، یوں کہ اس کے بال بکھرے
 ہوئے تھے۔ ان میں زمانوں کی گردانی ہوئی تھی، سر جھکا ہوا
 تھا اور بس ایک ذرا سی جنبش سے وہ اٹھتا تھا۔ دیوار پر آہنی
 کڑے سے ایک زنجیر نکل کر اس کا آخری سرا اس کی نازک
 پنڈلی سے منسلک تھا۔
 مجھے جانے کیا ہو گیا تھا، کیسا سکتہ طاری ہوا تھا مجھ پر
 کہ بولنے، حرکت کرنے تک کا بھی یاد نہ رہا تھا۔ میں دل
 محسوس کر رہ گیا، دماغ جیسے سن ہو گیا تھا۔ تب ہی یکایک
 میرے اندر آتش فشاں اٹلا۔ ایک لاوا سامیری برفاب
 رگوں میں دوڑا اور میں اس کی جانب لپکا۔
 "قف..... فوزیہ!"
 وہ شاید میرے منہ سے نکلنے والی اسی صدا کی منتظر
 تھی۔ اس نے سر اٹھایا۔ میں اس کے قریب جا کر بیٹھا نہیں
 بلکہ گرسا گیا اور اسے لپٹا لیا۔
 "سک..... سہراب..... ی..... یہ تم ہو.....؟"
 اس کے چہرے پر جے لب متحرک ہوئے اور اسے جیسے یقین ہی
 نہ آیا۔
 "ہاں فوزیہ..... ایہ میں ہی ہوں۔"
 بس پھر اس کی سر میں بائیں میرے گلے میں آن
 پڑیں۔ میری وارفتہ گرفت بھی اس کے نقشہ وجود کا حلقہ بن
 گئی۔ ہم دونوں جیسے موم ہجرال کے مارے ہوؤں نے
 ایک دوسرے کو خود میں سمایا اور اسی طرح ایک دوسرے

کے ساتھ لے لئے رہے۔ اب ان جدا نہ ہوں گے۔
 "فوزیہ!" میرے لرزیدہ ہونٹوں سے بس اسی قدر
 ہی برآمد ہوا جاتا..... لیکن نہیں، یہ میرے منہ سے نہیں، یہ
 نام تو جیسے میرے دل کی متین گہرائیوں سے نکلا تھا۔
 اس نے اپنا سندر و شکل چہرہ جواب اشکوں سے بھیگنے
 لگا تھا، میرے سینے پر رکھ دیا اور میں اس چہرے کی، اس
 کی گداز میں سر میں ہانپوں کے حلقے کی گہری محسوس کرنے لگا
 جو میرے وجود میں متحرک تھیں۔ وہ بار بار اپنا انگلیاں چہرہ
 بے تابانہ انداز میں میرے سینے پر رگڑے جا رہی تھی، اپنی
 ہانپوں سے مجھے کھینچے اور پیچھے جا رہی تھی۔ میرے بازوؤں کا
 حلقہ بھی یوں جیسے اسے خود میں سمو لینے کے لیے بے قرار ہوا
 جاتا تھا۔
 دو پچھڑے ہوؤں کو ایک دوسرے کا سہارا کیا ملا، جیسے
 ساری دنیا مل گئی۔ پورے جہاں کی دولت مل گئی۔ اس دوران
 سرتیا اور زیگان ٹوٹے ہوئے دروازے کی چوکھٹ پر جیسے
 بت بنے کھڑے ہماری دروں و بدوں کیفیات کو کھتے رہے۔
 ادھر جذبات کا طوفان تھمنے کا نام نہ لیتا تھا کہ اچانک
 مجھے عقل و خرد کا یار ہوا اور وقت اور حالات کی نزاکت کے
 پیش نظر میں نے کہا۔
 "فوزیہ! وقت کم ہے۔ خود کو سنبھالو۔ ہمیں یہاں سے
 فوراً نکلنا ہوگا۔"
 فوزیہ نے بھی ہمت سے کام لیا۔ وہ بھی ذرا سنبھالا
 لینے لگی۔ تب ہی میں نے فوراً اس کی نازک پنڈلی کا جائزہ لیا
 جہاں مستقل بندھے فولادی کڑے سے جلد پر نسل سا پڑ چکا
 تھا۔ میں فوراً اٹھا اور سرتیا کی جانب پلٹ کر اسے مخاطب
 کر کے بولا۔
 "تمہارے پاس کوئی ایسی شے ہے جس سے میں اس
 کے آہنی جکڑ بند کھول....." میں اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔
 دیکھا، نقاب سے دکھائی دیتیں اس کی کشادہ سیاہ آنکھیں
 بری طرح بھیگی ہوئی تھیں۔ میں چونک پڑا۔ مجھے اس کی
 کیفیت پر حیرت ہوئی مگر سادہ قائم نہ رہی۔ ہر اہل دل دو
 عرصے سے پچھڑے ہوؤں کی دل آزار کیفیات کو محسوس
 کر سکتا تھا اور کچھ بھی سکتا تھا۔
 تاہم سرتیانے مجھے متوجہ پا کر جلدی سے اپنی مناک
 آنکھوں کو پونچھا اور اپنی ساڑ پانکٹ سے ایک کٹر نکال کر
 بڑھا دیا۔ زیگان بخود سرتیا کو گھور رہا تھا۔
 میں نے جلدی سے سرتیا کے ہاتھ سے وہ کٹر لیا اور
 فوزیہ کی پنڈلی کا کڑا نہایت احتیاط سے کاٹنے لگا۔ اس

دوران میں نے اپنے عقب میں کسی کو سخت لکچے میں
 بڑبڑاتے سنا۔
 "جہیں اتنا جذبہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا
 تم نہیں جانتی ہو کہ ہمارے ہاں ان جذبات کی کوئی حیثیت
 نہیں ہے؟"
 یہ زیگان تھا جو سرتیا سے مخاطب تھا۔ تب ہی مجھے
 جواب میں سرتیا کی ہمدردی میں آواز سنائی دی۔
 "اس نان آف یور بزنس سسر زیگان! تم اپنے کام
 سے کام رکھو۔" زیگان چپ ہو رہا۔ مجھے لگا جیسے سرتیا اور
 کردہ سے تعلق رکھتی تھی اور زیگان کی اور ٹوٹے سے حلق
 تھا۔ تب ہی میرے ذہن میں "بلیک کیٹس" اور "ریڈ
 فوکس" کے مشترکہ مشن کا وہ حوالہ گھوم گیا جس کا ذکر صحرائی
 عقاب کے سربراہ البرہت رمندو نے مجھ سے کیا تھا۔ میں
 نے دونوں پر ہی لکھت بھیجی اور فوزیہ کا فولادی کڑا کاٹنے
 میں مصروف رہا۔
 جب وہ کٹر کا تو معاشی قیامت خیز شری کی آواز بلند
 ہوئی۔ یوں لگا جیسے جنگلی وحشیوں کا پورا قبیلہ عمارت کے اندر
 ٹھس آیا ہو۔ تب ہی کوئیوں کی ترزا ہٹ بھی بلند ہونے لگی۔
 "جلدی کرو، لکھو یہاں سے۔ جنگلیوں نے عمارت پر
 ہلا بول دیا ہے۔" سرتیانے کہا۔ میں نے فوزیہ کو سہارا دے
 کر اٹھایا۔ وہ بے چاری جانے کب سے اس پڑا زار زمناں
 میں مقید رہی تھی۔ وہ بہت خائف و زار اور کمزور نظر آرہی تھی
 مگر آفریں ہے اس کی ہمت کو، اس نے بھی پورا ساتھ دیا۔
 شاید میری موجودگی اور آمد نے اس کا حوصلہ بڑھا دیا اور نئی
 طاقت چمک دی تھی۔
 ہم جلدی سے نکلے۔ سرتیا کی آنکھوں میں فوزیہ اور
 مجھ سے متعلق ہنوز جذباتیت ہو چکی تھی لیکن زیگان بہت
 کڑی نظروں سے ہماری طرف گھورتا جاتا تھا۔ میں نے
 کوئی پروا نہ کی اور ہم سب تیزی سے اس ننگ و تارک اور
 اندھیری کوٹھڑی سے نکل کر اسی نامکشادہ کمرے میں
 آگئے جہاں کچھ دیر پہلے ان کا لیڈر موجود تھا مگر وہ اب
 وہاں نہیں تھا۔
 اسی وقت سرتیانے اپنے کارلڈر سیزر سے رابطہ کیا۔
 اسے میرے اور فوزیہ کے بارے میں بتا دیا کہ میں جموت
 نہیں کھ رہا تھا۔ یعنی میں بھی ان کا (کالی لہر) والوں کا دشمن
 تھا..... وغیرہ۔ لیڈر کو تو خبر پہلے ہی مجھ پر نہیں ہو چلا تھا کیونکہ
 میں اسے کالی لہر والوں سمیت بوسورگ کے مجھے اور شرپا کے
 بارے میں چکا تھا۔ اب کو با تصدیق ہو چکی تھی۔

لیڈر نے انہیں عمارت سے باہر ایک جگہ پہنچنے کا حکم دیا۔ ہم وہاں آگئے۔ فوزیہ کی حالت کچھ بہتر تھی یا پھر قید سے رہائی اور میری آمد نے اس کے دل دو مارچ پراچھاڑ کیا تھا اور جس طرح کی قید بند کی زندگی بتا رہی تھی اس میں تو انسان ادھ دھواہی ہو جاتا ہے۔

بہر حال میں فوزیہ کو لے کر جلد سے جلد کسی محفوظ مقام تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ فوزیہ مجھے چمکی تھی۔ اب میں وہاں کے بارے میں غور کر سکتا تھا لیکن حالات اب بھی دگرگوں تھے۔ وہاں پہنچنے تو لیڈر اپنے چند مسلح ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ یہ عمارت کا بیرونی گوشہ تھا اور جنگیوں نے عمارت کے وسیع احاطے میں ہلا بول رکھا تھا۔ یہ لوگ یہاں سے ان پر فائرنگ کر رہے تھے اور دسی بم اچھا اچھا کر انہیں عمارت سے ہٹا رہے تھے۔

میں نے لیڈر سے کہا۔ ”اپنے ساتھیوں کو ادھر ہی ان جنگیوں سے مصروف رہنے دیں۔ ہمیں ان کے ٹھکانے پر پہنچنا ہے۔ اس میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔“ لیڈر سمجھ دار تھا۔ اسے ہر بات کا ادراک ہو جاتا تھا۔ پھر اب تک میری کوئی بات جھوٹ بھی ثابت نہ ہوئی تھی اسی لیے بے چون و چرا اس نے میرے مشورے پر عمل کیا۔

اس نے صرف سر ہٹا کر اپنے ساتھ رکھنا چاہا تو زیگان نے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ لیڈر اسے منع نہ کر سکا۔ مجھے زیگان کی شخصیت کھٹک رہی تھی۔ وہ مجھے اس لیڈر کی ”ناجتنی“ میں کم ہی نظر آتا محسوس ہو رہا تھا۔

بہر کیف، مجھے ان سے کیا لینا دینا تھا۔ ہم چل پڑے۔ عمارت کے عقبی خفیہ گوشے سے ہم باہر آگئے۔ اب ہمارا رخ جنگیوں کی آبادی کی طرف تھا۔ رمندو جسے پہلے ہی معلوم تھا کہ بیوروگ کا مجسمہ جسے عمارت میں کالی لہروالوں نے ایک معبد خانہ بنا کر اس میں رکھا ہوا تھا، وہ ٹکی تھا۔ اسی لیے مجھے شبہ تھا کہ ممکن ہے ہمارا ٹاکرا الیانا، برگنڈی اور رمندو سے ہو سکتا تھا۔ رمندو ایک چالاک اور موقع شناس آدمی تھا۔ اس نے جب کالی لہروالوں کے ٹھکانے کے حالات دیکھ لیے تو سمجھ چکا ہوگا کہ یہ کارستانی بلک کیش اور ریڈ فوکس والوں کے سوا اسے اور کسی کی نہیں ہو سکتی، جیسا کہ وہ جانتا تھا۔ لہذا اس نے میری طرف سے توجہ ہٹا کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ شروع آبادی کی طرف کیا ہوگا۔

یہ سوچ کر مجھے تشویش لاحق ہونے لگی۔ اگر وہ کینٹ مجسمہ بے اڈا تو میرے لیے مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا۔ خبر، میں ان کے... ٹھکانے سے بھی واقف تھا جہاں انہوں نے ایک

گیمہاں شینا کو بھی قید کر رکھا تھا۔

ہم آبادی میں جا پہنچے۔ سحر طلوع ہونے لگی تھی۔ جنگل دھیرے دھیرے بیدار ہو رہا تھا۔ یہاں ہمیں جا بجا خر و مل پتھوں والی سرکنڈوں کی جموٹریڈیاں دکھائی دیں۔ کچھ مویشی نظر آئے۔ عورتیں، بچے، بوڑھے اور کچھ جوان بھی نظر آ رہے تھے۔

ایک نسبتاً گنبد نما گارے مٹی اور سرکنڈوں کی بڑی سی کشادہ جموٹریڈی دکھائی دی۔ یہاں سردار آٹو ما کی رہائش ہو سکتی تھی۔ ان لوگوں کی عبادت گاہ بھی یہی تھی۔ یہاں بھی ہمیں آخر اتفری کا عالم دکھائی دیا۔ بالخصوص اس مذکورہ جموٹریڈی کے گرد جنگی عورتیں، بچے، بوڑھے اور کچھ نوجوان زور زور سے چلا کر بائیں کر رہے تھے۔ ہم یہ باتیں سمجھنے سے قاصر تھے۔

ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ سے یہ سب ہم دیکھ رہے تھے۔ میں نے پرستوج انداز میں اپنے ہونٹ بچھڑکے تھے۔ ”وہ لوگ مجسمہ لے اڑے ہیں۔“ معانی میرے منہ سے سرسراتے انداز میں برآمد ہوا۔

”کون لوگ؟“ لیڈر نے سرگوشی میں چونک کر کہا۔

”البرٹ رمندو اور اس کے ساتھی۔“

”ادھو۔“ سریتا کے منہ سے برآمد ہوا۔

”فکر مت کرو۔ مجھے ان کا ٹھکانا معلوم ہے۔ جلدی چلو۔“ میں نے کہا۔

”نظمہ جاؤ۔“ یکا یک زیگان نے سمجھ لے لیے میں کہا اور مجھ پر گرن تان لی۔ ”سچ بتاؤ، تم کون ہو اور ہمیں کس کے کہنے پر چکر دے رہے ہو؟“ وہ بڑے غبی اور چڑش لہجے میں مجھ سے بولا۔ فوزیہ پریشان ہو گئی۔ سریتا اور لیڈر بھی اس کی حرکت پر گرم دم سے ہو گئے۔

میں نے زیگان کے لب و لہجے سے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا کہ یہ ان لوگوں (لیڈر اور سریتا وغیرہ) کا ساتھی تو تھا۔ مگر ان میں سے لگتا نہیں تھا جیسے لیڈر اور سریتا رد بول رہے تھے اور زیگان انگریزی۔ یہ لوگ ہنوز سیاہ چست لباس اور نقاب میں تھے تاہم اس کی آنکھوں سے جھلکتی سفائی اور تنگ نظری کو میں محسوس کر سکتا تھا۔

”میں جو ہوں، وہ میں بتا چکا ہوں۔ تمہیں مجھ پر کس بات کا شبہ ہے؟“ میں نے بھی بلا خوف اس سے کہا۔

”زیگان ایسا کیا حرکت ہے؟ کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو یہ ہماری مدد کر رہا ہے؟“ لیڈر نے اسے جھڑک دیا۔

”یہ چالاک سے اپنا مقصد پورا کر کے یہاں سے

نہ چکر ہو جائے گا۔“ زیگان نے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں پہلی بار الجھن تیر گئی۔ میں آگے بولا۔ ”اپنی ساتھی کو قید سے رہائی دلانے کے دوران مجھے مجبوراً سب کے ساتھ گٹھ جوڑ کر پڑا تھا۔ البرٹ رمندو سے بھی میری اسی معاملے میں شناسائی ہوئی تھی۔ اب یہ حادثاتی تھی یا اتفاقی..... لیکن انہوں نے مجھے آخر میں دھوکا دیا۔ اب تم نے ٹکراؤ ہوا تو تمہارے ساتھ ہوں میں۔ کیا تم لوگ بھی مجھے دھوکا دو گے؟ جبکہ میں تمہیں تمہارے مقاصد میں کامیابی دلانے کا وعدہ کر چکا ہوں اور اپنی منگیتر سمیت تم لوگوں کے ساتھ ہی ہوں۔“

”وقت ضائع مت کرو زیگان!“ اس بار سریتا نے اسے جھڑکا۔

”یہ سچ کہہ رہا ہے۔“ لیڈر نے بھی زیگان کو گھرک دیا۔ ہم روانہ ہو گئے۔ زیگان کی شخصیت مجھے بڑی پراسرار لگی لیکن ابھی یہ سب سوچنے کا وقت نہ تھا۔

ہم فوراً ہی البرٹ رمندو کے ٹھکانے کی جانب چل دیے۔ وہاں تک پہنچتے تو نقشہ ہی اور تھا۔ وہ لوگ جاچکے تھے۔ میں نے کچھ سوچ کر دھڑکتے دل کے ساتھ اس گیمہاں کا رخ کیا جہاں ان لوگوں نے شینا کو قید کر رکھا تھا اور اس کی حالت ایک پرانے زخم کے سبب خراب ہو رہی تھی۔

وہاں پہنچا تو میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بیچھڑ لیا۔ شینا کی لاش گولیوں سے پھٹی پڑی تھی۔ مجھے اس کے مرنے کا بڑا دکھ ہوا۔ ساتھ ہی البرٹ رمندو کی سفاکی پر میرے سینے میں اس ظالم کے لیے نفرت کی آگ سی سلگ اٹھی۔

میرے کہنے پر لیڈر نے اپنے چند ساتھیوں کو گاڑی سمیت بلوایا۔ زمین پر گاڑی کے پہیوں کے نشانات تھے۔ ”ہمیں البرٹ کو جنگل سے نکلنے سے پہلے ہی پکڑنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر اس نے اپنے ساتھیوں کو بلوایا تو حالات ہمارے حق میں نہیں رہیں گے۔“

تم آمدنی طوفان کی طرح روانہ ہو گئے۔ چونکہ اب وہاں نظمہ نے کا کوئی مقصد نہ رہا تھا اسی لیے لیڈر نے اپنے مارے ہی ساتھی بلوایے تھے۔ ان کی تین تیز رفتار گاڑیاں تھیں۔ ٹائروں کے نشانات پر ہم البرٹ رمندو کے نقاب میں روانہ ہو گئے۔

ان لوگوں نے اب اپنے چہروں سے سیاہ نقاب اتار لیے تھے۔ لیڈر کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ بالکل میری عمر کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ میری ہی طرح تو مند تھا۔

ان لوگوں نے اب اپنے چہروں سے سیاہ نقاب اتار لیے تھے۔ لیڈر کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ بالکل میری عمر کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ میری ہی طرح تو مند تھا۔

ان لوگوں نے اب اپنے چہروں سے سیاہ نقاب اتار لیے تھے۔ لیڈر کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ بالکل میری عمر کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ میری ہی طرح تو مند تھا۔

جنگل باہر

رنگت قدرے سالولی اور آنکھوں سے بے پناہ ذہانت اور ہوشیاری مترشح تھی۔ لیڈر کا نام مجھے کبھی معلوم ہوا۔ یہ سب انڈین تھے۔ ابھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ بلیک کیش سے تھے یا ریڈ فوکس سے۔ یہ ان کا اپنا خاص نمکرت تھا اسی لیے جتنا مجھے فی الحال ان کے بارے میں معلوم ہوا میں نے ابھی اسی پر ہی صاف کر رکھا تھا۔ یوں ہی مجھے آگے ان کے بارے میں سمجھنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟

فوزیہ مجھے مل چکی تھی۔ گویا میرا دیرینہ مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اب اس کی قیمت میں اگر میں ان لوگوں کی مدد کر رہا تھا تو میرا کیا جاتا تھا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اب بھی جو ہو رہا ہے، وہ سچ نہیں ہے۔ بس، اسی بات پر میرا ”انداز“ کچھ نامعلوم سی بے چینی کا شکار تھا۔

اس کے دو قرعہ ساتھیوں میں سریتا..... جسائی ہی نہیں بلکہ شکا بھی بہت حسین نوجوان لڑکی تھی۔ باقی ان کے ساتھی بھی بیگ تھے۔ وہ سب مجھے انڈین ہی نظر آئے۔ لیکن ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو مجھے غیر ملکی لگے۔ وہ مجھے زیگان کے ساتھ محسوس ہوئے کیونکہ زیگان ان میں سے مجھے بالکل مختلف لگا۔ وہ ایک گورا چٹا اور خر و مل چرے والا شخص تھا اور عمر میں بھی کچھ بڑا تھا۔ مجھے وہ انڈین تو ہرگز نظر نہیں آیا۔ اس کی آنکھیں چنی چنی اور ان میں مکاری بھری ہوئی تھی۔ طوطے کی طرح نگلی ناک اس کی فربہ کار ذہنت کا پتا دیتی تھی۔ سر قدرے گھٹیا تھا۔ اسے دیکھ کر جانے کیوں آپوں آپ ہی میرے دل میں نفرت سی محسوس ہوئی۔ نگلی ٹھوڑی پر ہلکی ڈاڑھی تھی۔ وہ اب بھی گاے رہا ہے مجھے گھور گھور کر دیکھ لیتا تھا۔ بالفاظ دیگر وہ مجھ سے بالکل بھی مطمئن نہ تھا۔

بہر کیف، البرٹ رمندو بہت چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ جس وقت لیڈر وغیرہ اور گرد پنے کالی لہر کے ٹھکانے پر دھاوا بولا تھا، اس وقت رمندو بھی آس پاس موجود تھا۔ یہ اس کے لیے ”پلس پوائنٹ“ ثابت ہوا۔ اس چالاک آدمی نے ان سب کو ادھر اٹھا کر رکھا کیونکہ کالی لہر کے ٹھکانے پر حملہ ہوتے دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ لیڈر وغیرہ دھوکے میں آئے ہوئے ہیں اور اس نے وقت ضائع کیے بغیر شروع پانچویں کارخ کیا اور وہ بھی بڑے صبر کے ساتھ۔ جب اس نے دیکھا کہ مارے قابل و وحشی منتقل ہو کر ایک بڑے بجم کی صورت میں عمارت کی جانب جا چکے ہیں، اس نے خاموشی کے ساتھ اپنا ”کام“ ٹمٹما یا اور شینا کو ہلاک کر کے اپنی راہ لی۔

ٹھوڑی دیر تک ہم تعاقب میں رہے لیکن جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ اس تعاقب کی حکمت عملی تبدیل کرنا پڑے

فریڈک میٹھون کا شمار ملک کے نامور نفسیات کے
ڈاکٹروں میں ہوتا تھا جبکہ ہنری کا مایاب برنس میں تھا اور
ابن اس کی بیوی تھی۔ تینوں نے ایک ہی کان سے تعلیم
جامل کی تھی۔ بعد ازاں فریڈک پی ایچ ڈی کرنے بیرون
شہر سے باہر جامل کے کنارے واقع کالج میں ملاقات کرتے

حسب منشا

عمران تریخی

بعض اوقات انسان فیصلہ کن لمحات میں بروقت کوئی
قدم نہیں اٹھا پاتا مگر دشمن انہی لمحات میں بازی مار لیتا
ہے... اسے بھی یہی پچھتاوا اندر ہی اندر کھا رہا تھا مگر
افسوس اس کا اظہار بھی اس کی زندگی کو مشکل بنا رہا
تھا... لہذا اس نے عقلمندی کھیلی اور ایک تیر سے دوشکار
کر کے سناپ کو بھی مار دیا اور لالچی کو بھی بچالیا... یہ
اور بات کہ حسب منشا نتائج پانے کے باوجود چہرہ بے
نقاب ہو گیا۔



پھر وہ زیگان سے کیونکر اس قدر دب رہا ہے؟ معاملہ کچھ
پر اسرار تھا۔

اچانک ایک موقع پر ان کے ایک ساتھی کی خبر
ٹرانسمیٹر پر کال آئی۔ اس نے بتایا کہ ایک مقام پر ہنری کے
پارچہ لوگوں کا پڑاؤ دکھائی دیا ہے۔ وہاں ایک جیب بھی
موجود ہے۔

”تم انہیں فوراً قریب جا کر ٹریس کرنے کی کوشش
کرو۔“ بمیل داس جوش سے بولا۔ ”لیکن ابھی حملہ کرنے
کی غلطی مت کرنا۔ ہمارے چیلنجے کا انتظار کرو اور دوسری
گاڑی میں موجود ساتھیوں کو بھی اسی مقام پر پہنچنے کا کہہ
دو۔۔۔۔۔ اور ایڈ آئل۔“ کہتے ہی اس نے فون کو (ٹرانسمیٹر)
وچل پر وہی براجمان تھا) مذکورہ سمت گاڑی موڑنے کا حکم
دے ڈالا۔

گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔ جنگل کے درمیان سے بے
ترتیب راستوں پر ہماری گاڑی بچو لکھائی آگے بڑھتی
رہی۔ فوڑیہ بھی ہوئی سی میرے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ میں اسے
تھپک تھپک کر تسلیاں دے رہا تھا اور خود بھی اس بات پر غور
کرتے لگا تھا کہ ان سے جلد از جلد جان چھڑا کر رائیگاں
پہنچنے کی کوشش کروں جہاں شاید اب بھی برنس اسٹارٹر سسٹم
کپٹی کا ”ڈیر“ موجود ہو۔ لہذا یہاں کے معاملات سے
منہ پھرنے کے بعد فوڑیہ اور میرے لیے وہ جگہ عارضی طور پر ہی
سہی، سر دست محفوظ ہو سکتی تھی۔

فون نے بمیل داس کی ہدایت پر گاڑی کا رخ نہری
طرف موڑ لیا۔ دن نکلا ہوا تھا اور دھوپ کرنوں کی صورت
میں بلند وبالا درختوں اور لمبی لمبی گھنیری شاخوں سے چھن کر
زمین پر پڑ رہی تھی۔ ابھی ہم ایک اندازے کے مطابق نہر
سے ذرا ہی قریب تھے کہ اچانک دوبارہ خفیہ ٹرانسمیٹر کی
بپ ابھری۔ بمیل داس نے فوراً اپنے کار پر ہاتھ رکھ کر کال
ریسیو کی۔

”اوہ بھگوان.....!“ دوسری جانب سے کچھ سن کر
بے اختیار بمیل داس کے منہ سے نکلا۔ ہم سب چونک گئے۔
”کیا ہوا سر؟“ سریتا نے اذراہ تشویش پوچھا۔
زیگان اور فون بھی پریشان سے ہو گئے۔ بمیل داس کال
میں مصروف رہا۔

معاشقہ ناسوروں اور خندوں کی خون ریز سازشوں
اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی خلدوز
داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

کی کیونکہ البرٹ رمنڈو کو یقیناً اس بات کا بھی ادراک ہوگا
کہ جلد یا بدیر ہم یا کوئی بھی ان کے تعاقب میں روانہ ہو سکتا
تھا۔ اس لیے وہ اپنی راہیں بدل بدل کر سفر کر رہا ہوگا۔ ممکن
ہے اس کی منزل چٹاگانگ ہو یا پھر کلکتہ۔ وہاں سے وہ انڈیا
کے راستے اپنے ملک امریکا سدھارنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ یہ
بھی ہو سکتا تھا کہ وہ فی الحال چٹاگانگ یا کلکتہ میں اپنے کسی
خفیہ ٹھکانے میں رک جاتا اور اپنے ساتھیوں کے ذریعے کسی
چارٹر طیارے کا بندوبست کر کے بر آسانی ایک ”شارٹ
ڈے“ میں نکل جاتا۔

یہ سب باتیں میرے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔
تب ہی میں نے لیڈر کو مشورہ دیا کہ اپنے ساتھیوں کی جودو
گاڑیاں ہمارے ساتھ ہیں، انہیں دو مختلف سمتوں کی جانب
روانگی کا حکم دے دو۔

بمیل داس کو میری یہ تجویز پسند آئی لیکن زیگان کو
اعراض ہوا، وہ بولا۔ ”یہ غلط ہے۔ اس طرح ہم تنہا رہ جائیں
گے۔ اگر راستے میں گمات لگا کر رمنڈو اور اس کے ساتھیوں
نے ہم پر حملہ کر دیا تو ہمیں سے کوئی بھی نہیں بچے گا۔“

میں اس کی بزدلی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔
”تمہاری زبان سے یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی مسٹر زیگان!“
میں نے اسے مخاطب کر کے کھنڈی ہوئی متانت سے کہا۔
”میں بتا چکا ہوں کہ اس وقت رمنڈو کے ساتھ تین چار سے
زیادہ آدمی نہیں ہیں۔ اسلحہ بھی اس کے پاس محدود اور عام
ساخت کا ہے جبکہ اس وقت فوڑیہ کو چھوڑ کر بمیل داس،
سریتا، فون، ہم اور میں لڑنا جانتے ہیں اور ہمارے پاس اسلحہ
بھی جدید ساخت کا ہے۔ یہی نہیں، ہمارے پاس وسیع جیل
عمل والے ٹرانسمیٹر بھی ہیں جن سے ہم اپنے باقی ساتھیوں
کے ساتھ رابطے میں بھی رہیں گے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ سریتا بولی۔ پھر بمیل داس
کو بھی سادہ کرنے کی تجویز دی جسے پہلے ہی میری اس حکمت
عملی سے اتفاق تھا۔ لہذا ایسا ہی کیا گیا۔ زیگان مطمئن نظر
نہیں آ رہا تھا۔ تب ہی میں نے دیکھا کہ بمیل داس اور
زیگان آپس میں چپٹی آواز میں کھسر پھر کرنے لگے۔ میں
نے کوئی توجہ نہ دی۔ سفر جاری تھا البتہ سریتا ان دونوں کی
وجہ سے انداز کی منگبو بڑے غور سے سن رہی تھی۔

نہ جانے وہ دونوں آپس میں کیا باتیں کر رہے تھے
تاہم مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ بمیل داس، زیگان کو کسی بات پر
مطمئن کرنے کے لیے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔
مجھے ایک بار پھر حیرت ہوئی کہ بمیل داس تو گر پ لیڈر ہے

تھے۔ پہنچ ہنری اور این کا تھا۔ اس کے سامنے واقع وسیع و عریض چھیل میں بہت چھیلیاں پانی جاتی تھیں۔ وہ تینوں شام سے پہلے بلیاں ڈال کر چھیلیوں کا شکار کرتے اور این انہیں پکانے کے لیے کچن میں لے جاتی۔ فریک اور ہنری شراب کی بوتل لے کر ملحقہ کمرے میں بیٹھ کر شراب نوشی کرتے اور جب این چھیلیاں تل کر انہیں ڈانٹنگ چھیل پر رکھتی تو فریک کے اصرار پر کالج کی تمام لائسنس بند کر دی جاتیں اور موسم بیوی کی روشنی میں ڈنڑکا جاتا۔ اس کے بعد کی تمام رات چھیل کے سرد پانیوں میں تیراکی کرتے ہوئے گزر جاتی۔ صبح وہ ہنری کی گاڑی میں شہر آتے اور اپنی مصروف زندگیوں میں گم ہو جاتے۔

یہ ایسی ہی ایک رات کا واقعہ ہے۔ شراب نوشی اور طعام کے بعد ان تینوں نے حسب معمول تیراکی کی اور چھیل کے کنارے لگے ہوئے بیچوں پر بیٹھ گئے۔ کافی این بنایا کرتی تھی لیکن اس دن ہنری نے بنانے کی اجازت لی اور کچن کی طرف چلا گیا۔ این اور فریک چھیل کے کنارے بیٹھ کر کالج کے دونوں کو یاد کرنے لگے۔

وہ بیٹوں اکٹھے ایک ہی بس میں کالج جایا کرتے تھے۔ کلاس روم میں ان کے ڈیسک بھی ایک ساتھ تھے اور ان دنوں بھی وہ کم و بیش ہر سٹوڈنٹ شہر سے باہر چھیل کے کنارے تیراکی کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس دوران ہنری نے این کو پروپوز کیا۔ این کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جرات کر سکتا ہے۔ دراصل ہنری نہایت سنجیدہ طبیعت کا بڑا قسم کا انسان تھا۔ اس کی نسبت فریک کچھ خوش اخلاق اور فنس کھدا تھا لیکن بڑھالی میں دلچسپی رکھنے کی وجہ سے این اس کی عزت کرتی تھی۔ تاہم فریک کی بہ نسبت ہنری وجہہ و کلک تھا اس لیے کچھ دن سوچ و بچار کرنے کے بعد این نے ہاں کر دی۔

ان دونوں کی منگنی بہت دھوم دھام سے ہوئی اور اس دوران فریک نے انہیں بتایا کہ وہ جلد ہی اپنی ایچ ڈی کرنے کے لیے بیرون ملک جانے والا ہے اور یہ کہ ان کی ملاقات شاید چند سالوں تک نہ ہو سکے۔ ہنری اور این کی شادی ہوگئی اور پھر مصروفیات اتنی بڑھیں کہ خط کتابت کا موقع بھی نہیں ملا لیکن جب فریک واپس آیا تو حسب معمولات واپس ڈگر پر آگئے۔ چھیل میں تیراکی اور چھیلیوں کا شکار دوبارہ شروع ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہنری نے چھیل کے کنارے دو کمروں پر مشتمل کالج خرید لیا تھا جہاں وہ تینوں رات گزارتے تھے۔

اس رات ہنری کے جانے کے بعد فریک نے پڑجس لہجے میں پوچھا۔ ”کیا تم شادی کے بعد اس کے ساتھ خوش ہو؟“

”ہاں۔“ این نے بتایا۔ ”وہ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ کوشی میں لوکر چاکر کام کرتے ہیں اور ہم سال میں ایک دفعہ مینینے بھر کے لیے گھومنے پھرنے بیرون ملک بھی جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے اور کیا چاہیے۔“

”لیکن دونوں کے حال کون جانتا ہے۔ یہ تو ایسا راز ہے جس کے متعلق مرنے کے بعد بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔“ فریک بولا۔ اس کی بات درمیان میں رہ گئی اور ہنری کافی کے تین... لگ لیے واپس آگیا۔ دراصل تھرماس میں گرم پانی این رکھ آئی تھی۔ ہنری کو صرف دودھ اور کافی کو کس کرنا تھا اس لیے توقع سے پہلے آگیا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نقش کر رہی تھی اور وہ اپنی آسودہ زندگی سے مطمئن تھا۔

اس نے کپ دونوں کو پکڑائے اور ان کے قریب بیٹھے ہوئے بولا۔ ”مجھے پورا یقین ہے کہ این میری برائیاں کر رہی ہوگی۔ اسے مجھ سے بہت سے گلے شکوے ہیں اور شاید کچھ مجھے بھی ہیں لیکن میں تمہیں بتا کر پور نہیں کرنا چاہتا اس لیے خاموشی کے ساتھ کافی پیتے ہیں۔“

”گلے شکوے کی بات علیحدہ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ تمہارے ساتھ خوش نہیں ہے اور جب بھی اسے موقع ملا یہ تم سے طلاق لے لے گی۔“ فریک سرد لہجے میں بولا۔

ہنری کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ ”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ دیکھو، تمہارا مذاق ہم دونوں کی ازدواجی زندگیوں کو متاثر کر سکتا ہے۔“ این بے اختیار چلا اٹھی۔

”مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دراصل این کا رویہ ہمیشہ میرے ساتھ نامناسب رہا ہے۔ میں نے کئی دفعہ اسے کریدنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اس نے ہمیشہ مجھ سے سب کچھ چھپا کر رکھا۔“ ہنری سرد آہ بھرتے ہوئے فریک سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”دونوں کے عہد جاننے کے لیے ہی تو میں نے بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کی ہے۔ میں پہنچاؤم کے علم میں مہارت رکھتا ہوں اور وہ سب کچھ جان سکتا ہوں جو تم دونوں ایک دوسرے سے چھپا رہے ہو۔“ فریک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے شادی سے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا کہ وہ

جو میں دلچسپی رکھتا ہے اور جب جولیانا نے اسے ٹھوک دیا، تب مجبوراً اس نے مجھ سے شادی کر لی۔“ این افسردہ لہجے میں بولی۔

”تو پھر یہ طے ہے کہ آج کی رات ہم دونوں کے عہد جاننے کی کوشش کریں گے۔ میں اپنے علم کو استعمال کرتے ہوئے تم دونوں کو بتاؤں گا کہ تم کیا چاہتے ہو اور مجبوری کی حالت میں تم سے کیا ہو گیا۔“ فریک دونوں سے مخاطب ہوا۔

”نہیں، اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے سے بدظن ہو جائیں گے۔ شاید ہمارے درمیان علیحدگی ہو جائے اور میں این کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔“ ہنری نے انکار میں سر ہلایا۔

”مجھے معلوم ہے کہ اس آگاہی کے کتنے ساڈا انکیٹ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ تم دونوں کو وہ سب نہیں بتاؤں گا جو تمہاری زندگیوں پر اثر انداز ہو سکے۔ تاہم وہ کچھ بتا دوں گا جس سے تمہارے تعلقات خوشگوار ہو جائیں اور اس کا طریقہ کاریوں سے کہ تم دونوں کالج کے بیڈ روم میں کبیرا لگا دو۔ میں تمہیں وقتاً فوقتاً وہاں لے جاؤں گا اور معلومات کے بعد جس بات کو سن کر ناگوار ہوں گا، وہ کر دوں گا۔ یہ یقیناً وہ باتیں ہوں گی جس کا اثر تم دونوں کی ازدواجی زندگیوں پر پڑ سکتا ہے۔“ فریک نے کہا۔

”اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے ان وجوہات سے پردہ کشائی کرنا ہے جس کی بدولت میری ازدواجی زندگی متاثر ہو رہی ہے۔ اگر تم انہیں ہی سن کر دو گے تو ہم بھلا دوا کیسے کریں گے؟“ ہنری نے انکار میں سر ہلایا۔

”تو ٹھیک ہے، میں ایسا ہی کروں گا۔ لیکن اس کے باوجود بھی میں تم دونوں کو علیحدہ علیحدہ صرف پندرہ منٹ کے لیے کمرے میں لے جاؤں گا۔ چونکہ وہاں کبیرا نصب ہوگا اس لیے میں تمام کارروائی تم دونوں کو ویڈیو کے ذریعے دکھا دوں گا۔“ فریک سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”لیکن تم یہ سب ہمارے سامنے کیوں نہیں کرتے؟“ کمرے میں لے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہم یہاں بیوی ہیں، کوئی غیر نہیں ہیں۔“ این متوش لہجے میں مخاطب ہوئی۔

”ہمنا تاز کے دوران شعور کو سلا کر لاشعور کو جگایا جاتا ہے اس لیے عمل کے دوران کمرے میں خاموشی طاری ہونا ضروری ہے اور مجھے معلوم ہے کہ جب واقعات منظر عام پر آنے لگیں گے تو تم دونوں جذباتی ہو کر ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرو گے اور لاشعور کے جاگنے کے دوران معمول کو کسی بھی قسم کا جھٹکا لگا تو وہ پاگل بھی ہو سکتا ہے اور میں یہ رسک نہیں لے سکتا اس لیے کمرے میں تم

دونوں کو ایک ایک کمرے کر کے جانا ہوگا۔“ فریک نے بتایا۔

دونوں میاں بیوی نے اثبات میں سر ہلایا اور اللہ کر کین کی طرف آگئے۔ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ مووی کبیرا لے کر آتے تھے۔ انہوں نے وہ کبیرا بیڈ روم میں نصب کر دیا اور سامنے موجود سنک روم میں آکر بیٹھ گئے۔

”جس دوران معمولی کے شعور کو سلا کر میں لاشعور کے ذریعے معاملات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں گا اس دوران تم دونوں میں سے جو بھی سنک روم میں بیٹھا ہو، وہ خاموشی کے ساتھ بیٹھے۔ کسی قسم کا شور بھی حالات کو خراب کر سکتا ہے اور بے جا مداخلت نہ صرف معمول کی زندگی پر اثر انداز ہو سکتی ہے بلکہ دوسرا سا بھی کسی اس سے متاثر ہو سکتا ہے۔“ فریک نے دونوں کو بتایا۔

ان دونوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”اب یہ طے کر لو کہ تم میں سے پہلے کمرے میں کون جائے گا؟“ فریک دوبارہ، ہمکام ہوا۔

ہنری نے این کی جانب دیکھا پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”یقیناً یہ پہلے جائے گی اور میں بعد میں۔ تاہم اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کمرے میں بننے والی مووی کو ہم تینوں اکٹھے ہی بیٹھ کر دیکھیں گے۔“

”تو پھر کبیرا نصب کر دو۔“ فریک نے کہا۔ ”سب کچھ تم دونوں کی رضامندی سے ہوگا۔ میں صرف دل میں موجود غبار کو باہر نکالنے میں تم دونوں کی مدد کروں گا۔“

ہنری نے اثبات میں سر ہلایا اور کالج کے بیڈ روم میں چلا گیا۔

☆☆☆

کبیرا نصب ہو جانے کے بعد فریک نے ٹائٹ بلب آن کرنے کے بعد باقی تمام لائسنس بند کر دیں۔ کمرے میں ٹیلے رنگ کی روشنی بجھل گئی۔ اسے معلوم تھا کہ مووی میں وہ دونوں ہولوں کی صورت میں دکھائی دیں گے لیکن شکل و صورت واضح ہونا ان کے مقصد کے لیے ضروری نہیں تھا۔ البتہ آواز صاف سنائی دینی چاہیے تھی۔ اس کے لیے اسپیکر میز کے اوپر رکھ دیے گئے۔ وہاں دو کرسیاں موجود تھیں جس میں سے ایک پر این نے بیٹھنا تھا، دوسرے پر فریک نے بیٹھتے ہوئے سفید رنگ کا پنڈولیم میز پر رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد این کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات تھے۔

”پریشان کیوں ہو؟ کہیں تمہارے دل میں چورتو نہیں اور تم ہنری سے بے وفائی کی مرعب تو نہیں ہو رہی

ہو؟“ فریک نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

ان نے انکار میں سر ہلایا اور دروازہ بند کر کے آہستہ قدموں کے ساتھ چلتی ہوئی فریک کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر آ بیٹھی پھر دم بجے میں بولی۔ ”میں نے بھی اس سے بے وفائی نہیں کی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی سیکرٹری جولا ہو یا پھر کوئی آفس ورکر ہو۔ وہ دل چپیک انسان ہے۔ اس کے سوا بل میں متعدد لڑکیوں کے نمبر موجود ہیں۔ میں انہیں کال کر کے چیک کر چکی ہوں۔“

”ہوں۔“ فریک نے ہنکارا بھرا پھر پنڈولم اٹھا تے ہوئے بولا۔ ”کچھ ہی دیر میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونے والا ہے۔ ڈھکا چھپا سب کچھ سامنے آ جائے گا لیکن اس کے لیے تمہیں کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تم بے وفائی نہیں ہو اس لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اپنے دماغ کو میرے حوالے کر دو۔“

”وہ کیسے؟“ این نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔
”اپنے دماغ میں سے تمام سوچوں کو نکال دو اور منفی خیالات کو ترک کر دو جیسے کہ تمہارے ازدواجی مسائل ہیں۔ میں جو بھی کہوں، اس پر بے چون و چرا عمل کرنے کا تہیہ کر لو۔ یوں جھو کہ اب تم میرے تابع ہو۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور فریک نے پنڈولم کو اس کے چہرے کے سامنے ہلانا شروع کر دیا۔ وہ سیاہ رنگ کی رسی سے بندھا ہوا تھا۔ کمرے میں ملگیا اندھیرا طاری تھا اس لیے رسی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سفید رنگ کا پنڈولم ہوا میں لہرا رہا ہو۔ این نے نگاہیں پنڈولم پر مرکوز کر دیں۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے پنڈولم کے ساتھ حرکت کرنے لگے۔

فریک سرگوشی بھرے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔ ”تم اس عمل کے لیے تیار ہو؟“

این نے کوئی جواب نہیں دیا۔
”اب میں تمہیں علم دیتا ہوں کہ اپنے شعور کو سلا کر لاشعور کو میرے حوالے کر دو۔ کیا تم ایسا کر سکتی ہو؟“ فریک دوبارہ بولا۔

”ہاں۔“ این نے جواب دیا۔ اس کی آواز اتنی مدھم تھی جیسے خواب میں بات کر رہی ہو۔

فریک نے مطمئن انداز میں پنڈولم کو ایک جانب رکھ دیا اور پھر دوبارہ مخاطب ہوا۔ ”اب میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دو اور میں جو بھی سوال پوچھوں گا، اس کا مختصر

جواب دینا۔“

اس کے بعد اس نے جو بھی سوال پوچھے اور ان کے جو بھی جواب ملے، ان سب کو کمرے کے ریکارڈ کر لیا۔ اس تمام عمل میں یہ مشکل دس سے پندرہ منٹ لگے۔ جب سوالات مکمل ہو گئے تب فریک نے اس کے لاشعور کو سلانے کے بعد شعور کو چگا دیا۔ این کی آنکھیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گہری نیند سے جاگی ہو۔ اسے کچھ بھی علم نہیں تھا کہ اس سے کیا پوچھا گیا اور اس نے کیا بتایا۔ فریک نے اسے باہر جانے کے لیے کہا اور خود اٹھ کر کمرے کو چپک کر گئے لگا۔ وہ صحیح کام کر رہا تھا۔ اب اس کے پاس کمرے کے علاوہ اور کوئی شے نہیں تھا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر ہنری اندر داخل ہوا اور خاموشی کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔

فریک کچھ دیر اپنی جگہ کھڑے رہنے کے بعد اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”این سے سوال جواب کے دوران بہت سی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں بتا کر تم دونوں کی زندگیوں میں زہر گھول دوں لیکن تم دونوں کے اصرار کو مد نظر رکھتے ہوئے کڑواچ بتا رہا ہوں۔ آگے تم دونوں کی مرضی۔“

”کیا میں کمرے میں بنی ہوئی مووی کو دیکھ سکتا ہوں؟“ مجھے زیادہ کی ضرورت نہیں، بس چند سوال و جواب۔“ ہنری نے پوچھا۔

”نہیں، ابھی نہیں۔ بس کچھ دیر اور..... پھر میں سب کچھ تم دونوں کے سامنے رکھ دوں گا۔“ فریک نے انکار میں سر ہلایا۔

”دیکھو، کچھ غلط نہ ہو جائے۔ این جذباتی عورت ہے۔ وہ غصے میں آ کر کچھ بھی کر سکتی ہے۔“ ہنری پریشان کن لہجے میں بولا۔

”غلط تو ہوگا..... اور مجھے یقین ہے کہ اس کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔ میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ تم دونوں اچھی طرح سوچ لو۔ یہ سب زندگی خراب کر دینے کے مترادف ہے۔“ فریک نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ میں اس الجھن کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ کسی بیسلی سے کم نہیں۔ دلوں میں چھپے ہوئے رازوں کو افشا کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے ورنہ وہ ناسور بن کر زندگیوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔“ ہنری نے جواب دیا۔

”لیکن افشا ہونے کے بعد بھی یہ زندگیوں کو متاثر کریں گے۔ تم انہیں اگل دینے کے بعد بھی سکون نہیں

پاسکے۔“ فریک مسکرایا۔

”لیکن اس صورت میں ہمارا وقت اور جوانی برباد نہیں ہوگی۔ ہم راستے تبدیل کرنے کے بعد نئے سانچے کا انتخاب کر سکتے ہیں۔“ ہنری بولا۔

فریک نے اثبات میں سر ہلا تے ہوئے میز پر رکھے پنڈولم کو اٹھالیا پھر نرم لہجے میں بولا۔

”تو پھر تیار ہو جاؤ۔ میں تمہارے شعور کو سلا کر لاشعور سے وہ باتیں اگلوں گا جو تم عام حالات میں بیان کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے اور جن کی وجہ سے شاید تمہارا ضمیر تمہیں ملامت بھی کرتا ہوگا۔“

”میں نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کے لیے مجھے اپنے ضمیر کی ملامت کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ تم سوال پوچھو۔“ ہنری بولا۔

”تو پھر اپنے شعور کو سلانے کے بعد لاشعور کو میرے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور آمادگی ظاہر کرنے سے پہلے اپنے دماغ میں سے تمام منفی سوچوں کو باہر نکال دو۔ جیسے این نے نکالا تھا۔“ فریک نے کہا۔

ہنری نے اثبات میں سر ہلایا اور فریک نے پنڈولم کو اس کے چہرے کے سامنے لہرانا شروع کر دیا۔
”کیا تمہارا شعور سو گیا ہے؟“

ہنری نے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا۔
”تو اب آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دو اور جو سوال میں پوچھوں، اس کا مختصر جواب دو۔“

اس کے بعد فریک نے چند سوالات پوچھے جن کے جوابات کمرے میں ریکارڈ ہو گئے۔ فریک نے اس کے لاشعور کو سلانے کے بعد شعور کو چگا دیا اور اسے باہر جانے کے لیے کہا۔ وہ اٹھ کر چلا گیا۔ فریک نے کیمرا چیک کیا۔ ریکارڈنگ بخوبی ہوئی تھی۔ وہ اسے لے کر بنگ روم میں آ گیا جہاں وہ دونوں اس کے منتظر تھے۔

”میرے خیال میں پہلے کچھ شراب نوشی ہو جائے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آئندہ ملاقات نہیں ہوگی۔ اب بھی وقت ہے۔ ان سوالات اور ان کے جوابات کو رد کر کے اپنی زندگیوں کی جانب لوٹ جاؤ۔ ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا۔ غلطیاں سب سے ہو جاتی ہیں۔ انہیں رد کرنا سیکھو۔“ فریک نے مووی کیمرا ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن غلطیاں اگر بار بار ہونے لگیں تو مذاق بن کر رہ جاتی ہیں۔ ان کا رد ضروری ہے اور پھر ایک وقت ایسا آ جاتا ہے جب غلطیوں کو رد کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

فارمولا

مشہور ریاضی دان البرٹ آئن اسٹائن جب کسی کالج یا یونیورسٹی میں لیکچر دیتے جاتے تو ان کا ڈرائیور ہال کے آخر میں بیٹھا لیکچر سنا رہتا۔ ایک مرتبہ کسی یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے لیے روانہ ہوتے وقت گاڑی میں بیٹھے تو ڈرائیور نے کہا۔ ”جناب عالی! میں آپ کے لیکچر سن کر کھگ آ گیا ہوں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے آپ کے تمام لیکچر زبانی یاد ہو گئے ہیں۔“ یہ سن کر آئن اسٹائن نے کہا۔ ”ایسا کرو کہ آج جس یونیورسٹی میں میرا لیکچر ہے، وہ لوگ مجھے نہیں جانتے۔ اس لیے میں ڈرائیور بن کر گاڑی چلاتا ہوں اور تم میری جگہ لیکچر دو گے۔“ تھوڑی بحث کے بعد ڈرائیور مان گیا اور یوں ڈرائیور آئن اسٹائن اور آئن اسٹائن ڈرائیور بن بیٹھا۔ ڈرائیور نے یونیورسٹی میں بہت ہی عمدہ طریقے سے لیکچر دیا۔ جب لیکچر ختم ہوا تو ایک شخص کھڑے ہو کر بولا۔

”سرا! آپ نے اپنے لیکچر میں ریاضی کا جو فلاں فارمولا بتایا ہے، وہ مجھے سچ طریقے سے سمجھ نہیں آیا لہذا ذرا وضاحت فرمادیں۔“

یہ سن کر کئی آئن اسٹائن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ فارمولا تو اتنا آسان ہے کہ میرا ڈرائیور بھی آپ کو سمجھا سکتا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے ڈرائیور (اصلی آئن اسٹائن) کو آواز دے کر کہا۔ ”ڈرائیور! ذرا ان صاحب کو ان کا مطلوبہ فارمولا سمجھا دو۔“

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاکپتن شریف

رسم دنیا

آنگن میں جب تک درخت پھل دیتا ہے ماکن باقاعدگی سے پانی دیتی رہی لیکن گزشتہ سال سے وہ سوکھتی جا رہا تھا اور سایہ بھی بس برائے نام رہ گیا تھا۔ ماکن بیرون ملک سے لوٹی تو ہنستے بھستے اس نے حکم صادر کر دیا۔ ”کسی کو بلوا کر یہ درخت کٹوا دینا، بہت جگہ گھبرا ہے۔“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، نعل ہزارہ

ہنری سر دلچسپی میں بولا۔

این شراب کی بوتل اور گلاس لے آئی۔ فرینک نے مووی کمرے میں سے کیسٹ نکالی اور وی سی آر میں ڈال دی پھر تینوں خاموشی کے ساتھ شراب نوشی میں مشغول ہو گئے۔

☆☆☆

رات کے تقریباً تین بجنے والے تھے۔ ماحول پر گہمیر خاموشی طاری تھی اور کمرے میں وہ تینوں اپنی سوچوں میں گم تھے۔ وہ امتحان دے چکے تھے اور اب انہیں نتیجے کا انتظار تھا۔ ہنری اور این کے چہروں پر سنجیدگی بھرتے تاثرات تھے اور فرینک اس سب کے دھڑکنے پر پشیمان دکھائی دے رہا تھا۔ شراب نوشی نے ان کے حواس مضطرب کر دیے تھے لیکن حالات انہیں بیدار رہنے پر مجبور کر رہے تھے۔

”اب انتظار کس بات کا ہے۔ وی سی آر کو آن کر دو تاکہ پتا چل سکے کہ ازدواجی زندگی میں سنجیدہ کون تھا اور تباہ کرنے پر کون تیار تھا؟“ این دیکھتے ہی دیکھتے بولی۔

”میرے خیال میں یہ سب جھوٹ نہیں ہوگا۔ شعور کے سوجانے کے بعد سچائی سے انحراف کرنا ممکن نہیں۔ میں سچائی کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم وی سی آر کو آن کر دو۔“ ہنری مسکرایا۔

فرینک اٹھ کر شیشی کی میز پر رکھے ہوئے وی سی آر کی طرف آگیا۔ اس کے بالکل سامنے دیوار پر ایل سی ڈی لگا ہوا تھا۔ اس نے اسے آن کر دیا اور وی سی آر کا من دبا دیا۔ وہ سب کچھ جانتا تھا۔ سوال جواب اس کے سامنے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود بھی وہ صوفے پر ان دونوں کے ہمراہ بیٹھ گیا۔

ایل سی ڈی پر بیڈروم کا دھندلا منظر ابھرا۔ این کرسی پر اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ ہنری نے میز پر رکھا ہوا ریسیوٹ کسٹرنول اٹھایا اور ایل سی ڈی کی آواز کو تیز کر دیا۔ این کی آنکھیں فرینک کی آنکھوں میں جیسے ڈوبی ہوئی تھیں تاہم ان میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کبھی ہوئی آنکھوں کے ساتھ سو رہی ہو۔ پھر فرینک کی آواز گونجی۔

”میں تم سے پہلا سوال پوچھتا ہوں۔ تمہارے اور ہنری کے ازدواجی تعلقات کیسے ہیں؟ کیا وہ تمہارا خیال رکھتا ہے یا پھر تمہیں نظر انداز کرتا ہے؟“

”وہ مجھے نظر انداز کرتا ہے اور آفس کی مصروفیات میں گم رہتا ہے۔“ این نے جواب دیا۔

”کیا تم اس کے ساتھ خوش اور مطمئن ہو؟“ فرینک

نے دوسرا سوال پوچھا۔

”نہیں۔“ این نے جواب دیا تو ہنری کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ اسے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ فرینک کی آنکھیں عمل کے دوران این کی آنکھوں پر مرکوز تھیں۔ ”وجہ بیان کرو۔ کیا وہ تم سے بے وفائی کا مرتکب ہے یا پھر تمہیں مارتا پھینتا ہے؟“ وہ نرم لہجے میں بولا۔

”اس کے اپنی سیکریٹری کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں تاہم وہ مجھے مارتا پھینتا نہیں ہے۔“ این نے بتایا۔

فرینک کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا لیکن اس دوران بھی اس کی نگاہیں این کے چہرے سے نہیں ہٹیں۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے ہنری کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے اس نے بغیر پانی کے کڑوی گولی نگل لی ہو۔

”ان دونوں کے تعلقات کے متعلق تمہیں کسے معلوم ہوا؟ ظاہر ہے انہوں نے اسے پوشیدہ رکھنے کی پوری کوشش کی ہوگی۔“ فرینک کی آواز دوبارہ کمرے میں گونجی۔

”مجھے اس کے متعلق ہنری کی سیکریٹری نے خود بتایا ہے اور یہ بھی بتایا کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے اور شاید اگلے ماہ وہ دونوں شادی بھی کرنے والے ہیں۔“

”تو پھر اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ کیا تم سوچتے ہو کہ برداشت کر دو گی یا پھر طلاق لے لو گی؟“

”جب سے ان دونوں کے تعلقات کے متعلق مجھے معلوم ہوا ہے، میں ہنری سے نفرت کرنے لگی ہوں۔ مجھے اس کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ میں جلد اس سے طلاق لے لوں گی۔“ این نے جواب دیا۔

”مجھے اور سوال نہیں پوچھنا۔ میں ایک دو تین کہوں گا تو تمہارا لاشعور سو جائے گا اور شعور جاگنے کے بعد کام کرنے لگے گا اور تم تمام سوالات کو بھلا دو گی۔“ فرینک نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا اور پھر اس نے ایک دو تین کہتے ہوئے پنڈولم کو میز پر رکھ دیا۔

این کی آنکھوں میں زندگی کی چمک نمودار ہونے لگی۔ فرینک نے اٹھ کر کمرے کے بند کر دیا۔ شنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہنری نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن فرینک نے چپ کر دیا۔ این سر جھکائے کند ذہن بچی کے مانند ان دونوں کے درمیان چپ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس اثنا میں ایل سی ڈی کی اسکرین جھمکے کے ساتھ دوبارہ روشن ہوئی اور اس دفعہ ہنری، فرینک کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

”جولیا کون ہے؟“ فرینک نے اس کے شعور کو

سلانے کے بعد لاشعور سے پہلا سوال پوچھا۔

”میری سیکریٹری ہے۔“ ہنری نے بتایا۔

”کیا تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو اور کیا وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے؟“

”ہاں، ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“ ہنری نے جواب دیا۔

”تو پھر یہ تعلقات کب تک چلیں گے اور کیا تم این کو طلاق دے دو گے؟“ فرینک نے پوچھا۔

”نہیں، میرا اسے طلاق دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں صرف چند دنوں کے لیے جولیا سے تعلقات استوار کرنا چاہتا تھا جو کچھ لمبے ہو گئے۔“

”کیا تمہارے دل میں این کے لیے وہی جذبات اب بھی موجود ہیں جو شادی سے پہلے تھے؟“ فرینک نے اگلا سوال پوچھا۔

”نہیں، وہ وقت کے ساتھ ساتھ میرے دل دو مارغ سے اترتی چلی جا رہی ہے تاہم میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا کیونکہ مجھے اس کی عادت ہو گئی ہے۔“

”کیا اس عادت کا اطلاق جولیا پر نہیں ہوتا یا پھر وہ ہوس کے چند لمحات پر مشتمل جلد ختم ہو جانے والی کہانی کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی؟ ہو سکتا ہے کہ کل کو تمہیں اس کی عادت ہو جائے۔“ فرینک نے پوچھا۔

”میں نے جولیا کے وجود میں این کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن بڑی طرح ناکام ہوا۔ اس لیے میں نے اسے چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ تاہم این کے متعلق میں نے کچھ نہیں سوچا۔“ ہنری کی آواز سناٹی دی۔

”لیکن جولیا تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس بچے کا کیا ہوگا جو دنیا میں آنے سے پہلے ہی باپ کے سامنے سے محروم ہونے والا ہے؟“ فرینک غصیلے لہجے میں بولا۔

”وہ چند لمحوں کی غلطی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ میرے خیال میں جولیا اسے سنبھال لے گی۔ اگر اس نے مطالبہ کیا تو میں اسے ہر مہینے کچھ رقم بھجوا دیا کروں گا۔“ ہنری بولا۔

”تو تم این کے متعلق سنجیدہ ہو اور اسے چھوڑنا نہیں چاہتے؟“ فرینک نے آخری سوال پوچھا۔

”میں پہلے بتا چکا ہوں..... نہیں، لیکن چند دن پہلے بڑی ملاقات ماریہ سے ہوئی اور میں اس کے وجود میں این کو تلاش کرنے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ میں جلد اس سے شادی کروں لیکن حتی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

فرینک نے ایک دو تین کہہ کر اس کے لاشعور کو سلانے کے بعد شعور کو جگا دیا اور اس کے ساتھ ہی کمرہ آف ہو گیا۔

کمرے میں گہمیر خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ تینوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ ہنری اور این کو اپنی ازدواجی زندگی خطرے میں دکھائی دے رہی تھی جبکہ فرینک اپنے مستقبل کے لیے پریشان تھا۔ پھر این نے اچانک ہی جھپکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ ہنری تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے قدموں میں بیٹھنے دے دئے بولا۔

”میرے لاشعور نے جو بھی کہا، وہ جھوٹ نہیں تھا۔ یقین جانو مجھے تمہاری عادت، پڑ چکی ہے اور میں تمہیں کبھی بھی چھوڑ نہیں سکتا۔“ اس نے یکدم این کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس نے جھٹکے کے ساتھ ہاتھ چڑھائیے پھر پھرے ہوئے بچہ میں بولی۔

”بے شک تم نے سچ کہا لیکن تم نے اس بات کا بھی اقرار کیا کہ میں تمہارے دل دو مارغ سے اتر چکی ہوں جس کی تو جولیا اور ماریہ کے وجود میں مجھے تلاش کر رہے ہو اور جب تم نے تلاش کر لیا تو مجھے طلاق دے دو گے۔ میں تمہارے ساتھ اب ایک لمبی جی نہیں رہنا چاہتی۔“ وہ اٹھ کر بھاگتے ہوئے بیڈ روم میں گھس گئی اور اس نے جھٹکے کے ساتھ کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

ہنری بت بٹا جہاں بیٹھا تھا، وہیں بیٹھا رہا۔ فرینک نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دیا۔ تب وہ آفسر کی بھرے لہجے میں بولا۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں نے ایسے جواب کیوں دیے جو اب بھی میرے دماغ میں موجود نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ اب مجھے قبول نہیں کرے گی۔ اگر ہو سکے تو اسے منانے میں میری مدد کرنا۔“

فرینک نے اثبات میں سر ہلایا اور بوتل میں بچی ہوئی شراب کو گلاس میں ڈال کر اس کے ہاتھوں میں تھام دیا جسے اس نے ایک ہی سانس میں قلع کے اندر اغڑ لیا اور جھٹکے ہوئے انداز میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

☆☆☆

اگلے دن فرینک نے این کو منانے کی لاکھ کوشش کی لیکن وہ نہیں مانی۔ اس کا کہنا تھا کہ دل سے اتر جانے والی بات نے اس کے دل کو چپوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ سب کچھ براہ راست کر سکتی ہے لیکن اپنی ذات کی تذلیل برداشت نہیں کر سکتی۔ ہنری نے بھی منت حاجت کی

انطاکیہ کے شمال میں جنوبی ترکی میں داخل ہوں تو وہاں مصیبت نامی شہر کے آس پاس کے تیسری چوتھی صدی (نویں دسویں صدی عیسوی) میں نہایت آباد اور پررونق شہر تھا۔ اس ساحلی شہر میں تینتالیس قصبے نے شیخ ابوالخیر اشج کی وجہ سے بڑی شہرت

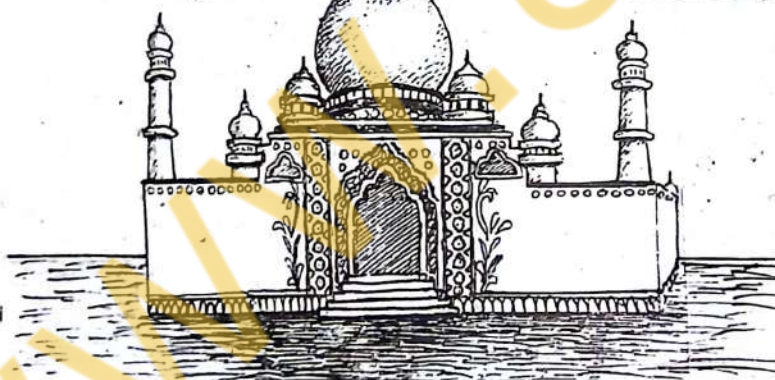
شیخ ابوالخیر اقطعؒ

ضیائے نسیم بکراہی

ایک سیاہ فام صوفی کی سوانح جس کا باطن شفاف تھا۔ اعمال ایسے کہ دوسروں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ آپ پر جو بھی مصیبت نازل ہوتی، آپ اس کا شکوہ نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ ان اسباب اور وجوہ کو تلاش کر لیا کرتے تھے جن کی وجہ سے انہیں وہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ طبیعت اور مزاج میں بلندی اور جرات اتنی تھی کہ بڑے سے بڑا صوفی بھی اپنی کرامات سے آپ کو مرعوب نہیں کر سکتا تھا۔ درندے آپ کے تابع تھے۔ آپ کا قول تھا کہ ”جو شخص اپنا عمل ظاہر کرے، وہ ریاکار ہے اور جو کوئی اپنا حال ظاہر کرے وہ دعوے دار ہے۔“ آپ کی پوری زندگی اس قول کا عکس تھی۔

صاف دل، حق گو اور حد درجہ حلیم الطبع انسان کے پاکیزہ

حالات اور واقعات



کلائٹ کو چھوڑنے کے لیے انرپورٹ آیا تھا۔ فریٹک نے اسے الوداع کہا اور تیز قدموں کے ساتھ چلتا ہوا لوگوں کے ہجوم میں داخل ہو گیا۔ پچھ آگے جانے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہنری انرپورٹ کے خارجی دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ فریٹک نے مسکراتے ہوئے اپنے آگے جانے والی لڑکی کے ہاتھ کو تھاما اور ڈیڑ پارچہ لاونچ سے ہوتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ لڑکی کے چہرے پر اسکا خوف بندھا ہوا تھا۔ اس نے اسکارف اتار دیا اور فریٹک سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

”اس سے چپانے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ آج نہیں توکل اسے سب کچھ معلوم ہو جائے گا پھر تم کیا کرو گے؟“

”مجھے اب کچھ نہیں کرنا۔“ فریٹک نے بتایا۔

”فلورینڈ اجانے کا بہانہ جوٹ پر مبنی ہے۔ میں دونوں کے بعد یو یارک چلا جاؤں گا۔ تم میرے ہمراہ ہوگی۔ اس کے بعد ہماری ملاقات بھی بھی ہنری سے نہیں ہوگی۔ اگر اس نے ہمیں تلاش کرنے کی کوشش کی تب بھی کام ہوگا۔“

”کیا ایسا ممکن ہے؟“ این نے پوچھا۔

”ہاں، کیوں نہیں۔ اس کا ثبوت تمہارے سامنے ہے۔ جولیا کے متعلق میں نے اس کے شعور میں غلط فہمی پیدا کی۔ وہ صرف اس کی سیکرٹری ہے اور ان کے درمیان ناجائز تعلقات نہیں ہیں۔ ماریہ کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہنری ایک اچھا اور وفادار شوہر تھا۔ جنہیں حاصل کرنے کے لیے مجھے مجبوراً یہ سب کرنا پڑا۔“

”لیکن تم نے اس کے لاشعور میں جولیا اور ماریہ کی جھوٹی کہانی کب ڈالی؟“ این نے پوچھا۔

”جب تمہارے دماغ میں اپنی محبت کی سچائی ڈالی۔ اس کے لیے مجھے زیادہ تر درد نہیں کرنا پڑا۔ تم دونوں سے سوال جواب کرنے سے قبل میں نے کیمرے کو آف کر دیا اور لاشعور میں حسب مشاہدہ سب کچھ ڈال دیا جن کو تم دونوں نے بعد میں بیان کرنا تھا۔ تب کیمرہ آف ہونے کے بعد وہ حالات منظر عام پر آئے جو میں چاہتا تھا۔ بس اب تم سب کچھ بھلا دو اور ایک اچھی بیوی کی طرح اپنے شوہر کی فرمانبرداری شروع کر دو۔ یقیناً جانو جنہیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ ہنری سے زیادہ بہتر شوہر جنہیں میری صورت میں مل گیا ہے۔“

این نے اپنا سر فریٹک کے کاندھے پر رکھ دیا اور دونوں جہاز پر سوار ہو گئے۔

لیکن این اپنی ضد پراڑی روی اور پھر بارہ بجے کے قریب وہ تینوں ہنری کی گاڑی میں بیٹھ کر شہر آ گئے۔

فریٹک کو امید تھی کہ این کچھ دنوں کے بعد ضد ختم کر کے ازدواجی زندگی کی طرف واپس آ جائے گی لیکن اگلے ہفتے اسے معلوم ہوا کہ وہ دونوں علیحدہ ہو گئے ہیں۔ چونکہ ان دنوں مصروفیت بہت زیادہ تھی اس لیے فریٹک ان سے ملنے کے لیے نہ جاسکا اور اس سے اگلے ہفتے فریٹک کی ملاقات ہنری سے انرپورٹ پر ہوئی۔

”مجھے معلوم تھا کہ دنوں کے بعد منظر عام پر آنے کے بعد یہ سب کچھ ہوگا اس لیے میں اس کے حق میں نہیں تھا لیکن تم دونوں کے اصرار کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یہ سب کچھ کرنا پڑا۔“ فریٹک نے تاسف کا اظہار کرنے کے بعد کہا۔

ہنری نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تم نے شادی کی یا ابھی تک اکیلے ہو؟“ فریٹک نے پوچھا۔

”ابھی نہیں۔ میں دماغی طور پر بہت اب سیٹ ہوں۔ مجھے مطمئن ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ تم اپنی بتاؤ۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے شادی کر لی ہے؟“

فریٹک نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں، اگر موقع ملا تو تمہیں اس سے ملواؤں گا۔ فی الحال فلورینڈ اخبار ہوں۔ مجھے وہاں کلینک کھولنے کی اجازت مل گئی ہے۔ اگر بھی پکر لگے تو ضرور آتا۔“

”تم نے شادی کر لی لیکن مجھے نہیں بتایا اور اب فلورینڈ اس میں کلینک کھول رہے ہو، اس کے متعلق بھی مجھے سے چپانے رکھا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ مجھے دال میں کچھ کالا دکھائی دے رہا ہے۔“ ہنری نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

فریٹک قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں بھلا تم سے کیوں چپاؤں گا۔ دراصل سب کچھ اتنی جگت کے عالم میں ہوا کہ سوچنے کی بجائے کام شروع ہی نہیں ملا۔ جس سے شادی ہوئی، وہ میرے پاس علاج کر رہی تھی۔ دوران علاج محبت ہوئی۔ ابھی بات آگے چلتے ہی نہیں پائی تھی کہ مجھے فلورینڈ میں کلینک کھولنے کی اجازت مل گئی اور مجھے وہاں جانے کی تیاری کرنا پڑی۔ تم خود سوچ سکتے ہو، دوسرے شہر میں کلینک کھولنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے میں تمہیں بتا نہیں سکا لیکن میرا وعدہ ہے کہ جلد تمہیں فلورینڈ آنے کی دعوت دوں گا۔ ابھی تک کے لیے صرف اتنا کہوں گا کہ جولیا سے شادی کرو، تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔“

کلائٹ کی روائی کا اعلان ہونے لگا۔ ہنری اپنے

حاصل کی۔ یہاں فام ہونے کی وجہ سے ان کو لوگ جھٹکتے تھے۔ اپنے وطن میں رہ کر دینی علوم حاصل کیے اور روحانی ریاضتوں اور عبادتوں میں مشغول ہو گئے۔ ان کی زندگی بڑی سیدھی سادگی تھی۔ زینیل بیٹے تھے اور تیار ہونے پر بازار میں بیچ آتے تھے۔ اس سے جو رقم ملتی تھی، گھر کا خرچ چلتا تھا۔ والدین نے نام حارہ رکھا تھا لیکن لوگوں نے عقیدت اور احترام سے ابو الخیر کا نام دیا تھا۔ آپ کے پاس عقیدت مند آتے اور درخواست کرتے کہ آپ زینیل نہ بنایا کریں۔ ہمارے ساتھ چلیں اور اللہ اللہ کریں۔ آپ کا سارا خرچ ہم برداشت کریں گے۔

آپ انہیں جواب دیتے۔ ”یہ میں کس طرح کو آرا کر دوں گا کہ میرے ارادت مند محنت اور مشقت کریں اور میں ان کی کمائی پر آرام کر دوں۔ یہ بات نہ تو خدا کو پسند ہے اور نہ اس کے آخری نبی محمد ﷺ کو پسند تھی۔ اللہ نے ہاتھ پاؤں دیے ہیں، صحت و تندرستی دی ہے، پھر میں کی پروا جو کچھ کہوں۔“

آپ کے اس جواب نے سب کو خاموش کر دیا۔

ایک عرصے بعد آپ نے مدینہ منورہ کا قصد کیا۔ پہلے حج کیا اور چند دن مکہ معظمہ میں گزارے، اس کے بعد مدینہ کا رخ کیا۔ آپ نے مدینہ منورہ میں رسول مقبول ﷺ کے روضہ اقدس پر حاضری دی۔ یہاں حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے روضوں پر فاتحہ پڑھی۔ آپ کی آنکھیں بھرا آئیں اور دل پھٹنے لگا۔ ایک پردہ کی یہاں اس حال میں حاضر ہوا تھا کہ اس کے پاس کھانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ بھوکا آقا تھا اور بھوکا ہی ایک گوشے میں پڑ رہا۔

آپ کی آنکھ لگ گئی۔ اسی حال میں آپ نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے ہیں۔ اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ بھی تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”اے ابو الخیر! کیا بات ہے، تم بھوکے ہی پڑ رہے، کچھ کھا یا پی بھی نہیں۔“

ابو الخیر فرط غم میں روہانے ہو گئے۔ آگے بڑھ کر آپ ﷺ کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور عرض کیا۔ ”حضور! آپ ﷺ پر ہر بات عیاں ہے، اب میں کیا عرض کروں؟“

رسول مقبول ﷺ نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا۔ ”ابو الخیر بھوکا ہے، اسے کھانا کھلاؤ۔“

ابو الخیر کو ایک روٹی دی گئی اور حکم ہوا۔ ”ابو الخیر! روٹی کھاؤ۔“

ابو الخیر روٹی کھانے لگے۔ اسی عالم میں آپ کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ میں بیچی ہوئی روٹی دیکھی تو بڑی حیرت ہوئی، پورا ماحول خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ اس کے بعد ابو الخیر نے بقیہ رات عبادت اور درود میں گزار دی۔

آپ مدینے میں پانچ دن تک مقیم رہے اور روز اسی طرح حکم میر ہوتے رہے۔

آپ مدینے سے رخصت ہو کر مصر کی طرف چل دیے۔ آپ کے زہد و تقویٰ کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا۔ اس دوران آپ سے جو مصیبتیں آئیں، انہوں نے مشورہ دیا کہ مصر جانے سے پہلے بغداد ضرور جائیں۔ چنانچہ آپ بغداد آ گئے اور وہاں کے صوفیائے کرام سے ملاقاتیں کیں۔

یہاں بھی آپ کے آس پاس ارادت مند جمع ہو گئے۔ آپ دریائے دجلہ کے کنارے تشریف فرما تھے۔ آپ کے ارادت مندوں نے دیکھا کہ آپ کی نظریں سب پر جمی ہوئی ہیں۔ وہ کچھ دیکھ رہے تھے، نہایت توجہ اور انتہا تک سے۔ ارادت مندوں نے دریافت کیا۔ ”حضرت! اھر آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”کیا بتاؤں کہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ اس وقت میری نظریں ایک بدعتی پر جمی ہوئی ہیں۔“

لوگوں کو حیرت تھی کہ انہیں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک نے عرض کیا۔ ”حضرت! وہاں تو کچھ بھی نہیں۔“

آپ نے اس شخص کو کوئی جواب نہ دیا بلکہ بدستور دریا کی سطح پر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اے بدعتی انسان! کیا تو نے میری بات نہیں سنی؟ میں تجھ سے کیا پوچھ رہا ہوں؟“

دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ آپ کے عقیدت مندوں نے ایک بار پھر عرض کیا۔ ”حضرت! یہ آپ کس سے مخاطب ہیں، کچھ نہیں سمجھتا؟“

آپ نے فرمایا۔ ”لوگو! یہ وادی ایسی نہیں ہے کہ لوگ چلنے کے سیدھے سادے طریقے کو نظر انداز کر دیں اور ایک ایسا طریقہ اختیار کریں جو کسی بھی طرح مناسب نہ ہو۔“

”یعنی..... یعنی؟“ لوگ پریشان ہو گئے۔ ”آپ کس طریقے کی بات کر رہے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”پانی پر سزرنے کی بابت۔ وہ شخص اب بھی جا رہا ہے۔“ اس کے بعد آپ نے پانی کی سطح پر دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ”اے شخص! کیا تو نے میری آواز نہیں سنی؟“

دوسری طرف سے واضح جواب ملا۔ ”میں نے آپ کی آواز سن لی۔“

آپ نے فرمایا۔ ”پھر کیا بات ہے، تو پانی پر چل کے بدعت کیوں کر رہا ہے؟ خشکی پر چل، عام انسانوں کی طرح۔“ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

آپ نے ایک بار پھر اس سے پوچھا۔ ”تو کہاں جا رہا ہے؟“

دوسری طرف سے جواب ملا۔ ”مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ۔“

آپ نے نرمی سے جانے کی اجازت دے دی۔ ”جب پھر جاؤ۔ میں نہیں روکوں گا۔ ہاں اگر کہیں اور جا رہے ہوئے تو میں جہیں روک دیتا۔“

لوگوں نے پوچھا۔ ”حضرت! یہ کیا بات ہوئی۔ اگر جانے والا بدعتی تھا تو اس کو آپ نے روکا کیوں نہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”وہ دو ایسی جگہوں پر جا رہا تھا کہ اگر میں اسے روک دیتا تو ایک ناپسندیدہ فعل کا سرکب کر دیتا۔“ ایک دن ایک دوسرے بزرگ شیخ عباس بن محمد خلال راستے میں مل گئے۔ آپ نے دیکھا کہ عباس نے اپنے گلے میں ایک

مردی چھسار کیا ہے۔ آپ نے ان سے پوچھا۔ ”شیخ! آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

شیخ عباس نے جواب دیا۔ ”پہلے طرطوس جاؤں گا اس کے بعد بیت المقدس کا ارادہ ہے۔“

آپ کے ارادت مندوں نے حیرت سے پوچھا۔ ”طرطوس اور پھر بیت المقدس! کیا اتنا لبا سز پیدل ہی کر ڈالے گا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں۔ اس میں حیرت اور تعجب کی کیا بات ہے؟“

پوچھا گیا۔ ”کیوں، اس میں تعجب کی بات کیوں نہیں۔ اتنا لبا سز پیدل کیونکر کیا جاسکتا ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”شیخ نے گدڑی اسی لیے گلے میں ڈال رکھی ہے کہ جب اس میں سے اپنی گردن نکالیں گے تو طرطوس پہنچ چکے ہوں گے۔ اسی طرح جب یہ گدڑی دوبارہ گلے سے نکالی جائے گی تو یہ بیت المقدس میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ یہ اللہ والوں کے معمولی کرشمے ہیں۔“

ارادت مند خاموش ہو گئے۔ کسی نے پوچھا۔ ”حضرت! اب ایک سوال ہمیں بہت پریشان کر رہا ہے۔“

آپ نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ ”کون سا سوال؟ یعنی؟“

آپ سے پوچھا گیا۔ ”کیا آپ بھی اسی طرح سز کر سکتے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”کیا بعید ہے کہ اللہ مجھے بھی اس قوت سے سرفراز کر دے۔“

آپ بغداد سے اسکندریہ تشریف لے گئے اور یہاں سکونت اختیار کی۔ اب یہاں دور دور سے لوگ آپ کے پاس آنے لگے۔ ایک بار آپ سے ملاقات کرنے شیخ ابوالحسن قرانی تشریف لائے۔ یہ بذاتہ خود ایک نامی گرامی بزرگ تھے۔ آپ ان سے

دل کے بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ ”ابوالحسن! تم یہاں سے کہاں جاؤ گے؟“

ابوالحسن نے جواب دیا۔ ”شاہد موصول۔ اس کے بعد بغداد کا ارادہ ہے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”راستے میں لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوں گی؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”ہاں ملاقاتیں ضرور ہوں گی۔“

آپ اس کے بعد خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ابوالحسن نے اجازت چاہی۔ اس وقت آپ مسجد میں تشریف فرما تھے، اٹھے اور شایعیت کے طور پر مسجد کے دروازے تک ان کے ساتھ گئے۔ وہاں ابوالحسن کو روک لیا اور فرمایا۔ ”اے ابوالحسن! میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس زاوراہ نہیں ہے۔“

ابوالحسن کے پاس واقعی کچھ بھی نہ تھا۔ شرمندگی سے خاموش رہے۔

آپ نے انہیں دوسیب دیے اور فرمایا۔ ”یہ دوسیب رکھ لو، کام آئیں گے۔ تمہارے بھی اور کسی کے بھی۔“

ابوالحسن نے دونوں سب اپنی زینیل میں ڈال لیے اور اسکندریہ سے روانہ ہو گئے۔ دن بعد ان پر ایک ایسا دھچکا آ گیا کہ کھانے کے لیے کہیں سے کچھ میسر نہ آیا۔ مجبوراً ایک سب زینیل سے نکالا اور کھالیا۔ دل میں سوچا کہ ابو الخیر نے دوسیب دیے اور فرمایا کہ یہ زاوراہ ہیں اور یہ تمہارے بھی کام آئیں گے اور کسی اور کے بھی۔ کیا یہ دوسیب ایک ہی آدمی کے لیے کافی ہو سکتے ہیں؟

انہوں نے ایک ہی سبب پر اکٹھا کیا اور دوسرا ذنبیل میں پڑا رہنے دیا۔ دن دن بعد ابو حسن کو چہرہ بھوک محسوس ہوتی اور کبھی سے بھی کھانا نصیب نہ ہوا۔ مجبوراً ذنبیل میں ہاتھ ڈالا اور بقیہ ایک سبب بھی اندر سے لٹکانا چاہا لیکن اس وقت ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہیں اندر سے ایک کے بجائے دو سبب ملے۔ وہ دونوں سبب ہاتھ میں لے کر دیکھتے رہے۔ انہیں حیرت تھی کہ یہ دوسرا سبب کہاں سے آگیا۔ جب دیر تک اس سوال کا کوئی جواب نہ ملا تو آپ نے ایک سبب تو کھالیا اور دوسرے کو ذنبیل میں ڈال لیا پھر آگے روانہ ہو گئے۔

موسل تک پہنچنے پہنچنے کئی بار یہ ہوا کہ جب بھی ذنبیل سے دوسرا سبب نکالا تو وہاں سے دوسرا سبب برآمد ہوئے۔ جب موسل میں بھی یہی واقعہ پیش آیا تو آپ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ آپ نے مجھے کیسا زور دیا ہے اور ابھی تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس سے میرے سوا اور کون سا فائدہ اٹھائے گا؟“

جب موسل میں بھی واقعہ پیش آیا تو ابوالحسن نے اپنے آپ سے کہا۔ ”ابوالحسن! شاید یہ دونوں سبب میرے رزق معلوم قرار دیے گئے ہیں۔“

موسل کی جامع مسجد میں جب یہ جگہ کی نماز ادا کر رہے تھے تو انہیں اچانک دونوں سیبوں کا خیال آگیا، سوچا۔ ”ابوالحسن! کیا انتقام کر دیا ہے کہ اب میں ٹھیک سے سوئی نہیں سکتا۔ ہر وقت ان دونوں سیبوں کا خیال جاگزیں رہتا ہے۔“ آخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان سیبوں کا رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ اب تو یہ نماز اور ایمان میں خلل ڈالنے لگے ہیں۔

چنانچہ نماز کے بعد آپ باہر نکلے اور دونوں سبب ذنبیل سے نکال کر ہاتھ میں لے لیے۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ سامنے سے ایک درویش آیا تو دکھائی دیا۔ اس درویش نے ابوالحسن سے کہا۔ ”اے ابوالحسن! تم پریشان کیوں ہو، مجھے تو بتاؤ۔ دیے میں خوب کھانے آیا ہو تمہارے پاس۔ مجھے سب کھلا ڈالو اور میری دعا لیں لو۔ کتنا آسان اور مختصر نسخہ ہے۔“

آپ نے دونوں سبب اس درویش کے حوالے کر دیے اور کہا۔ ”مجھے تیری ہی تلاش تھی کیونکہ مجھ سے سب دیتے وقت یہی کہا گیا تھا کہ یہ تیرے بھی کام آئیں گے اور کسی اور کے بھی۔“ درویش دونوں سبب لے کر چلا ہٹا۔

☆☆☆

آپ کوچہ کہنے میں کوئی باک نہ تھا۔ کسی سے مرعوب ہونا آپ جانتے ہی نہ تھے۔ کسی صوفی کے بارے میں آپ کو معلوم ہوا کہ وہ خودمانی اور خوشامی میں اتنا جھلا ہو چکا ہے کہ شب و روز اپنے مریدوں میں گھرا بیٹھا رہتا ہے۔ وہ اپنے مریدوں سے اپنی تعریفیں سن کر خوش ہوتا رہتا ہے۔ آپ نے اس کو خط کے ذریعے تمنا کی۔ ”اے شخص! تو خود کو صوفی کہتا ہے جبکہ فقیروں نے تجھ کو جال قمار دارے دیا ہے۔ تو پوچھ گچھ کا گریبا کیوں ہوا؟ سن اس کا باعث تو خود ہے۔ تو درجہ کمال تک پہنچنے بغیر ہی شیخ بن بیٹھا اور دین کی ادب آموزی میں اپنے نفس کی تادیب سے غافل ہو گیا۔“

مذکورہ شیخ کا ایک مرید آپ کے پاس آیا اور جھگڑنے لگا۔ درشت لہجے میں پوچھا۔ ”آپ نے ہمارے شیخ کو اس طرح کیوں لکھا؟“ آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے شیخ کو جو کچھ لکھا، اس کو ہوشیار اور خبردار کرنے کے لیے لکھا تھا۔ شیخ تو مجھ سے الجھا نہیں مگر تو جھگڑا کرتے آگیا۔“

مرید نے پوچھا۔ ”آپ کو میرے شیخ پر اعتراض کیا ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”یہ کہ وہ اپنے مریدوں میں گھرا بیٹھا رہتا ہے اور ان سے اپنی تعریفیں سن کر خوش ہوتا رہتا ہے۔“ مرید نے جواب دیا۔ ”میرے ہر مرشد راتوں کو جاگتے ہیں، عبادت کرتے ہیں، ذکر اذکار میں مشغول رہتے ہیں اور اس محنت ثناء اور یا مضربے پایاں کا انہیں جو صلہ ملتا ہے، وہ بھی مریدوں کی تحریف اور توصیف ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کا حق ہے جو انہیں ملنا چاہیے۔“

آپ نے جواب میں فرمایا۔ ”اے شخص! یاد رکھ، اللہ کا ذکر کرنے والے کے لیے کوئی معاوضہ نہیں ہوتا اور جب کسی کے سامنے اس کا معاوضہ آیا اور اس نے اس کو قبول بھی کر لیا تو سمجھ لو کہ وہ اپنے ذکر سے خارج کر دیا گیا۔“

مرید کو آپ کی باتیں اچھی لگنے لگیں۔ اس کی آنکھیں شوق بھری تھیں۔ اس نے انتہائی عاجزی سے عرض کیا۔ ”حضرت! کچھ اور۔ آپ کی طاقت لسانی کا جواب نہیں۔ مزہ آگیا۔ آپ کا ایک ایک لفظ دل و دماغ میں جگہ بنا تا اترتا چلا جاتا ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ جب تک خدا کے ساتھ بندے کی نیت صاف نہ ہو، قلب مصفا نہیں

ہو سکتا۔“

مرید نے پوچھا۔ ”قلب کی صفائی کا طریقہ تو آپ نے بتا دیا۔ اب براؤ کریم یہ بھی بتا دیجیے کہ جسم کی مگر مصفا ہو؟“ آپ نے جواب دیا۔ ”جب تک بندہ اہل اللہ کی خدمت نہیں کرتا۔ بندہ اہل اللہ کی خدمت کرے گا تو اس کا جسم مصفا ہو جائے گا۔“

اس کے بعد آپ نے مرید سے فرمایا۔ ”اے شخص! میں جو کچھ کہتا ہوں، اس کو فور سے سن۔ قلب کے دو مقام ہیں۔ اول یہ کہ جس قلب کا مقام ایمان ہے، اس کی شناخت یہ ہے کہ وہ یعنی بندہ مومن ایسے امور انجام دیتا ہے جس میں اہل ایمان کی خیر خواہی اور بہتری مضمر ہو اور وہ ہر وقت مسلمانوں کی اعانت پر کمر بستہ ہو۔ دوسرا مقام فحاش ہے اور اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ فحاش اور کینہ پروری میں مشغول نظر آئے گا۔“

مرید آپ ہی کا ہو کر رہ گیا، واپس نہیں گیا۔

آپ نے جب بھی کسی سے کوئی بات کہی، وہ آپ ہی کا ہو کر رہ گیا۔

اسکندر میں یہ کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی اور آپ کو اسکندر کی یہ بات گراں گزرتی تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ یہ کام بہت زیادہ دشوار ہونا چاہیے تاکہ بھوک اور اس کی کیفیات کا اندازہ ہوتا رہے۔ آپ نے رزق کی حصولیابی کو اس طرح دشوار کر دیا کہ ہر روز علی الصبح جنگل کی طرف نکل جاتے تھے۔ وہاں بروی نامی گھاس کی کوئی کمی نہ تھی۔ آپ اس گھاس کو اکھاڑتے اور اس کی جڑ کو صاف کر کے کھالیا کرتے تھے۔

اس جنگل میں درندوں کی کثرت تھی۔ یہ دور سے آپ کو دیکھتے رہتے تھے۔ آپ کو اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ ان پر کوئی توجہ دیتے۔ ایک دن جب آپ جنگل سے واپس ہوئے تو آپ کے پیچھے پیچھے ایک شیر بھی پلٹے لگا۔ آپ کو اس وقت ہنا چلا جب آپ اپنی جھوپڑی کے پاس پہنچے اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شیر ٹھٹھک کر رک گیا۔

آپ نے کچھ دیر تک اس پر نظریں جمائے رکھیں، اس کے بعد پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ تو یہاں کیوں آیا ہے؟ یہاں تو بھوکا رہے گا، میری طرح۔ جنگل واپس چلا جا۔“

لیکن شیر واپس جانے کے بجائے جہاں کھڑا تھا، وہیں بیٹھ گیا۔

آپ نے پھر دریافت کیا۔ ”تو یہاں کیوں بیٹھ گیا؟ واپس نہیں جائے گا؟“

اس بار شیر نے آپ کو اندھیرے میں بند کر لیں جیسے وہ سو گیا ہو۔ آپ نے فرمایا۔ ”میں سمجھ گیا تیرا مطلب۔ تو واپس نہیں جانا چاہتا۔ بہر حال، ٹھیک ہے، جب تو نہیں میرے آس پاس رہنا چاہتا ہے تو وہ، شوق سے رہ مگر یہ یاد رہے کہ یہاں کھانے کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اس کا انتظام تو خود کرے گا۔“

شیر آپ کو بند کر کے چپ چاپ پڑا رہا۔ آپ کو اس سے ذرا بھی ڈر نہیں لگا۔ کچھ دیر بعد آپ نے پھر کہا۔ ”اب تو جنگل واپس جا۔“

لیکن شیر نے اس سے کس نہیں ہوا۔ جہاں بیٹھا تھا، بیٹھا رہا۔ آپ اپنی جھوپڑی میں چلے گئے۔ کئی دیر بعد مغرب کی نماز کے لیے باہر نکلے اور مسجد کی طرف جانے لگے تو دیکھا، شیر اس وقت بھی موجود تھا۔ آپ نے حیرت سے کہا۔ ”تو تو ابھی تک یہیں موجود ہے۔“

شیر بے حس و حرکت، ساکت و صامت بیٹھا ہوا تھا۔ آپ مسجد گئے اور مغرب کی نماز پڑھ کر جب واپس آئے تو شیر سے بطور خاص کہا۔ ”اچھا، جب تو نہیں ہمارے آس پاس ہی رہنا چاہتا ہے تو میری جھوپڑی کے پیچھے چلا جا۔ وہاں جھاڑیاں ہیں، انہی میں سے کسی میں رہ جا۔ یہاں میرے پاس آنے جانے والے لوگ تجھ کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جائیں گے لیکن جھاڑیوں میں تیری موجودگی کا کسی کو علم ہی نہ ہو سکے گا۔“

شیر اٹھا اور جھوپڑی کے پیچھے چلا گیا۔ آپ نے پیچھے جا کر دیکھا، وہ کسی جھاڑی میں دبک گیا تھا۔ رات کو آپ نے اس کی آہٹ محسوس کی۔ شاید وہ جھوپڑی کی درباری کر رہا تھا۔

کئی دن بعد آپ نے یہ دیکھا کہ وہ اپنے ساتھ کچھ اور درندوں کو بھی لے آیا۔ ان میں ایک بھیڑیہ تھا، دوسرا چیتا، تیسرا تیندو۔ یہ درندے بھی انہی جھاڑیوں میں رہنے لگے۔ آپ نے شیر سے کہا۔ ”میں تجھ سے حیرت کی حاکمیت تو نہیں کرنا لیکن یہ تو نے کیا کیا؟ بھیڑیا، چیتا، تیندو اور تو۔ کسی نے تم میں سے کسی کو دیکھ لیا تو وہ بدحواس اور خوفزدہ ہو کر بھاگ جائے گا۔ آخر تو چاہتا کیا ہے؟“

شیر نے جیسے آپ کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ ادھر ادھر ٹھٹھکا رہا۔ آپ نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”میں بھی عجیب آدمی ہوں۔ میں تجھ

سے سوال کرتا ہوں اور پھر جواب کا انتظار کرنے لگتا ہوں حالانکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو کیا جواب دے گا مگر میں پھر بھی چہرے سے غائب ہو جاتا ہوں۔“

شیر آکھیں بند کیے لہلہا رہا۔ آپ کو اب یہ تشریحات لاحق ہو گئی تھیں کہ یہ شیر اور اس کے ساتھی کھاتے کیا ہیں؟

کئی دن بعد آپ نے شیر کو دیکھا۔ وہ ایک ہرن کا شکار کر کے وہاں لے آیا تھا پھر اس ہرن کو سبھی نے بڑے مزے لے لے کر کھانا شروع کر دیا۔

آپ ان جانوروں سے مزے مزے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اس دوران آپ کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا اور یہ بھی کہ آپ کے آس پاس دروے پہرا دیتے ہیں۔

ہندو اداوں کو آپ سے ملنے کا اشتیاق ہو گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہندو میں قیام کے دوران آپ سے نہیں ملے تھے لیکن اب جو آپ کا چچا ہوا تو ملنے کے لیے اسکندر یہ پہنچ گئے۔ آپ نے مجبور کی چٹائی بچا دی اور انہیں اس پر بٹھا کر ان کی خاطر مدارات میں مشغول ہو گئے۔

یہ صوفی لوگ باتیں خوب بنالیتے تھے اور یہ بھی مبتدی تھے۔ وہ آپ کے پاس بیٹھ کر بڑی بڑی باتیں کرنے لگے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: ”بھائی! اسکندر یہ تک آنے میں بڑی مشکل پیش آئی۔ میں تو تم لوگوں سے مجبور ہو گیا تھا ورنہ میں آنکھیں بند کر تا اور جب کھانا تو خود کھایا ہوتا۔ مجھے اتنی قدرت تو حاصل ہو چکی ہے۔“

دوسرے نے کہا: ”میں نے تو یہ سوچا ہے کہ جب میں واپس جانے لگوں گا تو تم سب کو اپنے کشف سے اپنے ساتھ اس طرح لے جاؤں گا کہ کسی کو چپا بھی نہ چلے گا۔ میں ہوا پر قابو رکھتا ہوں۔“

تیسرے نے کہا: ”میں نے ایک شخص کو ہوا میں سفر کرتے دیکھا تو اس کو ڈانٹ دیا اور حکمانے اتار لیا۔ وہ اپنے آپ کو بڑا کراماتی انسان سمجھتا تھا لیکن میں نے اس کی کراماتی قوت سلب کر لی۔ جب اس کو میری بابت معلوم ہوا تو وہ میرے پاس آکر معذرت کرنے لگا۔“

آپ ان کی باتیں سن رہے تھے اور ذرا گھبرا رہے تھے کہ انہیں جواب کس طرح دیا جائے۔

ایک نے آپ سے پوچھا: ”ہاں جناب ابو الخیر! آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نہیں کیا کرامت دکھائیں گے؟“

آپ نے جواب دیا: ”انہوں نے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ میں آپ حضرات کا کیا مقابلہ کروں گا۔“

ایک صوفی کو ہنسی آگئی، بولا: ”واہ جناب! ہم نے تو آپ کا بہت شہرہ سنا تھا۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ہم نے اسکندر یہ آکر اپنا وقت ضائع کیا۔“

آپ نے سادہ لونی سے جواب دیا: ”اب میں کیا عرض کروں۔ مجھے جو کہنا تھا، کہہ چکا۔“

ایک نے اپنے ساتھیوں سے ازراہ مذاق واسطہزاک کہا: ”نام بڑے، درشن چھوٹے۔ واہ بھئی واہ، ہم تو بڑی امیدیں لے کر آئے تھے یہاں۔“

دوسرے نے ہنسنے ہوئے کہا: ”پھر ہم یہاں بیٹھے کیوں ہیں، اٹھتے کیوں نہیں، اٹھیے، کہیں اور چلیے۔“

تیسرے نے کہا: ”اب کہیں اور جانے کے بجائے ہندو اداس چلیں کیونکہ یہاں آکے اندازہ ہوا کہ ہم جہاں بھی جائیں گے، اپنے جیسے نہیں پائیں گے۔“

آپ ان کی باتوں سے ہزار ہوں کہ باہر چلے گئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی شیر اندر داخل ہو گیا۔ آپ گھبرائے ہوئے دوبارہ اندر داخل ہوئے اور وہاں یہ عجیب و غریب منظر دیکھا کہ بڑبڑاے صوفی شیر سے ڈر کر ایک دوسرے سے چٹ گئے تھے۔ آپ نے ان ڈرے سے صوفیوں سے پوچھا: ”حضرات! کیا بات ہے؟ آپ کی کرامات کو کیا ہو گیا؟ کیا وہ اس شیر کے سامنے جواب دے سکیں؟“

ایک صوفی نے آپ کو بے خوف کھڑے دیکھا تو اس کو اپنی آنکھوں پر تعین نہیں آیا، بولا: ”جناب! باہر جا بیٹیں اور لوگوں کو بلو کہ اس سے نجات دلا دیں، یہ تو ہمیں کھا جائے گا۔“

آپ نے جواب دیا: ”میں یہاں کس کو بلا کے لاؤں گا۔ آپ لوگ جائیں تو اپنی کرامات سے اس کو کاٹھ کا بنا دیں۔“

صوفی شرمندہ تھے، ایک نے پوچھا: ”کاٹھ کا تو بنانے میں کون سا عمل کیا جاتا ہے؟ یہ مجھے بھی تو معلوم ہو۔“

دوسرے صوفی نے کہا: ”دو بے بیچاروں حضرات باتیں تو خوب کر لیتے ہیں لیکن پیچیدہ مسائل کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔“

اب شیر ان کے بالکل پاس پہنچ چکا تھا۔ وہ بول نہیں رہا تھا۔ شیر نے ان کی طرف دیکھ کر ایک آواز نکالی تو صوفیوں کی چیخیں کل

سمیں۔ وہ آپ کی خوشامد کرنے لگے۔ ”ابو الخیر! خدا کے لیے ہمیں بچاؤ۔ یہ شیر، اس کے ارادے اچھے نہیں نظر آتے۔“

آپ نے پھر وہی جواب دیا: ”میں کیا کر سکتا ہوں۔ اپنی کرامتوں سے شیر کو قابو میں کر لو۔“

ایک نے کہا: ”صوفی ہیں تو کرامات بھی ہمارے پاس ہیں ورنہ اس وقت میں۔“

ابو الخیر کو ان صوفیوں پر دم آرہا تھا۔ آپ نے شیر سے پوچھا: ”تو یہاں کس کی اجازت سے آیا تھا؟“

شیر آپ کے قدموں میں بیٹھ کر پاؤں چومنے چائے لگا۔ صوفیوں نے یہ منظر دیکھا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

آپ نے ذرا ہر جوش لہجے میں کہا: ”مجھے ان سے بڑی چڑ ہے جو کرامات کا دھڑا دھڑا پتہ پھرتے ہیں۔ یہ بھی کوئی بیٹے کی چڑ ہے۔“

ایک صوفی نے کہا: ”حضرت! اس وقت ہم آپ کی ہر بات مان لیں گے لیکن خدا کے لیے شیر کو یہاں سے لے جا لیں۔“

آپ نے فرمایا: ”دوستو! میری چند باتیں اگر پسند آئیں تو ذہن میں محفوظ کر لینا ورنہ کوئی بات، کوئی شکایت نہیں۔“

سبھی نے کہا: ”ارشا فرما لیں۔“

آپ نے فرمایا: ”صوفی کرامات کے چکر میں پڑ کے مغرور ہو جاتا ہے۔ کرامات کو بچھومت، اس کو خرید و دور نہ یاد رکھو کہ اگر کتے کی طرح نہ بھونکے تب بھی وہ کتا ہی رہے گا۔ کرامات حقیقت نہیں۔“

شیر صوفیوں کے دروبرو بیٹھ گیا۔

صوفیوں نے کہا: ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کرامات اور صوفیا تو لازم و ملزوم ہیں۔ ہمارا اپنا خیال تو یہی ہے۔“

آپ نے جواب دیا: ”یہ تم لوگوں کا اپنا خیال تو ہو سکتا ہے لیکن صوفیائے عالم کی طرف سے حقی اور حقیقی جواب نہیں۔ کرامات تو زاہدوں اور ابدالوں کے لیے شیک ہیں لیکن صوفی عارف کا مقام کرامات سے بہت آگے ہے۔ وہ تو بذات خود ایک قسم کرامت ہے۔“

صوفیوں نے ایک بار پھر شیر کی طرف دیکھا جو بلائے جان کی طرح ان کا راستہ روکے بیٹھا تھا۔ صوفیوں نے اس کی طرف اشارہ کیا اور کہا: ”براؤ کم اس کو بٹھا دیجیے، آپ کی ہر بات ہم ماننے کو تیار ہیں بلکہ مان چکے ہیں۔“

آپ نے شیر سے کہا: ”تو یہاں کیوں بیٹھ گیا۔ ان دنیا دار صوفیوں کی راہ سے ہٹ جا۔ ان کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔“

شیر نے آپ کی طرف دیکھا اور جدر سے آیا تھا، اسی طرف واپس چلا گیا۔ بغدادی صوفی بھی موقع قیمت دیکھ کر وہاں سے فرار ہو گئے۔

آپ کی باتیں اور ادوات لوگوں کی زبان پر تھیں۔ بزرگوں تک کو آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔

ابراہیم رقی نامی ایک صوفی بھی آپ سے ملنے کے شائق تھے۔ دور دراز کا سفر کر کے آپ کے پاس پہنچے، آپ سے ملے اور باتوں میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے ان سے کہا: ”آپ کہیں دور سے آئے ہیں اس لیے کیا بہتر ہو کہ دو چادر دن میرے ساتھ رہیں۔“

ابراہیم رقی نے جواب دیا: ”بہتر ہے۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔“

مغرب کا وقت قریب تھا۔ آپ نے کہا: ”چلو، مغرب کی نماز پڑھ لیں چل کر۔“

ابراہیم رقی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ دونوں ایک ساتھ مسجد گئے۔ وہاں اور نمازی بھی آئے ہوئے تھے۔ ان سب نے آپ کو اپنا امام بنایا اور ان کے مقتدی بن گئے۔

آپ نے سورۃ فاتحہ اس طرح پڑھی جس طرح علم تجوید سے ناواقف حضرات پڑھا کرتے ہیں۔ ابراہیم نے نماز ہی کے دوران سوچا: ”میں بھی کس شخص کے چکر میں آ گیا ہوں۔ ان کو تو علم تجوید کا بھی کوئی تجربہ نہیں پھر میں نے یہاں آکے وقت ہی توضیح کیا۔“

نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے ابراہیم سے پوچھا: ”کیا بات ہے؟ تم کس پیکر میں ہو؟ خیریت سے تو ہو؟“

ابراہیم نے جواب دیا: ”میں بالکل خیریت سے ہوں اور یہ سبج رہا ہوں کہ یہاں سے فوراً چلا جاؤں۔“

آپ نے پوچھا: ”وہ کیوں؟ یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا؟“

ابراہیم رقی نے جواب دیا: ”بس کیا عرض کروں، چند کام اچانک یاد آ گئے، اگر وہ انجام نہ پائے تو مجھے غیر معمولی نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔“

آپ نے بے دلی اور ناخوشگوار سے کہا: ”جیسی تمہاری مرضی۔ میں کیا کہوں۔ ٹھیک ہے تو یہاں سے کب جاؤ گے؟“

ابراہیم نے جواب دیا: ”میں ابھی، اسی وقت یہاں سے چلا جاؤں گا۔ یہاں رکوں گا نہیں۔“

آپ کو اس صاف اور کمرے سے بڑی تکلیف پہنچ رہی تھی لیکن آپ خاموش رہے۔ ابراہیم نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ”حضرت! میں ابھی آیا، اگر آپ میں دیر ہو جائے تو میرا انتظار نہ کیجئے گا۔“

آپ نے آہستہ سے کہا۔ ”ٹھیک ہے مگر تم جو کچھ کر رہے ہو، اچھا نہیں کر رہے۔ جانا ہی چاہتے ہو تو صاف صاف بتا کے چلے جاؤ۔ بہانے مت کرو۔“

ابراہیم رتی جیسے میچ سے باہر نکلے، شیر نے ان کا راستہ روک لیا۔ ان کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ابو الخیر چیخ کر باہر نکلے اور ابراہیم رتی کو شیر کے سامنے دیکھ کر آپ نے شیر کو ڈانٹ پلائی۔ ”کیا میں نے تجھ کو سمجھایا نہیں تھا کہ میرے مہمانوں کو تنگ مت کیا کر لیکن تو باز نہیں آیا۔ جا، ابراہیم کو جانے دے۔“

شیر سامنے سے ہٹ گیا۔ ابراہیم نے ایسا منظر زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا، پوچھا۔ ”آپ کو شیر سے ڈر نہیں لگتا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، بالکل نہیں۔ وہ بھی اللہ کی ایک مخلوق ہے۔ اس سے ڈرنے کی کیا بات ہے؟“

ابراہیم نے کہا۔ ”لیکن میں تو اس سے ڈر گیا۔ وہ درندہ ہے اور درندے سے ڈرنا ہی چاہیے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”ابراہیم رتی بات صرف اتنی سی ہے کہ میں اپنے باطن کی اصلاح اور تربیت میں مشغول رہتا ہوں اس لیے درندے مجھ سے ڈرتے ہیں اور میرے تابعدار بن کر رہتے ہیں جبکہ تم ظاہری اصلاح میں وقت ضائع کرتے ہو اور تم درندوں سے ڈرتے ہو۔“

اس جواب نے ابراہیم رتی کی کایا پلٹ دی اور وہ آپ ہی کے پاس رک گئے اور آپ ہی کے زیر تربیت رہ کر مدارجِ عالی حاصل کرنے لگے۔

☆☆☆

آپ اسکندریہ میں بارہ سال رہے لیکن پھر یہاں سے شام کی ہو گئے۔ یہاں کھانے پینے کو بے آسانی میسر آ جاتا تھا اس لیے آپ نے فیصلہ کیا کہ اب اسکندریہ میں نہیں رہیں گے اور وہاں سے چلے جائیں گے جہاں زندگی و دشواری سے گزاری جاسکے۔ اس وقت ان کے سامنے شطرا اور دمیاط تھے۔ شطرا ایک قصبہ تھا اور دمیاط ایک اہم ترین شہر تھا۔ وہ کہیں جانے سے پہلے ان دونوں مقامات کے بارے میں غور کرتے رہے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے ان دونوں کو دیکھ لیا جائے، اس کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے۔

آپ اسکندریہ کو چھوڑ کر شطرا چلے گئے اور ویرانے میں ایک جھوپڑی بنا کر رہنے لگے۔ بعد میں یہ جگہ بھی آپ کو اچھی نہیں لگی اور آپ شطرا سے دمیاط چلے گئے۔ دمیاط میں ایک چھوٹی سی جھوپڑی بنائی اور اس میں رہنے لگے۔ شیر بھی یہیں چلا آیا۔

دمیاط ایک ساحلی شہر تھا۔ آپ کو یہاں پہلے دن سے ہی کھانے پینے کی تکلیف شروع ہو گئی۔ آپ کو بھوک بہت پریشان کرنے لگی۔ یہاں بردی نامی ایک گھاس بہت زیادہ پائی جاتی تھی۔ آپ اس کو جڑ سے اکھاڑ لیتے، گھاس پھینک دیتے اور جڑ کو صاف کر کے کھا لیتے۔

یہاں بھی صوفیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک دن آپ نے مراتبہ میں سوچا۔ اے کاش میں حرم پاک پہنچ سکتا!

جب آپ مراتبہ سے نکلے اور آنکھ کھول کر ادھر ادھر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس وقت آپ حرم پاک میں موجود تھے۔ آپ نے ایک دن وہیں گزارا اور پھر مراتبہ میں دمیاط کا تصور کیا۔ آنکھ جو کھلی تو خود کو دمیاط میں پایا۔ یہاں صوفیوں نے آپ کو گھیر لیا اور پوچھنے لگے کہ آپ اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے؟

آپ نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا۔ صوفیوں نے جواب نہ پا کر اپنی باتیں شروع کر دیں۔

ایک نے کہا۔ ”جب میں دمشق میں تھا تو ایک دن بحالتِ بھوک اللہ سے گرم روٹیاں طلب کیں اور جب آنکھ کھول کر دیکھا تو میرے سامنے گرم گرم روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اور یہ بڑے الارض کا کیا معاملہ ہے؟ میں نے تو یہ سن رکھا ہے کہ بعض صوفی آنکھیں بند کر کے جہاں کی نیت کر لیتے ہیں، وہیں چہرہ زدن میں پہنچ جاتے ہیں لیکن ابھی تک مجھے ایک بھی ایسا آدمی نہیں ملا جو چشم زدن میں ایسا سفر کر سکتا ہو۔“

تیسرے صوفی نے کہا۔ ”ابھی چند دن پہلے کی بات ہے۔ میرے ایک ارادت مند کا بیٹا مونیہ کا شکار ہو گیا۔ میں نے اس کو سیب دیا کہ بیٹے کو کھلا، ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ میرے بیٹے کی کایا اور اس کا بیٹا صحت یاب ہو گیا۔“

آپ کو ان کی باتوں پر غصہ آ رہا تھا، ان سے پوچھا۔ ”یہ آپ لوگ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں آخر؟“

ایک نے جواب دیا۔ ”یہاں ہماری باتیں نہیں سن رہے؟ میں آپ کے سوال کا کیا جواب دوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تم لوگ جن کرامتوں کا ذکر کر رہے ہو، میں نے تو ایسی کرامات دیکھی ہیں اس لیے کیا جواب دوں۔“

ایک صوفی نے پوچھا۔ ”اور حضرت! آپ اچانک غائب ہو گئے تھے۔ کیا یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ آپ اس وقت کہاں تھے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں کیا جواب دوں۔ بس میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ لوگ اپنی کرامات کا ذکر ہی کر سکتے ہیں، دیکھا نہیں سکتے جبکہ میں ایک ایسے وحشی کالے لکڑے سے اچھی طرح واقف ہوں کہ وہ آنکھیں بند کر کے حرم پاک میں پہنچ گیا اور پھر اسی طرح پلک جھپکتے میں واپس آ گیا۔“

صوفیوں کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ آپس میں اشاروں سے بتانے لگے کہ وہ وحشی غلام شاید ابو الخیر خود ہی ہیں۔ اب ان میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ جن باتوں کا ذکر کر رہے تھے، ان کو جاری رکھ سکیں۔

آپ نے فرمایا۔ ”دوستو! اگر تم کچھ ہو تو اس کا ذکر نہ کرو اور کوشش کرو دوسرے اس کا ذکر کریں۔“

☆☆☆

شیخ ابو الخیر کے رزق کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ بردی گھاس کی جڑ ایک عرصے تک کھاتے رہے۔ اس کے بعد آپ وہاں پہنچ جاتے جہاں مسافروں کی آمد و رفت زیادہ رہتی تھی۔ آپ مسافروں کے بچے کچھ کھانے کو اپنے لیے قبول کر لیتے تھے اور اپنے نفس سے کہتے تھے کہ کہاں کیا تیرا غرور، دیکھ تیری غذا تجھے کس طرح دی جا رہی ہے۔

یہاں بچے کچھ کھانے میں اس پاس کے کتے بھی شریک ہو جاتے۔ آپ کو ان کتوں سے مقابلہ کرنا پڑتا اور ان سے لڑ جھگڑ کر اپنے حصے کا کھانا وصول کر لیتے۔

معلوم نہیں کس طرح آپ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ آپ کو جو غذا ملتی ہے، وہ کسی کے حصے میں سے نہیں ملتی کیونکہ مسافر اپنے حصے کا کھانا جو چھوڑ دیتے تھے، وہ کسی اور کا حصہ نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح بردی گھاس کی جڑ بھی کسی کا حصہ نہیں ہوتی تھی۔

کئی دن بعد اس خیال کی بھی نفی ہو گئی اور نفس نے آپ کو طعنہ دیا۔ ”ابو الخیر! آف ہے تجھ پر کہ تو توکل کا تو دعویٰ کرتا ہے اور تیرا عالم یہ ہے کہ مسافروں کے دسترخوان کا بچا کچھا حاصل کرنے میں پہنچ جاتا ہے اور بردی گھاس کی جڑوں کی جستجو میں آوارہ و سرگرداں رہتا ہے۔ یہ کیسا توکل ہے؟ یہ کون سا توکل ہے؟“

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ غذا کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائے؟ مسئلہ بھی حل ہو جائے اور غذا کی تلاش اور جستجو میں جو وقت اور خودداری کا ضیاع ہے، اس سے بھی نجات مل جائے۔ آخر جب کوئی حل نہ نکلا تو آپ نے غور و فکر میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور عہد کر لیا کہ اللہ! میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ غذا کے سلسلے میں میرے ہاتھ نہ تو کسی کے در پر نہیں گے اور نہ ہی گھاس بردی کی تلاش میں نکلوں گا۔ میرے ہاتھ ہمیشہ بسلسلہ غذا اختر ز رہیں گے۔ اگر میں اپنے عہد کو توڑوں تو تجھے اختیار ہوگا کہ مجھے اس کی سزا دے اور اب میں وہی کھاؤں گا جو تو مجھے بھیجے گا۔

اب آپ نے اپنی جھوپڑی میں عبادت اور ریاضت میں مگر بسر شروع کر دی۔ آپ کو دنیا کا ہوش ہی نہیں تھا کہ دن ہی حال میں گزر گئے اور آپ کھانے سے بالکل محروم رہے۔ ناتوانی نے اعضا کو محصل اور کمزور کر دیا۔ چلنے پھرنے کی سکت جاتی رہی پھر اعضا بیٹھنا بھی دو بھر محسوس ہونے لگا۔

اسی حال میں دو تین دن اور گزر گئے۔ پانی سے پیٹ بھرتے رہے لیکن کب تک؟ کہاں تک؟ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کا ہلنا جلنا بھی محال ہو گیا۔

آخر آپ سجدے میں گر گئے اور بارگاہِ ایزدی میں عرض کیا۔ ”لله العالمین! اٹو! اپنی عبادت کی خدمت میرے سپرد کی ہے اور اس عبادت کی نسبت قیامت کے دن مجھ سے باز پرس کرے گا۔ اس صورت میں تو میرے رزق کا ضامن بن۔ میں نے تجھ سے جو عہد کیا ہے، اس پر میری گرفت نہ فرما۔“

اس التجا کے بعد آپ نے سجدے سے سر اٹھایا تو دیکھا ایک شخص دو روٹیاں اور شوربا لیے کھڑا ہے۔ اس نے کہا۔ ”حضرت! یہ آپ کا کھانا ہے۔“

آپ نے روٹیاں اور شوربا لے کر دریافت کیا۔ ”یہ کہاں سے لایا ہے تو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”مجھے کچھ پتا نہیں۔ بس مجھے یہ چیزیں دی گئیں اور کہا گیا کہ آپ کو بچاؤں چنانچہ میں آپ کو دے کر

جا رہا ہوں۔“ آپ نے حکم میرے ہو کر روٹیاں کھائیں اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اب تو اس شخص کا معمول ہو گیا تھا کہ ہر روز دو روٹیاں اور شور بالاسا اور آپ کو دے کر کہیں چلا جاتا۔ کئی ماہ بعد رات کو آپ اپنے ہوئے سوچ رہے تھے کہ اللہ کا کیا نظام ہے کہ آدمی جس طرح اپنا رزق حاصل کرے، اللہ اپنے بندوں کی کسی دیکھنی اور مدد فرماتا ہے۔ ابھی آپ اسی قسم کی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ کسی طرف سے آواز آئی۔ ”اے ابوالخیر! بہت دن اللہ کرتے رہے اب اس کی راہ میں جہاد بھی کرو۔“

آپ نے آواز کی سمت کان لگا دیے اور اس نگر میں رہے کہ اس کی مزید تائید کہاں سے حاصل کی جائے؟ کئی دن بعد دوپہر کو یہ آواز پھر سنائی دی۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ ”اے ابوالخیر! کیا تم نے میری بات نہیں سنی؟ تم ابھی تک اپنی جھوٹری میں پڑے ہو۔ باہر نکلو اور میری راہ میں جہاد کرو۔“

آپ نے دلی دلی آواز میں پوچھا۔ ”یہ تو کون ہے؟ ذرا سامنے تو آ اور مجھے بتا کہ کیا میں واقعی جہاد کی خاطر نکل کھڑا ہوں اور آئندہ میں جہاد کرتا پھر دوں؟“

آواز نے جواب دیا۔ ”بے شک، اب جھوٹری سے باہر نکل اور جو کچھ میں نے کہا ہے، اس پر پورا اترنے کی کوشش کرو۔“ آپ نے جھوٹری کی چھوڑ دی اور باہر نکلے۔ دو روٹیاں اور شور بالاسے کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ اب آپ شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں بھی گئے، لوگوں نے آپ کو پکچانا اور ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آپ کے عقیدت مند پوچھتے۔ ”حضرت! کہاں کا ارادہ ہے؟“ آپ جواب دیتے۔ ”جہاد کا۔“

عقیدت مندوں نے مشورہ دیا۔ ”اگر آپ کو جہاد کرنا ہے تو سرحدوں کی طرف تشریف لے جائیں۔“ چنانچہ آپ نے سرحدوں کا رخ کیا اور اٹلا کیہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اثنائے سفر جھہ پڑ گیا۔ آپ نے ایک مسجد میں نماز جمعہ ادا کی۔ وہاں نماز کے بعد مسجد کے محکم میں ایک شخص کھڑا ہوا اور وہ غلظت شروع کر دیا۔ وہ وعظ میں حضرت زکریا کا ذکر کر رہا تھا۔ اس نے حضرت زکریا کی تفصیل بتانے کے بعد کہا۔ ”جب آپ کی قوم نے آپ کا بیٹا کیا تو وہ ایک درخت کے پاس بیٹھنے اور اس سے پناہ چاہی۔ درخت نے آپ کو چھپایا لیکن آپ کے لباس کا کچھ حصہ باہر نکلا رہ گیا۔ قوم نے درخت کے لیے آگ کا انتظام کیا اور پھر چند آدمیوں نے آگ سے درخت کو کاٹ ڈالا۔ اس میں حضرت زکریا کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے۔ حضرت زکریا نے صبر سے کام لیا اور شکایت کا ایک لفظ بھی اپنی زبان سے ادا نہ کیا۔“

آپ نے یہ واقعہ سننا تو رونا آگیا اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اے میرے آقا! ذکر یا علیہ السلام تو خیرے صابر بنی تھے۔ اگر مجھ پر ایسا وقت پڑ جائے تو میں بھی صبر کر سکتا ہوں حالانکہ میں نبی نہیں ہوں، تیرا ایک ادنیٰ سا بندہ ہوں۔“ آپ مسجد سے نکلے اور اٹلا کیہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں بھی قیام کیا، آپ کے ارادت مندوں نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اٹلا کیہ کے قریب آپ کے ارادت مندوں نے پوچھا۔ ”آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں جہاد کی غرض سے نکلا ہوں، اب اٹلا کیہ قریب ہے، یہاں میں جہاد میں شریک ہو سکوں گا۔“ آپ کے ارادت مندوں نے آپ کے اس جذبے کی قدر کی اور پوچھا۔ ”بہت نیک ارادے ہیں ورنہ ایسا کہاں ہوا ہے کہ کوئی صوفی جہاد کرے مگر آپ کے پاس نہ تو ہتھیار ہیں، نہ زورہ بکتر، پھر آپ جہاد کیسے طرح کریں گے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ابھی تک تو میں میدان جنگ سے بہت دور تھا لیکن اب جبکہ میں میدان کارزار سے قریب ہوں تو مجھے ہتھیار بھی درکار ہیں اور زورہ بکتر بھی اور اس کا انتظام تم لوگ کرو گے۔“ لوگوں نے آپ کی تجویز سے اتفاق کیا اور آپ کے لیے ہتھیار اور زورہ بکتر کا انتظام کر دیا گیا۔ آپ لوہے میں غرق ہو کر میدان کارزار کی طرف چل دیے۔

اسلامی فوجیں فسیل کے اندر پڑی ہوئی تھیں۔ فسیل کے باہر زورہ دشمن کی فوج خیمہ زن تھی۔ آپ چاہتے تو فسیل کے اندر ٹھہر جاتے اور پھر فوج کے ساتھ باہر نکل کر کفار کا مقابلہ کرتے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا اور فسیل کے اندر بیٹھ جانے میں شرم اور عداوت ہی محسوس کرنے لگے چنانچہ آپ نے یہ دستور بنایا کہ دن بھر فسیل سے باہر جنگل میں رہتے اور شام کو واپس آ جاتے۔ جس جنگل میں آپ کا آنا جانا تھا، وہاں کنارے پر ایک دریا بہتا تھا۔ آپ دریا کے کنارے وضو کر کے نماز میں مشغول ہو جاتے۔

ایک دن آپ نے فسیل کے اندر سوال کیا۔ ”جنگ کب شروع ہوگی؟“

کسی نے جواب دیا۔ ”ابھی تو جاغین میں باتیں ہو رہی ہیں۔ جب بات نہیں ہے، جنگ شروع کر دی جائے گی۔“ آپ نے مایوسی سے کہا۔ ”یہ تو بڑی مشکل کی بات ہے۔ اس وقت تک میں کیا کروں؟“ آپ سے پوچھا گیا۔ ”یعنی؟ کیا مطلب؟ ذرا صاف صاف بات کیجیے۔“ آپ نے فرمایا۔ ”میں یہاں جہاد کی خاطر آیا تھا مگر میرا کام نہیں بنا۔ میں نمازیں پڑھ پڑھ کے اپنا وقت گزار رہا ہوں لیکن حکم خداوندی یہی ہے کہ میں جہاد کروں۔ مجھ میں نہیں آتا کہ میں اس معاملے سے کس طرح عہدہ برا ہو سکوں گا۔“ لوگوں نے سوچا کہ یہ عجیب بزرگ ہیں کہ جن کو جہاد سے دلچسپی ہو گئی ہے۔

یہاں آپ کے کھانے کا نظام بگڑ چکا تھا۔ کئی کئی دن گزر جاتے کہ کھانے کو کوئی پوچھتا تک نہ تھا چنانچہ اس روز بھی وہ بہت بھوکے تھے۔ سامنے پھلوں سے لدے درخت تھے۔ ان پھلوں پر شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس وقت بھوک کی اضطرابی حالت میں انہیں وہ عہد بھی یاد آیا جو وہ اپنے رب سے کر چکے تھے۔ انہوں نے چند پھل توڑے اور منہ میں رکھ لیے۔ دو تین کھا بھی لیے کہ انہیں اچانک اپنا عہد یاد آ گیا۔ جو پھل نہیں کھائے تھے اور ابھی تک ان کے ہاتھ میں تھے، انہیں زمین پر چھینک دیا۔ اس کے باوجود دل کے اندر کوئی کہہ رہا تھا کہ اے ابوالخیر! یہ تو نے کیا کر دیا؟ تو نے اللہ سے کہے ہوئے عہد کو بھلا دیا، مجھے اس کی سزا مل کر رہی ہے۔ اسی حالت میں انہوں نے اپنی ذہال اور نیزہ بھی پھینک دیے اور ایک جگہ شرم و عداوت سے زمین پر آکر دو بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ ٹھوڑی دو دنوں تھیلیوں پر لگا دی۔ اب یہ سوچ رہے تھے کہ مجھ سے یہ کیسی ظلمتی سرزد ہو گئی۔ ابھی اس حال میں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ سواروں اور پیادوں کی ایک جماعت ان کے آس پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک نے ان سے درشت لہجے میں کہا۔ ”اٹھ اور میرے ساتھ چل، تجھ سے ہمیں ایک کام لینا ہے۔“

یہ اٹھ کر ان کے ساتھ ہو لیے۔ سپاہی انہیں دریا کے کنارے لے گئے۔ وہاں ان کا سردار بھی کھڑا تھا اور سردار کے سامنے ڈاکوؤں کی ایک جماعت کھڑی تھی۔

انہیں سپاہیوں نے اپنے سردار کے سامنے کھڑا کر دیا۔ سردار نے ان سے پوچھا۔ ”تو کون ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”خدا کے بندوں میں سے ایک بندہ۔“

سردار نے کہا۔ ”وہ تو ہم سب بھی ہیں۔ اس کے علاوہ تو کون ہے؟“

آپ نے سوچا کہ اس فضول سوال کا کیا جواب دیا جائے۔ آپ نے جواب نہیں دیا۔

سردار نے ڈاکوؤں سے پوچھا۔ ”کیا تم اسے پہچانتے ہو؟“

انہوں نے بھی انہیں پہچانتے سے انکار کر دیا اور کہا۔ ”ہم اس شخص کو نہیں پہچانتے۔“

سردار نے کہا۔ ”تم سب جھوٹے ہو جبکہ ہمیں تو یہ شخص تمہارا سردار معلوم ہوتا ہے۔ تم سب اس کے مطیع اور فرمانبردار معلوم ہوتے ہو اور میرے سامنے پہچانتے سے انکار کرتے ہو۔“

سردار کو ان سب پر اتنا غصہ آیا کہ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ”یہ سب چور اور ڈاکو ہیں، ان کا ایک ایک ہاتھ کاٹ دیا جائے۔“

حکم کی دیر ہی کہ ان کے ہاتھ کاٹے جانے لگے۔ انہی میں آپ کی باری بھی آگئی۔ جلاد نے ان کا بھی ایک ہاتھ کاٹ دیا۔

سردار نے دوسرا حکم یہ دیا کہ ان کا ایک ایک پاؤں بھی کاٹ دیا جائے۔

اس حکم پر بھی عملدرآمد شروع ہو گیا۔

آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اے اللہ! اے میرے آقا! میرے ہاتھ نے پھل توڑنے کا گناہ کیا تھا سو اس کی اسے سزا ملے لیکن میرے پاؤں نے کون سا گناہ کیا تھا جس کی اسے سزا دی جا رہی ہے۔“

ابھی آپ کی یہ دعا جاری تھی کہ ایک سوار اپنے گھوڑے کو بھگاتا ہوا آیا اور آتے ہی گھوڑے سے کود پڑا اور چیخے ہوئے جلاد سے کہا۔ ”تو نے یہ کیسا غضب کر دیا۔ ڈر ہے کہ کہیں آسمان نہ ٹوٹ پڑے تجھ پر اور زمین نہ پھٹ جائے جس میں تو ڈھنسا جائے۔“

جلاد نے کہا۔ ”کیوں؟ میں نے کیا کیا؟ مجھے حکم ملا، میں نے اس کی تعمیل کر دی۔“

اس آئے والے نے اپنے سردار سے پوچھا۔ ”سردار! آپ کو کچھ بتا بھی ہے کہ یہ کون ہیں؟“

سردار نے جواب دیا۔ ”ہمیں، میں اس شخص کو نہیں پہچانتا۔“

آئے والے نے کہا۔ ”یہ مشہور صوفی ابوالخیر ہیں۔“

مردار نے نام سننے ہی کا پتہ شروع کر دیا۔ آپ سے کہا۔ ”حضرت! یہ کیا کیا آپ نے؟ آپ نے اپنا نام ہمیں کیوں نہ بتایا؟“ اس کے بعد کنا ہوا ہاتھ زمین سے اٹھالیا اور اس کو بوسہ دے کر بولا۔ ”یہ کیسا گناہ مرزد ہو گیا مجھ سے۔ اب میرا کیا انجام ہوگا۔“

پھر یہ مردار آپ سے لپٹ کر رونے لگا اور بولا۔ ”حضرت! میں آپ کا گناہ گار ہوں۔ مجھے معاف کر دیجیے۔“ آپ نے جواب دیا۔ ”میں تو تجھ کو پہلے ہی معاف کر چکا ہوں۔ یہ ہاتھ جو کاٹ کے پھینک دیا گیا، گناہ گار تھا۔ اس کو اس کے گناہ کی سزا میں جسم سے الگ کیا گیا ہے۔“ آپ یہ کہہ رہے تھے اور روتے جا رہے تھے۔ آخر میں آپ نے کہا۔ ”انوس کہ ہاتھ بھی کیا اور رزق معلوم بھی۔ یعنی دو روٹیاں اور شوربا بھی۔“

آپ اسی حال میں دمیاطا ولس گئے۔ وہاں جو بھی اس حال میں دیکھتا، بھی پوچھتا۔ ”حضرت! یہ کیا ہوا؟“ آپ جواب دیتے۔ ”ایک گناہ گار نے اپنے گناہ کی سزا پائی۔“ کچھ عرصے بعد آپ کے دوسرے ہاتھ میں ایک پھوڑا نمودار ہوا۔ یہ بڑے بڑے اتار بڑھ گیا کہ معالجوں نے علاج سے تنگ آکے مشورہ دیا کہ اگر آپ کو اپنی جان بچانی ہے تو اس کو کٹوا دیجیے۔

آپ نے جواب دیا۔ ”میں اپنا یہ ہاتھ نہیں کٹاؤں گا۔“ معالج نے اصرار کیا۔ ”حضرت! آپ کی زندگی خطرے میں ہے۔“ آپ کے ارادت مندوں نے معالج کو ایک طرف لے جا کے سمجھایا۔ ”اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ جب نماز میں مشغول ہوں، ہاتھ کاٹ دیں، ان کو کوئی عذر نہ ہوگا اور انہیں اس کا پتا بھی نہیں چلے گا۔“ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب وہ نماز میں مشغول تھے تو ان کا دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا۔ جب آپ نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی کٹا ہوا دیکھا تو فرمایا۔ ”اے ابوالخیر! اب تو کس ہاتھ سے گناہ کرے گا؟“ اب یہ ابوالخیر قطع کھلائے جانے لگے۔ وہ ابوالخیر جس کے دونوں ہاتھ کٹ چکے ہوں۔

☆☆☆

لوگوں نے اس حال میں بھی دیکھا کہ آپ کے پاس نئی ہوئی زینل رکھی رہتی جیسے آپ ہی نے اس کو بنایا ہو۔ پھر اس زینل کا کوئی خریدار آ جاتا۔ وہ اس کی قیمت ادا کر کے لے جاتا اور آپ اس رقم سے اپنا خرچ چلاتے۔ لوگوں میں اتنی ہمت نہیں تھی جو آپ سے پوچھتے کہ حضرت! یہ زینل کون بن جاتا ہے اور آپ اپنے دونوں ہاتھوں کی عدم موجودگی میں کھانا کس طرح کھاتے ہیں؟ آپ کی طبیعت میں بڑا غمراہ آچکا تھا۔ ایک قسم کا فرار۔ اس عہد کے دوسرے صوفی شیخ خلال مروزی آپ کے پاس پہنچے اور کہا۔ ”حضرت! میں سز کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اس کی اجازت مرحمت فرمائیں گے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”لیکن سز پر جانا ضروری کیوں ہے؟“ خلال مروزی نے جواب دیا۔ ”حضرت! اگر پانی رواں نہ رہے تو سیاہ پڑ جاتا ہے۔ اس سے تو آپ بھی واقف ہیں۔“ آپ نے فرمایا۔ ”پھر تم بحیرہ بن جاؤ کہ سیاہ بھی نہ پڑا اور رواں بھی رہو۔“ خلال مروزی سفر سے باز رہے اور ایک جگہ بیٹھ کے عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ شیر پھر حاضر ہو گیا اور آپ کے قریب ہی رہنے لگا۔

آپ سے پوچھا گیا۔ ”سب سے بڑا تکبر کون سا ہے؟“ آپ نے جواب دیا۔ ”کسی چیز کا دعویٰ کرنا اور یہ اتنا بڑا تکبر ہے کہ اس کو پہاڑ بھی برداشت کر سکا۔“ آپ نے 340 مطابق 951ھ وصال فرمایا اور اپنے زہد و ورع کی وجہ سے وہ شہرت حاصل کی کہ تاریخ اور تذکرہ میں ابوالخیر اشیع مشہور ہوئے۔ اس بیسویں صدی میں بھی صوفیائے کرام میں آپ نمایاں اور ممتاز نظر آتے ہیں۔

مضمون کے مآخذ

تذکرۃ اولیاء، شیخ فرید الدین عطار۔ نفحات الانس، مولانا عبدالرحمن جامی۔ روض الراحین، عمر یافعی ممی۔ تاریخ بغداد علامہ حنیف بغدادی۔ طبقات الاولیاء، علامہ عبدالوہاب الشعرانی

اس سے آپ رن پاؤں والے سر کے ساتھ آج کی سمت اشارہ کیا جہاں ایک گول جسامت کا آدمی سیاہ چٹوں اور نیب و جیکٹ میں ملبوس مائیک کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ آڈیو ریم میں موجود تمام لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”لیڈر دس منٹ میں یہاں ہوں گے۔“ اس نے کہا۔ ”کیا میرے پاس بس اتنا ہی وقت ہے؟“ یہ میرے بیٹے کی آواز تھی جو میرے ذہن میں گونجی۔ میں نے بے اختیار اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔ وہ کئی ہفتوں سے میرے

زندگی ایک ایسا قیمتی تحفہ ہے... جس کے مالک ہم نہیں ہوتے... یہ تحفہ تو ہمیں استعمال کرنے کے لیے دیا جاتا ہے مگر ہر انسان اس حقیقت کا ادراک نہیں رکھتا... وہ جو خود دیکش گروپ میں شامل کر دی گئی تھی مگر دل سے راضی نہیں تھی... کیونکہ وہ جینا چاہتی تھی... ہر لمحے سے خوشیاں کشید کرنا چاہتی تھی... اور اسی سوچ نے اسے ایک نئے عزم اور حوصلے سے جینے کی راہ دکھا دی۔

قبر کے اندھیروں میں گم ہو۔ نے سے پہلے آسمان کی دستوں

نئی اڑان

میں نئی اڑان بھرنے والی سینہ کا قصہ

سائ دانش



ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

| | | | | | |
|--------------|-------------------|--------------|------------------|--------------|-----------------|
| 0524568440 | سیالکوٹ | 03016215229 | گجرات | 03002680248 | کراچی |
| 03460397119 | میرپور AK | 03456892591 | وزیر آباد | 03004009578 | لاہور |
| 057210003 | انکسٹی | 03216203640 | لالہ موسیٰ | 03006301461 | ملتان |
| 03004854922 | دیپالپور | 03337472654 | خان پور | 03213060477 | حیدر آباد |
| 03002373988 | لیہ | 03325465062 | کوہاٹ | 03447475344 | سرگودھا |
| 03083360600 | قصبہ ڈنگہ | 03446804050 | ساہیوال | 03005930230 | پشاور |
| 03008758799 | عارف والا | 03006946782 | پاک پتن | 03337805247 | کوئٹہ |
| 03023844266 | لورالائی | 03469616224 | منظفر آباد | 03006698022 | فیصل آباد |
| 03016299433 | کوئٹہ ارب علی خان | 03347193958 | بوروالہ | 03005583938 | راولپنڈی |
| 03338303131 | جلاپور پیر والا | 03136844650 | دھاڑی | 03003223414 | نواب شاہ |
| 03321905703 | ہری پور | 03346712400 | تونسہ شریف | 03007452600 | صادق آباد |
| 03348761952 | چکوال | 03336481953 | ڈیرہ غازی خان | 03055872626 | رحیم یار خان |
| 03346383400 | دہوا | 03336320766 | بہاولنگر | 0622730455 | بہاولپور |
| 0307-6479946 | حافظ آباد | 03329776400 | بنوں شہر | 03316667828 | گوجرانوالہ |
| 0301-5497007 | واہ کینٹ | 03004719056 | رائے وند | 03235777931 | جہلم |
| 0992335847 | ایبٹ آباد | 03317400678 | ہڑپہ | 03008711949 | سیالکوٹ |
| 03454678832 | پتوکی | 03349738040 | ڈیرہ اسماعیل خان | 0477626420 | جٹنگ |
| 0333-5021421 | مانسہرہ | 03348761952 | چشتیاں | 03337979701 | بکھر |
| 03004992290 | کوٹ رادھا کشن | 0301-7681279 | مٹین آباد | 0331-7619788 | منڈی بہاؤ الدین |
| 0300-6575020 | قصور | 0333-8604306 | سمرو پال | 0300-9463975 | ڈسکہ |
| 0315-6565459 | ٹوبہ ٹیک سنگھ | 03006969881 | چجرہ شاہ متیم | | |

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز ٹریڈنگ ہاؤس اتھارٹی مین کوئی روڈ، کراچی فون 35895313

E-mail: jdpgroup@hotmail.com

میں نے آٹھویں چٹی کر لیں۔ مجھے یہ آواز نہیں سنی۔
میں ایک سپاہی ہوں۔ میرا ایک مشن ہے جسے پورا کرنا ہے۔
میں نے ایک بار پھر اپنے ذہن میں منصوبے کی
جزئیات دہرائیں۔ جب لیڈر آئے گا میں ان کو جوان
عورتوں کے گروپ میں شامل ہو جاؤں گی جو اسے بار
پہنانے کا انتظار کر رہی ہیں۔ جب میری باری آئے گی تو
اس کے گلے میں مالا ڈالوں گی۔ پھر جب میں اس کے
بیروں کو چھونے کے لیے نیچے جھکوں گی، میں اپنا ہاتھ اپنی
سازی کے اندر پھسلاؤں گی تاکہ اس دھماکا خیز مواد کو چالو
کر سکوں جسے آج نے میری کریم باندھ رکھا ہے۔

”اما تم مجھے اتنی آسانی سے کیسے مار سکتی ہو؟“
میرے بیٹے کی آواز کی لہریں میرے ذہن کے آر پار
ہورہی تھیں، میرے کانوں میں دھڑک رہی تھیں۔ میری
آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ لہرایا۔ اس کے باپ سوریا کا
چہرہ۔ جب اچ کا ہاتھ میرے کندھے پر آ پڑا۔
وہ میری طرف دیکھ رہا ہے لیکن اب اس کی آنکھیں ایک
کمانڈر کی طرح سخت اور سرد ہیں جو مشن کے سونے پر اندازہ
لگا رہی ہیں۔ وہ چپک کر رہا ہے کہ کہیں میں ڈگمگا تو نہیں رہی۔
میں کوئی کمزوری نہیں دکھا سکتی۔ اب نہیں، جب میں
کامیابی کے اسے قریب ہوں۔

”اپنے والدین کو یاد رکھنا۔“ اچ نے کہا۔
میری سانس تیز ہو گئی۔ وہ جانتا ہے کہ اس شخص
نے چودہ سال پہلے میرے والدین کو مار ڈالا تھا جب اس
نے ہمارے گاؤں کو تحریک کے سپاہیوں کو پناہ دینے کا سبق
سکھانے کے لیے اپنے سپاہی اور گن شپ بھیجے تھے۔
میں نے اپنے والدین کے چہرے یاد کرنے کی
کوشش کی مگر نہیں کر سکی۔ میں ان کا بدلہ لینے آئی تھی مگر مجھے
ان کی صورت تک یاد نہیں تھی۔

شروع شروع میں، میں ان کے چہروں کو اپنے ذہن
میں تصور کر سکتی تھی، اس تصویر سے جو مجھے دکھائی گئی تھی لیکن
اب وہ تصویر بھی جانے کہاں کھو گئی تھی۔

ابھی مجھے صرف سوریا کا چہرہ یاد تھا۔ نظر کے چشمے اور
پتلے بازوؤں اور ٹانگوں والا کمزور سا لڑکا۔ اسے سب نمبر
پانچ بلاتے تھے۔ میں بھی ایک طویل عرصے تک اسے اسی
نمبر سے پہچانتی رہی۔

کمپ میں سب کے نمبر تھے۔ اعلیٰ افسران کے لقب
تھے، سر، استاد، ڈاکٹر۔ نام لینے سے سختی سے منع کیا گیا تھا
مگر بچے..... انہیں نمبروں سے جانا جاتا تھا۔

”تم کتنے سال کی ہو؟“ اس نے پوچھا۔ یہ ایک
ذاتی سوال تھا۔
کمپ کا ایک اصول..... کبھی بھی ذاتیات میں نہ
اترو۔ ایک دوسرے کے بارے میں جتنا کم جانا جائے، اتنا
بہتر ہے۔ اس لیے ہم ایک دوسرے کے نام نہیں جانتے۔
وہ میرا لیڈر یا اچ ہے اور میں اس کے لیے ہر شے ہوں۔
”سترہ۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے اچھی سے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔
مجھے اس کی آنکھوں میں اداسی نظر آئی۔ وہی اداسی جو میں
آٹنی کی آنکھوں میں دیکھتی تھی۔ وہ بھی وقت سے پہلے
پوربھی ہو چکی تھیں۔ ان کا چہرہ خاستہ ہو گیا تھا۔

آٹنی میرے لیے ماں جیسی تھیں۔ مجھے اپنی حقیقی ماں
کی صورت بھی یاد نہیں۔ وہ میرے والد کے ساتھ اس وقت
باری تھیں جب میں تین سال کی تھی۔ چند دنوں بعد جب
مجھے کمپ میں لایا گیا تو آٹنی نے میری دیکھ بھال کی۔
بالکل ایسے ہی جیسے کہ کمپ میں موجود دوسرے لاوارث
بچوں کی کرتی تھیں۔ انواہ یہ تھی کہ اس نے اپنے شوہر اور
بچوں کو کھود یا تھا جب لیڈر کے آدمیوں نے اس کے گھر پر
حملہ کیا۔ کسی طرح وہ بچ نکلیں۔

جو اداسی اب میں اچ کی آنکھوں میں دیکھ رہی
ہوں، وہی اداسی اس کے چہرے پر پھیل جاتی جب وہ ہم
میں سے کسی کو دیکھتی۔

میرے بیٹے کی مٹھیاں میرے پیٹ کی دیواروں پر
دھڑکیں اور میں اپنے خیالوں سے چوکی۔

لیڈر ہر جگہ آڈیو ٹیم میں ٹی شرس اور پلے کارڈز پر
پرنٹ کی گئی تصویروں میں موجود تھا۔ اپنے ٹریڈ مارک سفید
گپڑوں میں بلبوں اور نمستے کے انداز میں اپنی ہتھیلیوں کو
ایک ساتھ جوڑے۔ اس کے لوگ اس کی شان میں نعرے
لگا رہے تھے اور میرے کانوں کے بالکل پاس اچ کے
ہونٹ ہلے۔

”تم جانتی ہو جہیں کیا کرنا ہے؟“
اس کی آواز مردہ تھی۔ میں نے اس کا چہرہ بخود دیکھا۔
میں پچھلے دو دنوں سے اس کے ساتھ تھی۔ میں نے سر ہلایا۔
اس نے لاتعداد بار مجھ سے یہ سوال پوچھا تھا۔ اس ڈر سے
نہیں کہ کہیں میں سب بھول تو نہیں گئی بلکہ یہ دیکھنے کے لیے
کہ جواب دیتے ہوئے میرے انداز میں کتنی شدت ہے۔
”میں آپ کے لیے کیا ہوں اما لفظ یا نمبر؟“ میرا
پتا پوچھ رہا تھا۔

ہم ریاست کے مختلف حصوں سے آئے تھے۔ ہمارے درمیان صرف ایک چیز مشترک تھی کہ لیڈر اور اس کے لوگ کسی نہ کسی طرح ہمارے پیغم ہونے کے ذمے دار تھے۔ بہت سے بچے جب کیپ پہنچے تو اتنے کمزور تھے کہ کھڑے بھی نہیں ہو پاتے تھے۔ سو یا بھی ان میں سے ایک تھا۔ ہر بار جب وہ بندوق اٹھاتا تو اس کے ہاتھ کاچنے دھماکوں سے اس کے سر میں درد ہوتا۔ دوسرے لڑکے اس پر ہنستے۔ ایک لڑکا خاصا عالم تھا۔ اس نے ایک دن یہاں تک کہہ دیا۔

”تم یہاں کی سب سے خوبصورت لڑکی ہو۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“

اور باقی بچے قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ ایک دن مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں اس لڑکے کے پاس گئی اور اس سے کہا کہ نمبر پانچ سے دوڑ ہو ورنہ میں استاد کو بتاؤں گی کہ تم نے میرے ساتھ بدگیزی کرنے کی کوشش کی ہے۔

پتا نہیں میرے منہ سے یہ الفاظ کیسے نکلے۔ میں اندر ہی اندر خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ لڑکا مجھ سے دگنی جسامت کا تھا۔ اگر وہ سبتی سکھانے کا ارادہ کرتا تو میری حالت خراب کر دیتا مگر حیرت انگیز طور پر وہ مجھے گھور کر وہاں سے چلا گیا۔ اس دن کے بعد سے سو ریا اور میں لازم و ملزوم ہو گئے۔ ہم کیپ کے روزمرہ کے معمولات میں ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ صبح کے وقت اسکول، جہاں ہم نے تحریک کی تاریخ، اس کے اہداف، اس کے ہیروز کے ساتھ ساتھ لیڈر اور اس کے ساتھیوں کے ہمارے لوگوں کے خلاف کیے جانے والے جرائم کے بارے میں سیکھتے۔ دوپہر اور شام میں ہم پریکٹس ریٹنگ میں ڈرل کرتے، مگر چلاتے اور بموں کو پھینکنے کا طریقہ سیکھتے۔ میں نے بندوقوں اور بموں سے سو ریا کی جتنی بھی مدد کی تھی، اس نے پڑھنے اور لکھنے میں میری مدد کی۔

جب ہم چودہ سال کے تھے، ایک دن اس نے مجھے اپنا اصل نام بتایا اور مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں اتنے عرصے سے ایک نمبر رہی تھی کہ مجھے یاد کرنے میں کچھ وقت لگا۔

”لویا۔“ میں نے آخر کار کہا۔

”لویا!“ اس نے دہرایا۔ ”کتنا خوبصورت نام ہے۔ کیا تم جانتی ہو کہ اس کا مطلب کیا ہے؟“

میں نے فی میں سر ہلایا۔

”لویا کا مطلب ہے ”نیا۔“ اس نے بتایا۔

میں نے کچھ نہیں کہا۔ میرے لیے میرا نام اس چیز کے

متبادل تھا جسے آپ کہیں رکھنے کے بعد قبول جاتے ہیں۔ ہجوم کے جوش میں اچانک اضافہ ہوا۔ لوگ سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے کی طرف بڑھنے لگے۔

”وہ آگیا۔“ انا نے کہا۔

وہ میرا بازو پکڑ کر مجھے وہاں لے گیا جہاں لڑکیوں کا ایک گروپ ملا ہوتا تھا۔ انتظار کر رہا تھا۔

آڈیٹوریم ”لیڈر زندہ باد“ کے نعروں سے گونجنے لگا۔ لوگ اسے قریب سے دیکھنے کے لیے کمرے اور موبائل فون اٹھائے انہیں میں دھکم پیل کر رہے تھے۔ انا کی گرفت میرے بازو پر مضبوط ہو گئی۔

”یاد رکھنا یہ ہمارے گاؤں کے لیے ہے۔“ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

وہ مجھ سے مادی زبان میں بات کرتا تھا حالانکہ شک سے بچنے کے لیے ہم صرف ہندی یا انگریزی بولتے تھے لیکن اس طرح شاید وہ مجھے یہ بتاتا تھا کہ وہ میرے گاؤں سے ہے اور میرے والدین کو بھی جانتا تھا۔

کاش وہ مجھے ان کے بارے میں بتاتا۔ وہ کس طرح کے تھے؟ وہ کیسے رہتے تھے؟ ان خالی جگہوں کو پُر کرتا جو میرے اندر پیدا ہو گئی تھیں۔ میں صرف اتنا جانتی تھی کہ ان کی موت کیسے ہوئی اور یہ کافی نہیں تھا۔

میرے سر ہلانے کے بعد وہ میرا بازو چھوڑ کر چلا گیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ آڈیٹوریم سے باہر نکل گیا۔ میں نے اپنی توجہ لیڈر پر کی۔ گیندے کے پھولوں سے پردہ مالا میرے ہاتھ میں تھی۔ میرے چاروں طرف ساڑیوں میں لمبوس لڑکیاں لیڈر سے ملاقات کے بارے میں جوش و خروش سے بول رہی تھیں مگر میں خاموش تھی۔ مجھے اپنے بازو اور ٹانگیں بھاری محسوس ہو رہی تھیں۔ خلق سوکھ رہا تھا۔

میرے بیٹے کی آواز اب مجھے اس شور و غل کے باوجود واضح سنائی دے رہی تھی۔ ”میں جینا چاہتا ہوں ماما!“

میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے مالا اور تھی سے پتلی۔ مجھے یہ آواز نہیں سنائی۔ کاش میں اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ سکتی مگر یہ وہ آواز نہیں تھی جو کان بند کر لینے سے بند ہو جاتی۔ یہ تو میرے اپنے وجود سے اٹھ رہی تھی، میرے دماغ میں گونج رہی تھی لیکن میں اس پر کان بھی نہیں دھرسکتی۔ اب جب میں اتنے قریب تھی۔ ابھی تک میں نے لیڈر کو صرف تصویروں اور فلموں میں دیکھا تھا جو انہوں نے کیپ میں ہمیں دکھائی تھیں۔ وہ میری توقع سے چھوٹا تھا۔ اس کے چلنے کا انداز بھی مختلف تھا۔ وہ مسکراہٹ جو تصویروں میں دکھائی دیتی تھی، اس وقت بھی

اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ شاید اس کی ٹانگوں میں درد تھا۔ اپنے جھکے ہوئے کندھوں اور جھریوں والے چہرے کے ساتھ وہ ایک سفاک اجتماعی قاتل سے زیادہ ایک بیمار واداک کی طرح نظر آ رہا تھا۔

مجھے یقین تھا جب وہ کیپ میں نہ ہوتا تو یقیناً چلنے پھرنے کے لیے چھڑی کا سہارا لیتا ہوگا لیکن یہاں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں اسے لیڈر بننا تھا۔

بخور کی خوشبو ہوا میں تیر رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون، لیڈر کی آرتی کرنے لگی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اسٹیل کی پلیٹ میں چلتی ہوئی بخور کی چھڑی، ایک لڈو اور چندن کے پیسے سے بھرا ایک چھوٹا سا گول کنٹینر اس کے چہرے کے سامنے چکر لگا رہا تھا۔ عورت نے اس کے ماتھے پر تک لگانے کے لیے صندل کی لکڑی کے پیسے میں انگلی ڈبوئی اور پھر پر ساد کے طور پر وہ لڈو پیش کیا۔

”پلیز، ماما! میں جینا چاہتا ہوں۔“ میرے بیٹے کا احتجاج پھر بلند ہوا۔ وہ مجھے اسی طرح لگتا تھا جیسے سو ریا نے کہا تھا، جب وہ اپنے مشن پر جانے سے ایک رات پہلے میرے پاس آیا تھا اور لرزتی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا کہ وہ ایک رات کے لیے سب بھولنا چاہتا ہے۔ یہ بھی کہ وہ کہاں ہے اور یہ بھی کہ صبح اس کے لیے کیا کر آنے والی ہے۔

وہ مجھے ان اداس بچوں میں سے ایک لگا جو شہر والے کیپ میں اپنی بیوہ باؤں کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ کیپ ان خواتین اور بچوں سے بھرا ہوا تھا جنہوں نے اپنے خاندان کے مردوں کو دی موومنٹ میں کھو دیا تھا۔ انہیں لیڈر کے سپاہیوں نے گولی مار دی تھی یا وہ اس کی کسی جیل میں سڑ رہے تھے یا پھر لڑ رہے تھے۔ جب ہم اپنی خاکی وردی میں گزرتے تو وہ جھانک جھانک کر ہمیں دیکھتے۔ جیسے ہم مشہور شخصیات ہوں۔ ہر روز ہمیں بتایا جاتا تھا کہ ہم بابرکت ہیں جنہیں خود خدا نے اپنے لوگوں کا بدلہ لینے کے لیے چنا ہے۔

میں اس وقت نہیں سمجھ پاتی کہ اس سے کیا کہوں۔ کیپ ہی واحد زندگی تھی جو میں نے اب تک جی بھی پھر میں نے کچھ نہیں کہا اور اسے خود سے قریب کر لیا۔ ہم ایک دوسرے کے بازوؤں میں تھے۔

رات کے کسی پہر میری آنکھ لگی اور صبح جب میں بیدار ہوئی تو وہ جاچکا تھا پھر کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اور رات کے آخر میں ایک نیا لڑکا نمبر پانچ کی حیثیت سے آچکا تھا۔

آرتی ختم ہو گئی تھی۔ لیڈر اب اس طرف آ رہا تھا

جہاں ہم تھے۔ لڑکیاں قطار بنائے کھڑی تھیں اور میں اس قطار کے سچ میں تھی۔

لیڈر پہلی لڑکی کے سامنے رکا۔ وہ اسے پار پھانے کے بعد اس کے پاؤں چھونے کے لیے نیچے جھکی۔ لیڈر نے اسے آئینہ وار دیا۔ وہ اٹھ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ اس کے آگے بڑھی۔

”مجھے جینا ہے۔“ یہ اب میرے بیٹے کی آواز نہیں، یہ میرے قتل کرکری زبان کی لوک پر آئی میری اپنی آواز تھی۔ ہاں مجھے جینا ہے۔ لیڈر ہوتی یہ آواز تب بھی خاموش نہیں ہوئی جب میرے آگے والی لڑکی میرے سامنے سے ہٹی اور میں لیڈر کے سامنے ہوئی۔

وہ مسکراتے ہوئے اپنے گلے میں میرے مالا ڈالنے کا انتظار کر رہا تھا لیکن میں جہاں تھی، وہیں رہی۔

اس نے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”چلو کوئی بات نہیں۔“ تب میں نے اس کے گلے میں مالا ڈالی پھر ہاتھ جوڑ کے ہنستے کیا۔

اس کی ہبوس اور پروکھٹیں۔ وہ حیران تھا کہ میں دوسری لڑکیوں کی طرح اس کے پاؤں چھونے کے لیے جھکی کیوں نہیں۔

لیکن اس نے جلد ہی خود پر قابو پایا۔ مسکراتے ہوئے اس نے میرے نچسے کا جواب دیا۔

میں جانے کے لیے چلتی۔ میں باہر نکلتا جا رہی تھی جلد از جلد۔ اس ہجوم میں اپنا راستہ بناتے ہوئے لوگ مجھے دھکیل رہے تھے۔ میں پتلی رہی۔ باہر آنے کے بعد میں نے رک کر گہری گہری سانس لیں اور اطراف میں دیکھا۔

میں ایک تنگ، دھول سے بھری گلی کے بچوں سچ کھڑی تھی جو ایک چوڑی سڑک سے مل رہی تھی۔

میں سڑک پر نکل آئی۔ دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں کافی لوگ تھے۔

کچھ نے پیاس سے گزرتے ہوئے مجھے دیکھا ابھی مگر مجھے اب کوئی پروا نہیں تھی۔ میری تمام تر حیات اب صرف اپنے بیٹے کی طرف متوجہ تھی جو اب خاموش تھا مگر میں اس کا سکون محسوس کر سکتی تھی۔

اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے میں آنکھیں بند کر کے مسکرائی۔ میں اب وہ تین سال کی روتی ہوئی بچی نہیں ہوں جس سے اس کے ماں باپ بچیں لیے گئے۔

میں اب خود ایک ماں ہوں۔

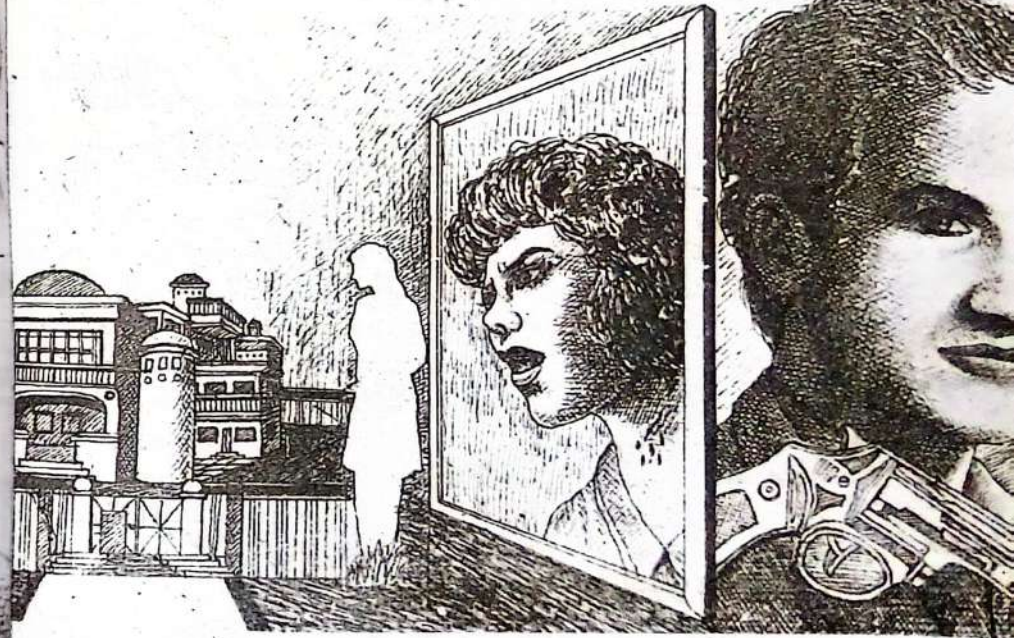
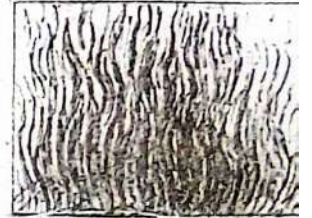
میں لویا ہوں۔

محبت کے زعمان میں قید ہونے والی ایک حاسد اور عاقبت
نااندیش حسینہ کی خطرناک کارروائیوں کی عبرت اثر داستان

آتشیں حصار

ایچ اقبال

ایک عجیب و غریب خواب کا حوالہ... جس میں نہ چہرے واضح تھے اور نہ ہی مقاصد کی کوئی وضاحت تھی... مگر احساسات کا ایسا سلسلہ تھا جو آنکھ کھلنے کے بعد بھی اپنے سحر سے آزاد نہ کر پاتا تھا... وہ اپنے تصور میں تراشے ہوئے جس پیکر کی اسیر تھی... ایک دن جب حقیقت بن کر سامنے آیا تو آنکھوں کی بے یقینی قابل دید تھی... وہ حسین چہرہ محبت کی ایک ایک بوند کو ترسا ہوا تھا... اسے احساس تک نہ ہوا کہ کسی نے اس کے دل میں چپکے سے گھر کر لیا... لیکن ایک تلخ سچائی سے بے خبر تھا کہ اس کی خوشیوں کے دشمن تو خود اس کی استین میں چھپے بیٹھے تھے... اور اس کے گرد ایک ایسا آتشیں حصار کھینچا ہوا تھا جو نہ تو اسے نکلنے دیتا تھا اور نہ ہی کسی اور کو اندر داخل ہونے دیتا تھا... لیکن آخر کب تک... کہتے ہیں سو دن ستار کے اور ایک دن لوہار کا... یہاں بھی جذبات کی سیاست میں سچ کی چیت ہو گئی... حسد کی آگ میں جلنے والے چلتے رہ گئے اور آخر میں محبت نے بازی مار لی... اور خواب کی دھندلی تصویر پوری جزئیات کے ساتھ واضح ہو گئی۔



ثانیہ ریٹنگ پر کہناں لگائے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی مسکراہٹ سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس کی سوچ میں کوئی نئی پہلو نہیں تھا۔ وہ سادہ سے گرم کمرے کے کپڑوں میں بیٹھی تھی۔ اس کی عمر چوبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ جس ریٹنگ سے کہناں لگائے ہوئے تھی، وہ ایک گرلز ہاسٹل کی راجداری میں تھی۔ اس کی نظریں سامنے سڑک پر تھیں جس پر برائے نام ٹریفک روڈاں دوڑاں تھیں۔ اس ہاسٹل میں اکثریت ان لڑکیوں کی تھی جو چھوٹے چھوٹے شہروں سے برفریبا تعلیم یہاں بٹھری ہوئی تھیں لیکن ثانیہ کا مسئلہ دوسرا تھا۔

اپنے خیالات سے وہ اس وقت چونکی جب اس کی روم میٹ شینہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ”کہناں کھوئی ہو۔ کیا رات کو پھر اپنے شہزادے کو خواب میں دیکھ لیا؟“

”آں!“ ثانیہ چونکنے کے بعد گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”ہاں شک! اور رات کا خواب پچھلے دنوں خوابوں سے مختلف تھا۔“

”وہ کیسے؟“

”وہ مجھے گھوڑے پر اپنے آگے بٹھائے ہوئے تھا اور گھوڑا بادلوں میں بیلندی کی طرف جا رہا تھا۔“

”یہ خواب تمہاری ایک عروسی کا نتیجہ ہے۔ ان خوابوں کو اپنے ذہن سے جھٹکو اور اپنی شادی کے لیے کسی شریف نوجوان کو پسند کر لو۔“

”میں کسی ایسے ہی انسان کی منتظر ہوں جو میرے خوابوں کے شہزادے جیسا ہو۔“

”اس کا چہرہ تو تم نے کسی خواب میں نہیں دیکھا؟“

”تم یہ بات دوبارہ کہہ چکی ہو اور میں بتا چکی ہوں کہ اس کا چہرہ ہلکی سی دھند میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔“

”کب تک اس کا انتظار کرو گی؟“ شینہ فیسی۔

”جب تک وہ مل نہیں جاتا۔“

”اگر نہ ملا؟“

”میرا دل کہتا ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن ضرور ملے گا۔“

”تم اس وقت تک بوڑھی بھی ہو سکتی ہو۔“

”اوہ!“ ثانیہ سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے چونکی۔

”میرا انور رکشا آ گیا۔“ وہ اسی انور رکشا پر ملازمت کی تلاش میں نکلا کرتی تھی۔

ثانیہ نے شینہ کا شانہ چپک کر کہا۔ ”میں کمرے سے اپنا شولڈر بیگ لے آؤں۔ میرا وی ایس اے میں پڑا ہوتا ہے۔“

”اور اس وی ایس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو تمہیں یہ اہم ملازمت دلا سکے۔“ شینہ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

”میں نے شارٹ ہینڈ کا کورس کیا ہے۔“

”ایک بہت بڑی کمپنی کے مالک کی سیکرٹری بننے کے لیے تجربہ بھی بہت ضروری ہوتا ہے اور تم نے بھی کوئی ملازمت نہیں کی ہے نہ کوئی تجربہ ہے۔“

”بھئی مرثیہ سیکرٹری بننے والی کو تجربہ نہیں ہوتا۔“ ثانیہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”جاؤ۔“ شینہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔ کامیاب لوگوں کی تو مجھے خوشی ہوگی۔“

ثانیہ نے اپنا شولڈر بیگ اٹھایا اور شینہ کو خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ شینہ اس کے ساتھ ہی رہی۔ ”موہاں لے لیا؟“

”وہ میں نے پہلے ہی بیگ میں ڈال لیا تھا۔“ ثانیہ نے سیزمی کی طرف قدم بڑھائے۔

اب شینہ نے اپنی جگہ رک کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ ثانیہ نے بھی ہاتھ ہلا دیا اور سیزمیاں اتر کر چھوٹے سے احاطے کو پار کرتی ہوئی انور رکشا کے قریب پہنچی اور اس میں بیٹھ گئی۔

”میڈم! آج کدھر چلنا ہے؟“ رکشا والے نے پوچھا۔

ثانیہ نے اسے وہ پتہ دے دیا جو اخبار کے اشتہار میں چھپا تھا۔

ملازمت ثانیہ کی کوئی بہت بڑی مجبوری نہیں تھی۔ اگر وہ بیرون ملک اپنی ماں کو فون کر دیتی تو اس کے سوتیلے باپ کو ثانیہ کی مطلوبہ رقم بھیجنے میں ذرا بھی تکلف نہ ہوتا۔ وہ سوتیلے ہونے کے باوجود ثانیہ کے لیے بہت شفیق تھا لیکن ثانیہ ہی نے اسے ذہنی اور فنی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ اس لیے جب وہ اس کی ماں کو لے کر بیرون ملک گیا تو ثانیہ ان کے ساتھ نہیں گئی۔ وہ دونوں جو بنگلہ ثانیہ کے لیے چھوڑ گئے تھے، وہ اس بنگلے میں بھی نہیں رہی تھی اور چھ ماہ سے اپنے اخراجات اس اکاؤنٹ سے پورے کر رہی تھی جو اس کے حقیقی باپ نے دنیا چھوڑنے سے پہلے اس کے نام سے کھلوا دیا تھا۔ اس اکاؤنٹ میں اب بھی اتنی رقم تھی کہ اگر اسے مزید ایک سال تک ملازمت نہ ملتی تو اسے اپنے اخراجات کے سلسلے میں کوئی فکر لاحق نہ ہوتی لیکن اسے امید تھی، بلکہ یقین تھا کہ وہ اس عرصے میں کوئی نہ کوئی اچھی

ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

پندرہ دن پہلے بھی جب وہ ایک انٹرویو کے لیے گئی تو شینہ نے اس سے کہا تھا کہ وہ جدید طرز کا کوئی اچھا لباس سلوائے لیکن ثانیہ نے اس کا مشورہ نہیں مانا تھا۔ وہ فطرتاً سادگی پسند تھی۔ ہمیشہ سفید یا گرم کرٹا اور پرنٹڈ جہر کے ساتھ سفید یا گرم کرٹا پہنا دیتی تھی۔

رکشا میں بیٹھی ہوئی وہ اپنے خواب کے بارے میں سوچتے ہوئے خیالات میں غرق تھی۔

وہ اپنے خیالات سے اس وقت چونکی جب رکشا ڈرائیور بولا۔ ”میڈم! یہی ہے نا وہ عمارت جس کا پتا آپ نے دیا تھا؟“

”ہاں۔“ ثانیہ رکشا سے اترتے ہوئے بولی۔

عمارت خوبصورت اور دو منزلہ تھی جس پر اس کا نام بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ”عماد انٹر پرائز“

ثانیہ متعدد بار اس عمارت کے سامنے سے گزری تھی اور اسے کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ کسی دن اسے ملازمت کے سلسلے میں اس عمارت میں جانا ہوگا۔ وہ عمارت میں داخل ہو کر ریسپشن پر گئی جہاں پختہ عمر کی ایک عورت ساڑی باندھے اور ماتھے پر تھک لگائے بیٹھی تھی۔ ثانیہ کے اندازے کے مطابق وہ ہندو ہو سکتی تھی۔

”جی؟“ وہ ثانیہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

”میں ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو دینے آئی ہوں۔“ ثانیہ نے کہا۔

”ایک اشتہار پچھلے ہفتے چھپا تھا۔ اگر آپ اسی سلسلے میں آئی ہیں تو میں آپ کو جرنل منیجر کے کمرے میں بھجوا دیتی ہوں۔“ اس نے ٹھنڈی بھائی۔

”جی نہیں۔“ ثانیہ نے جلدی سے کہا۔ ”میں اس اشتہار کے سلسلے میں آئی ہوں جو آج شائع ہوا ہے۔“

ایک نو عمر لڑکا قریب آ کر ریسپشن سے بولا۔ ”نہیں میڈم!“

ریسپشن نے ثانیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، وہ..... تو پھر آپ کا انٹرویو صاحب خود لیں گے۔ اپنی سیکرٹری کا انتخاب وہ خود کرتے ہیں۔“ پھر وہ لڑکے سے بولی۔ ”انہیں صاحب کے کمرے کے باہر جو کمرے، وہاں پہنچا دو۔“

ثانیہ بولی۔ ”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ صاحب سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”اس ادارے کے مالک۔“ ریسپشن نے ثانیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”عماد مالک صاحب۔“

”جی۔“ ثانیہ نے لڑکے کی طرف دیکھا۔

”آئیے۔“ لڑکے نے اس سے کہا۔

ثانیہ اس کے ساتھ چل پڑی۔ لڑکا اسے ایک لفٹ کے پاس لے گیا۔

”اس عمارت کی ایک ہی منزل ہے؟“

”جی ہم صاحب!“

”ایک منزل کے لیے لفٹ؟“

”یہ تو صاحب کی مرضی ہے۔“ لڑکے نے لفٹ کا بٹن دبا دیا۔

”بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔“ ثانیہ نے دلی بی دل میں کہا۔ لفٹ کا دروازہ کھل گیا۔

”چلیے۔“ لڑکے نے کہا۔

ثانیہ لفٹ میں داخل ہوئی۔ لڑکا بھی لفٹ میں آ گیا۔ اس نے ایک بٹن دبا دیا۔ لفٹ حرکت میں آ کر اوپر کی طرف اٹھی اور جلد ہی رک گئی۔

”آئیے۔“ لڑکے نے لفٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

ثانیہ اس کے ساتھ لفٹ سے نکلی۔ ایک مختصر راہداری طے کر کے لڑکا جس کمرے میں داخل ہوا، وہ دفتر کی کمرہ معلوم ہوتا تھا لیکن وہاں میز کے پیچھے کی کرسی خالی تھی۔ میز کے سامنے چکر کرسیاں تھیں جن میں سے تین کرسیوں پر تین لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک تو بھدے ہنس و نگار کی مالک تھی لیکن خوب بن نہیں کر آئی تھی۔ باقی دو لڑکیوں میں سے ایک خوبصورت اور دوسری قبول صورت تھیں۔ وہ دونوں ہی فشن ایڈیٹل لباس میں تھیں۔ میک اپ انہوں نے بھی کیا ہوا تھا۔

”میں بیٹھی۔“ لڑکے نے ثانیہ سے کہا۔ ”اور انتظار کیجیے۔“

ثانیہ سر ہلا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خیال کے مطابق باقی لڑکیاں بھی انٹرویو ہی کے لیے آئی ہوں گی۔ تینوں خاموشی سے ثانیہ کی طرف دیکھنے لگیں۔ ثانیہ نے گھڑی دیکھی۔ ٹھیک گیارہ بجے تھے۔ اشتہار میں انٹرویو کے لیے یہی وقت دیا گیا تھا۔ اندرونی دروازہ کھول کر ایک ادنیٰ عمر عورت باہر آئی۔ اس نے چاروں لڑکیوں پر اچھتی سی نظر ڈالی اور پھر ثانیہ کے قریب رک گئی۔

”انٹرویو؟“ اس نے پوچھا۔

”جی۔“

”تمہارا وی ایس؟“

ثانیہ نے اپنا وی ایس نکال کر عورت کو دے دیا۔ عورت سی وی ایس لے کر پھر کمرے میں چلی گئی اور بہ مشکل ایک

منٹ بعد واپس آ کر خوبصورت لڑکی سے بولی۔ "تم اندر جا سکتی ہو۔" پھر وہ خود آفس چیر پر جا بیٹھی۔ "جوب سے پہلے آیا ہے، پہلے اسی کا انٹرویو ہوگا۔"

ثانیہ کو خیال آیا کہ اس کا نمبر ان تینوں کے بعد آئے گا۔ "لیکن میں تو ٹھیک وقت پر آئی ہوں مجھ سے؟" ثانیہ نے کہا۔ "اشتراک میں گیارہ بجے کا وقت دیا گیا تھا۔ میں یہاں آ کر جب اس کرسی پر بیٹھی ہوں تو ٹھیک گیارہ بجے تھے۔"

"میں صاحب کی ہدایت پر عمل کر رہی ہوں۔"

عورت نے جواب دیا اور ایک فائل دیکھنے لگی۔ ثانیہ نے مزید کچھ بولنا فضول سمجھا۔

خوبصورت لڑکی دس منٹ بعد باہر آئی۔ اس کے چہرے سے اندازہ لگا نا مشکل تھا کہ وہ انٹرویو میں کامیاب رہی تھی یا نا کام۔ وہ عورت سے بولی۔

"صاحب نے کہا ہے کہ کل میں آپ کو فون کر لوں۔ نتیجے سے آگاہ کرو یا جانے گا۔ آپ اپنا نمبر مجھے دے دیجیے۔"

اسے فون نمبر دے دیا گیا۔ وہ کمرے سے چلی گئی۔

"اب تم جاؤ۔" اس نے بعد سے نقش و نگار والی سے کہا۔ وہ بڑی خوشی سے اٹھی اور اندر چلی گئی۔ اس کی واپسی دو منٹ بعد ہی ہوئی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

"سنو۔" عورت نے اسے مخاطب کیا۔ "صاحب نے تم سے کیا کہا ہے؟"

"مجھے جزل نیچر صاحب کے پاس بھیجا ہے۔"

عورت سر ہلا کر وہ گئی پھر تیسری لڑکی سے بولی۔

"اب تم اندر جا سکتی ہو۔"

ثانیہ سوچ رہی تھی کہ بعد سے نقش و نگار والی لڑکی کے انٹرویو میں دو منٹ ہی کیوں لگے اور اسے جزل نیچر کے پاس کیوں بھیج دیا گیا؟

تیسری لڑکی کو بھی دس منٹ ہی لگے۔ باہر آ کر اس نے عورت سے اس کا فون نمبر لیا اور چلی گئی۔

"اب تم اندر جا سکتی ہو۔" ثانیہ سے کہا گیا۔

جب وہ اندرونی کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے دل کی دھڑکنیں خفیف سی تھیں۔ خاصا وسیع و عریض کمرہ تھا۔ میز پر خاصی بڑی سی جیس کے پیچھے کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کی پشت ثانیہ کی طرف تھی۔ وہ دیوار پر لٹی ہوئی ایک چھوٹی سی پینٹنگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" نرم لہجے کی آواز کمرے میں ابھری۔ ثانیہ آہستہ سے بیٹھ گئی۔

"تو تمہارا نام ثانیہ ہے؟" آواز پھر ابھری۔

"جی سر۔"

"اس نام کے آگے کوئی نام؟"

"عابدی؟" ثانیہ نے جواب دیا۔ "ثانیہ عابدی ہوں میں۔"

ریو الونگ چیئر گھڑی۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کا چہرہ سامنے آ گیا۔ وہ عماد سالک ہی ہو سکتا تھا جو بند گلے کا سرخس کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کوئی چیز اس کے کوٹ کی جیب میں تھی جس سے ٹسک سنہری زنجیر اس کے کوٹ کے ایک ٹخن میں اٹکی ہوئی تھی۔ بال بہت سلیقے سے بٹے ہوئے تھے۔ آنکھیں سیاہ اور غیر معمولی طور پر بڑی بڑی تھیں۔ ناک ستواں اور ہونٹ پتلے تھے۔ ٹھوڑی میں گڑھا تھا۔

وہ جیسے ہی مڑا، ثانیہ کے ذہن کو جھٹکا سا لگا اور جسم خفیف سا لرز گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر عماد کے چہرے پر دھند ہوتی تو وہ اس کے خوابوں کا شہزادہ نظر آتا۔

"یہ عابدی کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

ثانیہ گنگ ہو کر رہ گئی۔ وہ عماد کی آنکھوں کی ہلکی سی سرخی میں کچھ محسوس کر رہی تھی۔

"سنا نہیں تم نے؟" عماد نے میز پر ہلکا سا گھونسا مارا۔

ثانیہ چونک گئی۔ "جی سر۔"

"یہ عابدی کون ہے؟" اس نے سوال دہرایا۔

"میرے والد۔" ثانیہ نے محسوس کیا کہ اس کی آواز طلق میں اٹک رہی تھی۔

"کہاں رہتی ہو؟"

ثانیہ نے ہائل کا نام بتا دیا۔

"ہوں۔۔۔۔۔ والد کے ساتھ نہیں رہتی؟"

"وہ اب اس دنیا میں نہیں۔" ثانیہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"اوہ۔۔۔۔۔ سیڈ!" اس نے کہا اور کرسی سے اٹھ کر ٹھٹھا ہوا کمرے کے ایک گوشے کی کارنس کے قریب جا رکا۔ وہاں ایک ایئر ٹریے اور سگار باکس رکھا ہوا تھا۔ اس نے سگار نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور پھر اپنی جبین اس طرح ٹٹولنے لگا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔

ثانیہ کی نظر اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اس کے ٹٹولنے میں بھی تحنیت تھی جیسے وہ واقعی شہزادہ ہو۔

"شاید میں اپنا لائسنس میز پر بھول گیا ہوں۔" وہ بولا۔

ثانیہ نے میز پر نظر دوڑائی۔ اس کا سی دی ایک پیپر ویٹ کے نیچے تھا۔ اس کے ایک سرے سے لائسنس جمنا تک رہا تھا۔

"جی ہاں، سر!" ثانیہ نے کہا اور اٹھ کر لائسنس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"مجھے دے دو۔" وہ بولا۔

ثانیہ لائسنس اٹھا کر اس کی طرف بڑھی تو اسے اپنے پیچ بہت بھاری لگے۔ اس نے عماد کے قریب جا کر لائسنس کی طرف بڑھایا۔ عماد نے اس سے لائسنس لے کر سگار سلکا یا اور ایک گہرا آکس لے کر بولا۔ "میز پر پڑا ہوا اپنا سی دی اٹھا لو۔"

"وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ سر!۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ انٹرویو!"

"میں نے کیا کہا ہے تم سے؟" وہ مہر دیکھ میں بولا۔

"او۔۔۔۔۔ اوکے سر!" ثانیہ اس مرتبہ تیر کی طرح میز کی طرف گئی اور اپنا سی دی اٹھا لیا۔

"اب تم جاؤ۔" وہ بولا۔

ثانیہ کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ وہ مسرور کر دی گئی تھی۔

"جزل نیچر کا کمرہ گراؤنڈ فلور پر ہے۔" وہ ڈراما سا رک کر بولا۔ "جا کر اس سے مل لو۔"

ثانیہ کے جسم میں کچھ جان آئی۔

"اب کھڑی کیا ہو۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔ "جاؤ۔"

"جی سر!" ثانیہ دوڑا نئے کی طرف بڑھی تو اس کے قدموں میں ہلکی سی ڈگمگاہٹ تھی۔

بیرونی کمرے میں پہنچ کر اس نے وہاں بیٹھی ہوئی عورت پر اپنی جیسی نظر بھی نہیں ڈالی۔ ایسا محسوس کیا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے ہوش و حواس کو بیٹھی تھی۔ وہ کمرے سے نکل کر لفٹ کی طرف گئی۔ گراؤنڈ فلور پر اسے علم نہیں تھا کہ جزل نیچر کا کمرہ کہاں ہے۔ اسے ایک بار پھر ریپشنسٹ کی طرف رخ کرنا پڑا۔ ریپشنسٹ نے ٹھنکی بجائی۔ ثانیہ نے اس سے کہا۔ "مجھے۔۔۔۔۔"

چراغ کے جن کی طرح وہی لڑکا پھر آ گیا جس نے ثانیہ کو انٹرویو کے لیے اوپر پہنچایا تھا۔ ریپشنسٹ نے ثانیہ کی طرف توجہ دیے بغیر اس لڑکے سے کہا۔ "انہیں جزل نیچر صاحب کے کمرے تک پہنچا دو۔"

ثانیہ نے انٹرکام پر نظر ڈالی اور سمجھ گئی کہ ریپشنسٹ کو عماد سے کیا ہدایت ملی ہوگی۔ لڑکے نے اسے جزل نیچر کے کمرے میں پہنچا دیا۔

"بیٹھو۔" جزل نیچر نے اس کا نام پوچھے بغیر کہا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ ثانیہ بیٹھ گئی۔ اسے وہ بعد سے نقش و نگار کی لڑکی وہاں نظر نہیں آئی۔ ادھیڑ عمر شخص ایک فائل پر کچھ لکھنے لگا۔ ثانیہ اس لڑکی کے بارے میں ضرور پوچھتی۔

دس منٹ بعد جزل نیچر نے قلم بند کر کے فائل ایک

طرف سرکادی اور ثانیہ کی طرف دیکھا۔ "ابھی ہدایت ملی تھی صاحب سے۔" پمپٹ ٹائپ کر رہا ہوگا۔ ابھی آجائے گا۔"

"کیا ٹائپ کر رہا ہے سر؟" ثانیہ نے پوچھا۔

"صاحب سے کیا ہدایت ملی ہے آپ کو؟"

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔ ذرا انتظار کرو۔" جزل نیچر نے کہا اور دوسری فائل اٹھا کر کچھ پڑھنے لگا۔

ثانیہ کا ذہن الجھ گیا۔ کیا ٹائپ کیا جا رہا ہوگا؟

پانچ منٹ اور گزرے تھے کہ ایک شخص ہاتھ میں ایک کاغذ لیے ہوئے وہاں آیا اور جزل نیچر کے حوالے کر دیا۔ جزل نیچر نے کاغذ پر ٹائپ خرم پر ایک ٹھہر ڈالی پھر آنے والے شخص کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلا گیا۔ جزل نیچر نے قلم کھول کر کاغذ پر دستخط کیے اور پھر وہ کاغذ ثانیہ کی طرف بڑھا دیا۔

کاغذ کی تحریر پر نظر پڑتے ہی ثانیہ تقریباً آجکل پڑی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہاتھ میں اس کا اپنا لفٹ لیٹر ہے۔

"پرسوں کے ٹوپیے ڈیوٹی پر آ جانا۔" جزل نیچر نے کہا۔ "تمہارا کمرہ وہی ہوگا جہاں بیٹھ کر تم نے انٹرویو کے لیے انتظار کیا تھا۔"

"اٹل۔۔۔۔۔ سر!۔۔۔۔۔ امیر لائٹرو پتو لیا ہی نہیں گیا۔"

"یہ میں نہیں جانتا۔" جزل نیچر نے کہا۔ "صاحب نے مجھ سے انٹرکام پر صرف اتنا کہا تھا کہ ثانیہ نام کی ایک لڑکی کو بھیج رہا ہوں۔ اسے میری ٹیکسٹ کی حیثیت سے اپنا لفٹ لیٹر دے دو اور پرسوں سے بلا لو۔"

اب ثانیہ کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ وہ حیران بھی تھی کہ اسے انٹرویو کے بغیر منتخب کر لیا گیا تھا۔

جزل نیچر پھر بولا۔ "صاحب کل دفتر نہیں آئیں گے اس لیے تمہیں پرسوں بلایا ہے میں نے۔ اب تم جا سکتی ہو۔"

"شکریہ سر!" ثانیہ کھڑی ہوئی۔ وہ کمرے سے اور پھر عمارت سے اس طرح نکلی جیسے ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔

اپنا لفٹ لیٹر اس کے ہاتھ میں تھا جو اس نے رکشا میں بیٹھنے کے بعد اپنے شولڈر بیگ میں رکھا لیا۔

"جی ایم صاحب!" رکشا والے نے سرگھما کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"واپس ہاتھ مل۔" ثانیہ نے کہا۔ "اب اور کب نہیں جانا۔"

لائسنس کے سلسلے میں وہ رکشا والے کو ٹی جگہ لے جایا کرتی تھی لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

ہاتھ مل پر اتر کر اس نے رکشا والے سے کہا۔ "پرسوں

صبح ساڑھے آٹھ بجے آجانا۔ اب روزانہ اسی وقت آنا ہوگا۔“
اس نے رکشہ والے کو کرائے سے دے دیے۔ وہ بہت خوش تھی۔ ایک تو ملازمت مل گئی تھی اور پھر اسے اپنے خوابوں کا شہزادہ بھی نظر آ گیا تھا۔ وہ ادھر اپنے کمرے میں پہنچی تو وہاں شینہ بستر پر لیٹی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ شینہ کو دیکھ کر وہ جلدی سے اُٹھی۔
”آج تم کاج نہیں گئیں؟“ شینہ نے پوچھا۔
”تم انٹرویو کے لیے گئی تھیں نا، میں بے چینی سے یہ سننے کا انتظار کر رہی تھی کہ تم واپس آ کر کیا بتاتی ہو۔“
”مل گیا۔“ شینہ نے اس سے لپٹے ہوئے کہا۔
”کون مل گیا؟“ شینہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”میں ملازمت کے بارے میں جانتا چاہتی ہوں اور تم کہہ رہی ہو مل گیا۔“
”ملازمت بھی مل گئی۔“ شینہ نے سینڈ بیگ سے اپنا سینٹ لیٹر نکال کر شینہ کو دکھایا۔
”مبارک ہو۔“ شینہ نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”لیکن یہ ملاکون ہے؟“
شینہ ایک بیک بنچیدہ ہوئی اور بولی۔ ”یہ میں نے غلط کہا کہ مل گیا۔ مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ نظر آ گیا۔“
”اچھا۔“ شینہ ہنسی۔ ”کہاں نظر آ گیا؟“
”جس نے مجھے اپنی سیکرٹری بنایا ہے۔“
”اوہ۔۔۔ یعنی اس ادارے کا مالک؟“
”ہاں۔“ شینہ نے اپنا بیگ ایک طرف اچھال دیا اور بستر پر لیٹ گئی۔
شینہ اس کے قریب پہنچ کر بولی۔ ”چلو تمہارے خواب کا ایک حصہ تو مکمل ہوا لیکن تم نے اسے پہچانا کیسے؟ خواب میں تو تمہیں اس کے چہرے پر دھند نظر آتی ہے۔“
”اے دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ اگر اس کے چہرے پر دھند ہوتی تو وہ مجھے اپنے خوابوں کا شہزادہ ہی معلوم ہوتا۔“
”واہ۔“ شینہ ہنسی۔ ”یہ بھی خوب رہی۔“
”بس! میرے دل نے کہا کہ یہی ہے میرے خوابوں کا شہزادہ لیکن میری مل گیا والی بات غلط تھی۔ وہ بس نظر آیا ہے۔ مجھے ملا کہاں ہے اور شاید طے گا بھی نہیں۔“ شینہ کچھ اداس ہوئی۔
”کیوں؟“ شینہ نے پوچھا۔
”ارے کہاں میں اور کہاں وہ، ارب بچی۔“
”خواب کا ایک حصہ تو پورا ہوا۔“ شینہ نے کہا پھر شاید شینہ کا دل رکھنے کے لیے بولی۔ ”دوسرا حصہ بھی پورا

ہو سکتا ہے۔ انٹرویو کو بس نوعیت کا تھا؟“
”انٹرویو تو ہوا ہی نہیں۔“
”کیا مطلب؟“
شینہ نے من و عن سارا واقعہ دہرایا۔ اس کا زور اس پر رہا کہ وہ لائٹر دے عدا کی طرف گئی تھی اور اپنا سی وی اٹھانے کے لیے میز کی طرف رخ کیا تھا۔
”یہ کیا بات ہوئی؟“ شینہ نے تعجب سے کہا۔
”بات یہ ہوئی کہ۔۔۔۔۔“ شینہ کہتے کہتے ہنس پڑی۔
”کوئی ہنسے کی بات بھی ہے؟“
”تمہارے سوال کے جواب میں جو جملہ فوری طور پر میرے ذہن میں آ گیا تھا، اس پر ہنسی ہوں۔ کچھ آکر ڈسٹا جملہ ہے۔ انٹرویو میرا نہیں، میرے سہرا کا لیا گیا تھا۔ جب میں اس کی طرف گئی تھی تو میں کچھ زور سے اس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی لیکن مجھے ایسا لگا تھا کہ وہ غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور جب میں میز کی طرف چلی گئی تو اس کی آنکھیں مجھے اپنے جسم میں جم چکی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔“
”پھر تو وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہوگا۔“
”میرے خیال میں تم سچ نتیجہ اخذ نہیں کر رہی ہو۔ مرد کی نگاہیں فوراً سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں ہوس لپٹی نہیں تھی۔“
”پھر وہ کیا دیکھ رہا تھا؟“
شینہ رک کر سوچتے ہوئے بولی۔ ”یہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا لیکن یہ بات طے ہے کہ اس کی نگاہوں میں ہوس نہیں تھی۔“
”اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے۔“
شینہ کے موبائل کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ اسکرین پر ایک اجنبی نمبر تھا۔
”نہ جانے کون ہے۔“ اس نے بڑبڑا کر کال ریسیو کی۔ ”شینہ اسپیکنگ۔“
”جنرل فیجر آف عدا انٹر پرائز!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔
”سرا!“ شینہ جلدی سے بولی۔ اپنا موبائل نمبر اس نے درخواست میں لکھا تھا۔
”میں تم سے ایک بات کہنا بھول گیا۔“ جنرل فیجر نے کہا۔ ”پرسوں جب تم اپنی ڈیوٹی پر آؤ تو اپنے کمرے میں جانے سے پہلے مجھے رپورٹ کر دو گی۔“
”اوکے سرا!“
دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

”عماد کا فون تھا؟“ شینہ نے پوچھا۔
”ارے نہیں، جنرل فیجر تھا۔“ شینہ نے اصل بات بتا دی۔
”تو اب اس خوشی میں پارٹی تو ہونی چاہیے۔“
”ضرور ہوگی۔“
شینہ نے جبکہ کر شینہ کے گال کا بوسہ لیا۔
☆☆☆
ایک دن چھوڑ کر شینہ عدا انٹر پرائز پہنچی اور فوری طور پر جنرل فیجر کے کمرے کا رخ کیا۔
”گڈ!“ جنرل فیجر نے گھڑی پر نظر ڈال کر شینہ کی طرف دیکھا۔ ”وقت کی بہت پابند معلوم ہوئی ہو۔“
”میں اس کا خیال رکھتی ہوں سرا۔“
”اوکے۔“
شینہ اس کمرے میں پہنچی جہاں انٹرویو والے دن بیٹھی تھی۔ بیٹھی ہی تھی کہ انٹرکام کا بزر بج اٹھا۔ شینہ نے ریسور اٹھا لیا۔ دوسری طرف عدا تھا۔
”میں فونج کر پانچ منٹ پر دفتر آ جاتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”وقت کے سلسلے میں ابھی جنرل فیجر نے تمہاری تعریف کی ہے۔“
”میں ان کا شکر یہ ادا کروں گی سرا۔“
”تمہارے سامنے ایک فائل پڑی ہوگی جس پر میٹنگ لکھا ہے۔ دیکھ کر بتاؤ آج کی سے میری ملاقات ہے یا نہیں۔“
”میں ابھی بتاتی ہوں سرا!“ شینہ نے سامنے پڑی ہوئی فائل اپنی طرف کرتے ہوئے اسے کھولا۔ ”نہیں سرا!“
وہ چند سیکنڈ کے توقف سے بولی۔ ”آج آپ کی کوئی طے شدہ ملاقات نہیں ہے۔“
”میرا بھی یہی خیال تھا۔ تمہارے شیف میں جو فائلیں ہیں، ان کا جائزہ لے لو۔ تمہیں اپنی کرسی کے فرائض کا علم ہو جائے گا۔“
شینہ جواب میں ”بہتر ہے سرا“ کہنا چاہتی تھی لیکن دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کیا جا چکا تھا۔
شینہ نے ایک طویل سانس لے کر ریسور رکھ دیا۔ اس کی خواہش تھی کہ عدا سے فوری طور پر کسی کام کے لیے اپنے کمرے میں بلائے لیکن ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا۔
شینہ نے تمام فائلوں پر اچھی سی نظر ڈالی پھر پانچ فائلیں نکال کر اپنے سامنے رکھ لیں۔ یہ عدا کی پانچ سیکرٹریز کے انٹرویوز کی فائلیں تھیں۔ انٹرویو کا ایک ایک جملہ لکھا ہوا تھا اور آخر میں عدا کی سینڈ رائٹنگ میں ریمارکس بھی لکھے

تھے۔ ریمارکس کے نیچے عدا کے دستخط بھی تھے۔
عماد انٹر پرائز کا قلم ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ دو سال میں پانچ سیکرٹریز رکھی جا چکی تھیں۔ شینہ پہلی تھی جس کی فائل فی الحال وہاں نہیں تھی۔
”شاید تیار ہو رہی ہو۔“ شینہ نے سوچا۔ لیکن اس میں کیا لکھا جائے گا؟ انٹرویو تو ہوا ہی نہیں تھا جبکہ ان فائلوں میں صرف انٹرویو ہی کے جملے لکھے ہوئے تھے۔
تمام فائلوں پر اچھی سی نگاہ ڈالنے کے بعد شینہ نے پہلی سیکرٹری کا انٹرویو پڑھنا شروع کیا۔ وہ ایک عام سا انٹرویو تھا۔ آخر میں عدا کا مختصر نوٹ تھا۔ ”سیکرٹری کی حیثیت سے مناسب لڑکی ہے۔“
پھر چھ ماہ بعد کی تاریخ کے نوٹ سے شینہ کو معلوم ہوا کہ وہ ایک انٹرنٹ میں ہلاک ہو گئی تھی۔ اس پر عدا نے انسوس کا اظہار کیا تھا۔
اب شینہ نے دوسری فائل کھولی۔ ہر فائل پر نمبر بڑے ہوئے تھے۔ دوسری فائل کا انٹرویو بھی عام قسم کا تھا لیکن آخر کے چند جملوں نے شینہ کو چونکا دیا۔
انٹرویو دینے والی نے کہا تھا۔ ”سرا! آپ اجازت دیں تو ایک بات پوچھوں؟“
”کیا میرا انٹرویو ہو گیا؟“
”نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں سرا! میں یہ جسارت کیسے کر سکتی ہوں۔ یونہی بس ایک خیال آ گیا۔“
”پوچھو۔“
”آپ کے پیچھے دیوار پر جو پینٹنگ ہے، یہ تجریذی ہے۔ مجھے تجریذی آرٹ سے دلچسپی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس پینٹنگ میں جگہ جگہ ایک نام لکھا گیا ہے۔“ شائلی!“
”گیٹ آؤٹ۔“
”سرا! میں۔۔۔“
”آئی سے گیٹ آؤٹ۔ تم اس قائل نہیں ہو کہ میں تمہیں اپنی سیکرٹری بناؤں۔“
اس جملے کے بعد عدا کے ریمارکس تھے۔
”اس لڑکی کو میں سیکرٹری کیسے رکھ سکتا ہوں جو شائلی کے بارے میں پوچھے۔“
شینہ کا دماغ چکر اُٹھا۔ آخر اس نام میں ایسی کیا بات تھی کہ عدا کا پارہ یکا یک چڑھ گیا۔ نام نہ جانے کس کا تھا۔
بظاہر شائلی کی لڑکی کا۔۔۔۔۔ شائلی کی اور چیز کا۔
شینہ نے اپنی بیٹھائی سلتے ہوئے فائل بند کر دی۔ اپنے بیجان پر قابو پانے میں اسے دس پندرہ منٹ لگے پھر

انسانی جسم کی کابینہ

دماغ..... وزیر اعظم
سر..... وزیر تعلیم
کان..... وزیر ذاک و تار
معدہ..... وزیر خوراک
دل..... وزیر مالیات
ہاتھ..... وزیر محنت
ناک..... وزیر صحت
دانت..... وزیر تعمیرات
آنکھیں..... وزیر قانون
جلد..... وزیر دفاع
ٹانگیں..... وزیر مواصلات
زبان..... وزیر نشریات
سام..... وزیر داخلہ
انتخاب..... ریاض بٹ، حسن ابدال

فیصد سے زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ ایک تو عمارت اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا، دوسرے اسے پہلے ہی دن کئی غیر معمولی مشاہدات ہوئے تھے۔

شانی..... ایک پر اسرار نام۔
عماد کی غیر معمولی اداسی۔
عماد کے دو عجیب جملے۔
دفتر کا وقت ساڑھے چار بجے تک تھا۔ اسی وقت عمار اپنے کمرے سے نکلا۔ ثانیہ احتراماً کھڑی ہو گئی۔ عمار اپنے مخصوص برقعہ کیلئے انداز میں چلا ہوا باہر نکل گیا۔ ثانیہ کچھ افسردہ ہوئی کہ جاتے وقت عمار نے اس پر ایک اچھی سی نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔

خوابوں کا شہزادہ ایسا ہی ہوسکا ہے۔ اس کے دل نے کہا۔

☆☆☆

دفتر سے ہاسٹل پہنچنے تک وہ خیالات میں ڈوبی رہی۔

ثانیہ کمرے میں موجود تھی۔

”پہلا دن کیسے گزر رہا ہے؟“ اس کا پہلا سوال تھا۔

”اگر میں اسے غیر معمولی کہوں تو غلط نہ ہوگا۔“ ثانیہ ایک کرسی پر اس طرح بیٹھی جیسے ڈیر ہو گئی ہو۔

”تمہاری ہونٹیں نظر آرہی ہیں۔ کیا بہت زیادہ کام تھا جسے تم

کے تاثرات تھے۔ کیا ایک وہ بولا۔ ”نفرت ہے مجھے تم سے۔“ مرنا ہی چاہیے تھا تمہیں۔“

”جی سر!“ ثانیہ چونک پڑی۔

اس کے بولنے کی وجہ سے عمار بھی اس طرح چونکا جیسے کسی نے اسے پن چھو دی ہو۔

”آخری جملہ کیا لکھا تھا؟“ اس نے پوچھا۔

ثانیہ نے جو لکھا تھا، وہ دہرایا۔

عمار نے سر ہلایا اور آگے بولنا شروع کیا۔ اب ثانیہ نے بہت محتاط ہو کر لکھنا شروع کیا۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ کچھ غلط نہ لکھ جائے کیونکہ اس کے دماغ میں عمار کے دو جملے گونج رہے تھے جو وہ نہ جانے کس خیال میں ڈوب کر بول گیا تھا کہ نفرت ہے مجھے تم سے۔ مرنا ہی چاہیے تھا تمہیں۔

”بس۔“ آخر میں عمار نے کہا۔ ”اے آج ہی کسی وقت ٹاپ کر کے مجھے کلن دکھا دیتا۔“

”بہتر۔“ ثانیہ نے کہا پھر بولی۔ ”سر! اب میں جاؤں؟“

”تو اور کیا کرنا چاہتی ہو؟“ عمار نے اسے گھور کر دیکھا۔

”دوسری سر!“ ثانیہ بوکھلا کر کھڑی ہوئی اور جلدی جلدی چلتے ہوئے کمرے سے باہر آ کر اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔ اسی وقت پھر بزرگ داخلہ۔

”ابھی ایک صاحب آئیں گے۔“ عمار نے کہا۔

”جی بہتر۔“

عمار نے رابطہ منقطع کر دیا۔ ثانیہ کرسی کی پشت سے ہیک لگا کر لمبی لمبی سانس لے لے لگی۔ عمار کے سامنے بیٹھنا ہی اس کے لیے ایک امتحان تھا۔ رہی تھی کس سران دو جملوں نے پوری کر دی تھی جو عمار نہ جانے کس خیال میں ڈوب کر بڑبڑا رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ ”میرا نام سلطان احمد ہے اور.....“

”مجھے علم ہے سر!“ ثانیہ جلدی سے کھڑی ہوئی۔

”آئیے۔“ وہ عمار کے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھول کر اس نے بڑے احترام سے سلطان احمد کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اندر چلا گیا تو ثانیہ نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔

آدھے گھنٹے بعد سلطان احمد کمرے سے نکلا اور ثانیہ کی طرف ایک اچھی سی نگاہ ڈالتا ہوا رخصت ہو گیا۔

ثانیہ نے کوشش کی کہ عمار کے بارے میں خیالات کو ذہن سے جھٹک کر فائلوں پر توجہ دے لیکن اس میں بچاس

لچ کے وقفے میں اگر کوئی میزے بارے میں پوچھے تو کہہ دینا کہ میں دوبارے کے بعد ملوں گا۔“

”بہتر۔“

جواب دینے کے بعد ثانیہ سنبھل کر بیٹھ گئی تاکہ عمار لچ کے لیے کہیں جائے اور اپنے کمرے سے نکلے تو وہ اس کے احترام میں کھڑی ہو سکے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ عمار کو دیکھے لیکن چند منٹ گزر گئے۔ عمار کمرے سے نہیں نکلا۔ اسی دوران میں ہاسٹل سے ثانیہ کا کھانا آ گیا۔ کھانا کھا کر اس نے چرائی کو بلا دیا۔

وہ جانا چاہتی تھی کہ کینٹین میں چائے کیسی ختمی ہے۔ اس نے چرائی سے چائے منگوائی اور پی۔ چائے اچھی تھی۔ لچ کا وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی تھے لیکن عمار کمرے سے نہیں نکلا تھا۔ ثانیہ کو خیال آیا کہ وہ شاید اپنے گھر سے کھانا نہ لے کر آتا ہو یا شاید لچ کرتا ہی نہ ہو۔ بعض لوگ صبح کے ناشتے کے بعد رات ہی کو کھانا کھاتے ہیں۔

وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور دے قدموں اس شیشے تک پہنچ گئی جہاں سے اندر دیکھا جاسکتا تھا۔ اس نے عمار کو اپنی پوزیشن میں دیکھا کہ اس کی نظر شیشے پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ ثانیہ کچھ دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ عمار اپنی دونوں ٹانگیں میز پر پھیلائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلا کی اداسی تھی اور وہ بالکل غم میں نظر آ رہا تھا۔ ثانیہ کو شبہ ہوا کہ وہ آبدیدہ بھی تھا۔

الارم کی آواز نے ثانیہ کو چونکا دیا۔ الارم عمار ہی کے کمرے میں بج رہا تھا۔ ثانیہ تیزی سے مڑ کر اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔ اس کے دل کی دھڑکیں کچھ تیز ہو چکی تھیں۔ ابھی ہلا کی اداسی اس نے بھی کسی کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی جو اسے عمار کے چہرے پر دکھائی دی تھی۔ وہ بزرگی آواز سے چونکی۔ دوسری طرف معلق تھا۔

”نوٹ بک لے کر آؤ۔“

”جی بہتر۔“

ثانیہ فوراً اٹھی۔ عمار کچھ ڈکھٹ کرانا چاہتا تھا۔ وہ کمرے میں پہنچ گئی۔ اس وقت عمار کا چہرہ معمول کے مطابق دکھائی دیا۔ ڈکھٹ دیتے ہوئے وہ روبرو لوگ چیئر کو ادھر ادھر گھماتا رہا۔ شاید یہ اس کی عادت ہوئی۔ ثانیہ سوچتی رہی لیکن اپنے کام کی طرف سے غافل نہیں ہوئی۔ عمار کوئی جملہ ڈکھٹ کرانے کے بعد کبھی کبھی کچھ سوچنے بھی لگتا تھا۔

ایک موقع پر وہ خاموش ہوا اور ثانیہ اس کی طرف دیکھنے لگی تو اسے ایک محسوس ہوا کہ عمار کے چہرے کے تاثرات میں کچھ تبدیلی آئی تھی۔ کچھ افسردگی اور کچھ غصے

اس نے تیسری فائل کھولی۔ اس لڑکی کا انٹرویو بھی عام قسم کا تھا۔ اس کے نیچے عمار کا ریمارک تھا۔ ”ٹھیک ہے یہ لڑکی۔“

انٹرویو کے بعد ایک اور کاغذ بھی تھا جس پر اس لڑکی کی کارکردگی کو سراہا گیا تھا۔ وہ آٹھ مہینے ملازم رہی تھی پھر اس لیے استعفا دے کر چلی گئی تھی کہ اس کی شادی ہونے والی تھی اور اس کا ہونے والا شوہر نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیوی کہیں ملازمت کرے۔

چونکی فائل بھی کچھ اسی قسم کی تھی۔

پانچویں فائل اس سیکریٹری کی تھی جس نے بہت زیادہ عرصے کام کیا تھا۔ اس کو عمار نے صرف ایک بار تنبیہ کی تھی کہ وہ زیادہ ٹینشن نہ لیا کرے۔ وہ بہت اساتذت تھی۔ کسی کی وقت کام کے دوران میں دو تین غیر متعلق جملے بھی بول جاتی تھی جس پر عمار کو غصہ نہیں آتا تھا۔

ان چاروں لڑکیوں نے پینٹنگ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ شاید انہیں تجربی آرٹ میں کوئی دلچسپی ہی نہ ہو یا اگر کسی کو ہو بھی تو اس نے پہلی فائل دیکھنے کے بعد اس پینٹنگ کے بارے میں پوچھ کر اپنی شامت کو دعوت نہ دی ہو۔

دوسری فائل دیکھنے سے ثانیہ کو اس دفتر کے طریقہ کار کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہو گئیں لیکن اس دوران میں بھی ”شانسی“ کا نام اس کے دماغ میں چکر اتار رہا۔

ایک بچے تک وہاں کوئی آیا نہ گیا۔ ایک بچے عمار نے انٹرکام پر اس سے پوچھا۔ ”تم لچ کے لیے کینٹین میں جاؤ گی؟“

”جی نہیں سر! مجھے فائلیں دیکھنے سے معلوم تو ہو گیا ہے کہ گراؤنڈ فلور پر ایک بہت اچھی کینٹین بنائی گئی ہے لیکن میرا کھانا ہاسٹل سے آنے ہی والا ہوگا۔ ایک آدمی لے کر آئے گا۔ اس کا پیشہ یہ ہے کہ وہ دفاتر میں مختلف لوگوں کو ان کے گھر کے کھانے پہنچاتا ہے۔“

”ہاسٹل میں کون پکاتا ہے؟“

”خانماں ملازم ہے سر!“

”کیسا پکاتا ہے؟“

”اچھا پکاتا ہے سر!“

”موتی پلاؤ پکاتا جانتا ہے؟“

”موتی پلاؤ؟“

”تمہارے سوالیہ لہجے سے ظاہر ہوا کہ تم نے یہ نام بھی کبھی نہیں سنا۔ یہ ایک مغل ڈش ہے جو آج کل شاید ہی کوئی خانماں جانتا ہو۔ اچھا خیر، میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ

غیر معمولی کہہ رہی ہو؟“
”کام تو اتنا نہیں کیا کہ تھک جاتی لیکن جو کچھ دیکھا، سمجھا، محسوس کیا اور اس کے بارے میں سوچا۔ وہی تھکا دینے کے لیے کم نہیں۔“
”کیا دیکھا، کیا سمجھا؟“ شینہ پرجس ہوئی۔

شینہ نے اسے اپنی صحن کے سب اسباب بتا دیے پھر بولی۔ ”بس ان تین باتوں کے بارے میں سوچ سوچ کر تھک گئی ہوں۔“

”ہائیں تو واقعی غیر معمولی ہیں۔“ شینہ نے اس سے اتفاق کیا۔ ”شائلی! یہ نام اس لیے پراسرار ہو جاتا ہے کہ ایک لڑکی کی زبان پر یہ آیا تو تمہارے شہزادے صاحب ہائیر ہو گئے پھر ان کی اداسی اور وہ بڑبڑاہٹ..... اسے بڑبڑاہٹ ہی کہہ سکتی ہوں۔“

”بنیادی بات مجھے یہ نام معلوم ہو رہا ہے۔“ شینہ نے کہا۔

”شائلی! شینہ سوچے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ نام کی لڑکی کا ہی ہو سکتا ہے۔“

”اور انہیں شاید نفرت بھی اسی سے ہو اور اسی کی موت کے بارے میں بات کی ہو لیکن اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو انہوں نے شائلی کے نام کی پینٹنگ کیوں اپنے قریب لگا رکھی ہے۔“

”میں نے کسی افسانے میں پڑھا تھا کہ جس سے محبت ہو، اس سے اگر کسی وجہ سے نفرت ہو جائے تو اس نفرت میں بھی محبت باقی رہتی ہے۔“

”اور پھر وہ اداسی.....؟ بہت ہی گہری اداسی۔“
”اداسی بھی شاید اسی محبت کی وجہ سے ہو جو نفرت کے باوجود اپنے گہرے اثرات چھوڑ گئی ہو۔“

”شینہ! یہ بہت الجھا ہوا معاملہ ہے۔ میں تو جانتا چاہوں گی کہ یہ شائلی ہے کون یا کسی کون؟“

”ان کے سامنے یہ نام نہ لے لیٹنا۔“ شینہ دھیرے سے ہنسی۔ ”ورنہ تمہارا حشر بھی پہلا انڈو دیو دینے والی لڑکی کا سا ہوگا۔ کسی اور ذریعے سے معلوم کرنے کی کوشش مناسب ہوگی۔“

”اب اس موضوع پر پھر بھی۔“ شینہ نے شینہ کا ہاتھ دباتے ہوئے آہستہ سے کہا کیونکہ ہاسٹل کی ہی ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی تھی جو ان دونوں کی دوست تھی۔

شینہ اسے شینہ کی طرح یہ سب کچھ نہیں بتانا چاہتی تھی۔ تینوں میں دوسرے موضوعات پر گپ شپ ہونے لگی۔ دوسرے دن شینہ پھر اپنی ڈیوٹی پر تھی۔ اس دن بھی

اس نے لچ کے وقفے میں شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ عمار گزشتہ روز کی طرح گہری اداسی میں ڈوبا ہوا تھا۔ شینہ کو خیال آیا کہ دفتر کے علاوہ بھی عمار تنہائی میں اسی طرح اداس رہتا ہوگا۔ اپنے خوابوں کے شہزادے کی یہ اداسی شینہ کے دل میں گھر گئی۔ وہ یہ تک سوچنے لگی کہ کاش وہ اپنے شہزادے کی اداسی دور کر سکے۔

لچ کے بعد شینہ نے انٹرکام پر عمار کو بتایا کہ آدھے گھنٹے بعد اس کا کوئی ملاقاتی جعفر صدیقی آئے گا۔ ”آپ نے یہی نام دیا ہے ان صاحب کو؟“ وہ آخر میں بولی۔

”اچھا یاد دلایا تم نے۔ خیال رکھنا، وہ میرا قریبی دوست ہے۔“

”بہتر۔“
ڈھائی بجے عمار سے کچھ زیادہ عمر کا ایک شخص اندر آیا۔ ان دنوں میں شینہ دفتر کے بھی لوگوں سے واقف ہو چکی تھی۔ آنے والا ان میں سے نہیں تھا اس لیے شینہ کے خیال کے مطابق وہ جعفر صدیقی ہی ہو سکتا تھا۔

”مسٹر جعفر؟“ شینہ نے ٹھہرے ہو کر پوچھا۔
وہ جواب دینے کے بجائے شینہ کے قریب آ گیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔

”پلیز، سرا! شینہ پھر بولی۔ ”آپ مسٹر جعفر ہیں؟“
”ہوں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

شینہ اسے بڑے احترام سے آندرونی دروازے تک لے گئی۔

”سرا! شینہ نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ اس کے اندر جانے کے بعد شینہ اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔

جعفر نے عمار کی ملاقات پون گھنٹے رہی۔ اس دوران میں عمار نے انٹرکام پر شینہ سے جانے اور دیگر لوازمات کے لیے کہا تھا اور شینہ نے چیراکی کو بلا کر اسے ہدایات دی تھیں۔

جعفر کے جاتے ہی عمار نے شینہ کو اپنے کمرے میں بلایا۔

”نیٹھو۔“ عمار نے کہا۔ ”تم نے شاید ابھی ساری فائلیں نہیں پڑھیں۔ ایک فائل میں میری عادات و اطوار کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں ایک بات یہ بھی ہے کہ مجھے جھوٹ سے شدید نفرت ہے۔“

”جی سرا! شینہ نے کہا۔ ”میں وہ فائل دیکھ چکی ہوں۔“

”پھر بھی تم نے مجھ سے جھوٹ بولا؟“

”سرا! مجھے تو یاد نہیں کہ میں نے آپ سے کوئی جھوٹ بولا ہو۔“

”جعفر نے تمہیں پہچان لیا تھا۔ اس نے تمہارے

بارے میں بات کی تھی اور مجھے بتایا کہ تم ایک بزنس میں شغف کمال کی بیٹی ہو لیکن تم نے اپنے والد کا نام مادی بتایا تھا۔“
”سرا! میں نے سچ بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔“ عمار کمال میری والدہ کے دوسرے شوہر ہیں اور اب وہ دونوں یورپ میں ہیں۔ میں ان کے ساتھ کچھ ہی دن رہی ہوں۔ جعفر صاحب نے مجھے انہی دنوں میرے اسٹیپ فادر عمار کمال کے ساتھ دیکھ کر یہ سمجھ لیا ہوگا کہ میں ان کی بیٹی ہوں۔“
عمار کی پیشانی پر ایسی سلوٹ پڑی جیسے وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”ہاں۔“ اس نے طویل سانس لی۔ ”یاد آ گیا۔

ہاں، تم نے بتایا تھا کہ تمہارے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں بھول گیا تھا۔ سال بھر سے کچھ ایسا ہے کہ بعض اوقات میری یادداشت دھوکا دے جاتی ہے۔ سوزی!“

”سوزی کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔“
”تمہیں اندازہ ہے کہ میں نے تمہیں سیکریٹری کی حیثیت سے کیوں منتخب کیا؟“

”سرا! یہ تو آپ ہی جانتے ہوں گے۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں۔“

”تمہیں، تمہاری سادگی نے منتخب کر لیا ہے۔ فیشن کرنے والی لڑکیاں مجھے اب پسند نہیں۔“

”اب؟“ شینہ کی زبان پر بے اختیار سوال آ گیا۔
عمار نے ”اب“ کی وضاحت نہیں کی اور بولا۔ ”میں نے غور سے تمہارا جائزہ لیا تھا اور مجھے لگا تھا کہ تم فطرتاً سادگی پسند ہو۔“

”جی سرا! شینہ کچھ خوش ہوئی۔ ”میں اپنے والد کی حیات میں بھی ایسی ہی رہتی تھی حالانکہ میرے کوئی کئی نہیں تھی بلکہ اب بھی کی نہ ہو اگر میں بس ایک فون کروں لیکن میں اب بس اپنے قدموں پر کھڑے ہونا چاہتی ہوں۔ میرے اسٹیپ فادر بھی میرے لیے شفیق ہیں لیکن ان کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے اپنے مرحوم والد کی زیادہ شدت سے محسوس ہوتی اس لیے میں اس بیٹنگ میں بھی نہیں رہتی جو وہ میرے لیے چھوڑ گئے ہیں۔“ اپنے بارے میں وضاحت سے بتاتے ہوئے شینہ کے ذراغ میں ایک سوال بھی کلک رہا تھا۔

”تم بہت خوددار ہو۔ مجھے اچھا لگا لیکن اب تو تمہارے لیے ہاسٹل میں رہنا ضروری تو نہیں۔ یہاں سے تمہیں اتنی تنخواہ ملتی ہے کہ تم کرائے کا مناسب اپارٹمنٹ بھی لے سکتی ہو۔“

”میرے دل میں تو یہی بات ہے۔“

”ہوں۔“ شینہ خف سا مسکرائی۔ ”تم اپنے لیے میدان صاف دیکھنا چاہتی ہو۔“

شینہ نے فوراً کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنا دل ٹٹولنے لگی

”اب مجھے ہاسٹل کی لڑکیوں سے محبت ہو گئی ہے۔“

”جی ہاں۔ بس ایک لڑکی سے بہت زیادہ قربت ہے۔“

”ہاں، انسان کا ایک آدھ راز دار ہونا چاہیے۔ وہ کسی سے تو اپنے دل کی باتیں کر سکے ورنہ وہ خود کو بہت پوجھل محسوس کرتے لگتا ہے۔“

”سرا! شینہ کے دل کی بات زبان پر آنے لگی۔

”آپ کا شاید کوئی راز دار نہیں۔ میں نے آپ کو ہمیشہ اداس دیکھا ہے۔ آپ بھی مسکراتے ہوئے بھی نظر نہیں آئے۔“

”مسکراہٹ.....“ عمار نے فطری سانس لی۔ ”وہ اب میری زندگی سے نکل چکی ہے۔“

”بیوی بچوں میں بھی دل نہیں لگتا؟“ شینہ نے بہت دھڑکنے والے دل کے ساتھ پوچھا۔

عمار نے فوراً جواب نہیں دیا۔ کرسی کی پشت سے سرٹکا کر چھت کو ٹکٹنے لگا۔ شینہ اسے کھتی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے جواب مل جائے۔

”بچے نہیں ہیں میرے۔“ عمار کچھ توقف سے بولا۔ ”اور بیوی اب اس دنیا میں نہیں۔“

”دنیا میں نہیں؟“ شینہ بولی۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ..... کہ.....؟“ وہ چپ ہو گئی۔

”تم ٹھیک سمجھی ہو۔“ عمار سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”بس وہ لفظ زبان پر لاتے ہوئے ہنسیا رہی ہو۔ ہاں، وہ مر چکی ہے۔ اب تم جا کر اپنا کام دیکھو۔“

اس آخری جملے کے بعد شینہ کے لیے ممکن نہیں رہا کہ وہ وہاں بیٹھی رہتی۔ اسے بادل ناخواست اٹھنا پڑا اور یہ سوال اس کے دل و ذراغ میں پھلتا رہ گیا کہ کیا اسی کا نام شائلی تھا؟

اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد بھی اس کے ذراغ میں اسی سوال کی گونج بھیلی رہی۔ ہاسٹل جا کر اس نے شینہ کے سامنے بھی یہ سوال رکھ دیا۔

”ہاں۔“ شینہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”یہ ممکن تو ہے۔“

”مجھے عمار کے وہ جملے بھی یاد ہیں..... نفرت ہے مجھے تم سے..... مرنا ہی چاہیے تھا تمہیں۔“

”ضروری تو نہیں کہ یہ جملے اس نے اپنی بیوی ہی کے لیے کہے ہوں۔“

”میرے دل میں تو یہی بات ہے۔“

”ہوں۔“ شینہ خف سا مسکرائی۔ ”تم اپنے لیے میدان صاف دیکھنا چاہتی ہو۔“

شینہ نے فوراً کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنا دل ٹٹولنے لگی

جہاں شینہ ہی کا خیال مسکرا رہا تھا۔
 پھر کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ایک ایسی بات ہوئی
 جو ثانیہ کے لیے کسی حد تک خوشگوار ہی تھی۔ لچ کے بعد عمار
 نے ثانیہ کو کنکیشن دینے کے لیے طلب کیا تھا۔ وہ مختصر ڈکٹیشن
 لیڈی برنگٹرا کے نام تھا۔ تحریر بھی۔
 ”مجھے یقین ہے کہ آپ کی موجودگی میں حویلی کا
 انتظام ٹھیک ہی چل رہا ہوگا تاہم کل پرسوں میں آپ اس کا
 جائزہ لیں۔ میں چند دن میں آ رہا ہوں۔“
 ڈکٹیشن دینے کے بعد کاغذ کی ایک سلف ثانیہ کو دیتے
 ہوئے عمار نے کہا۔ ”یہ اس پتے پر میل کر دیجیے۔“
 ثانیہ نے سلف پڑھے بغیر پوچھ لیا۔ ”سر! آپ
 کہیں جانے والے ہیں؟“
 ”ہاں۔“ عمار نے جواب دیا۔ ”اپنی اسٹیٹ جاؤں
 گا۔ ایک آدھ ضروری کام نکل آیا ہے۔“
 ”اسٹیٹ؟“
 ”ہاں، جنوبی پہاڑوں کے اس طرف۔ کوئی ڈیڑھ سو
 میل آگے ایک چھوٹی سی اسٹیٹ ہے۔ اس کا نام بہت کم
 لوگ جانتے ہیں۔“
 ”آپ نے اسے اپنی اسٹیٹ کہا تھا۔ سر! اس سے
 میں کیا سمجھوں؟“
 ”عماد پڑ گئی ہے اسے اپنی اسٹیٹ کہنے کی۔ ویسے
 ایک زمانے میں وہ ہماری ہی اسٹیٹ تھی۔ انگریزوں کے
 آنے سے پہلے میری ہی نسل کے ایک بزرگ وہاں کے والی
 تھے۔ والی یا حاکم، جو چاہا ہو کہ لو۔ انہوں نے سب کچھ ختم
 کر دیا۔ بس حویلی ان کی دست برد سے نہ جانے کیسے بچ
 گئی۔ وہی میرا گھر ہے۔“
 ”تو۔۔۔ تو آپ۔۔۔ وہاں کے پرنس ہوئے۔“
 ثانیہ کا دل دھڑک اٹھا تھا۔
 ”پرنس تو نہیں، ہاں سابق پرنس کہہ لو۔“
 ثانیہ کے دل کی دھڑکنیں خاموشی تیز ہو گئیں۔ اس کے
 خوابوں کا شہزادہ وہ اپنی شہزادہ تھا۔
 ”تو یہاں آپ۔۔۔۔۔“
 ”یہاں میں ایک ہوئی میں رہتا ہوں۔“ عمار نے
 اس کی بات کاٹ دی۔
 ”سر! اسٹیٹ ہے واپسی کب تک ہوگی؟“
 ”یہاں مجھے آج کچھ چھان بین کرنا ہے۔ کل اندازہ
 ہو سکے گا کہ واپسی کب تک ممکن ہے۔“
 ”سر! یہ لیڈی برنگٹرا۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ زمانہ

انتہایت چکا۔ انگریزوں کے خطاب یافتہ لوگوں میں سے تو
 شاید اب کوئی زندہ نہیں ہونا چاہیے۔“
 ”میں نے اس سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ
 بیس سال سے، یعنی میرے مرحوم والد کے زمانے سے حویلی کی
 نگران ہے۔ اچھا، اب تم جلدی سے یہ میل تو کر دو۔“
 ”بہتر۔“ ثانیہ اٹھ گئی۔
 ٹائپ کرتے اور میل کرتے ہوئے بھی اس کے رگ و
 بے میں خوشی کی لہر دوڑتی رہی کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ
 واقعی شہزادہ ہے۔ اس دن جب وہ ہاسٹل گئی تو شینہ سے
 لپٹ گئی وہ بہت خوش تھی۔
 ”کیا بات ہے؟“ شینہ ہنسی۔ ”کیا آج تنخواہ میں
 اضافہ ہو گیا ہے؟“
 ”ایسا ہوتا تو میرے لیے اتنی خوشی کی بات نہیں
 ہوتی۔ خوش تو میں اس لیے ہوں کہ میرے خوابوں کا شہزادہ
 واقعی شہزادہ ہے۔“
 ”وہ کیسے؟“
 ثانیہ نے ساری باتیں دہرا دیں۔
 ”اوہ! شینہ کے منہ سے نکلا۔“ تو گویا سابق شہزادہ!۔“
 ”سابق اور حال کو جنم میں جھوٹو۔ بس شہزادہ ہے وہ۔“
 ”گفتگو خاصی بے تکلفانہ ہوئی۔“
 ”دوستگو سے وہ مجھے بہت بدلے ہوئے نظر آئے۔“
 اتنی باتیں وہ کہاں کرتے تھے۔
 شینہ ہنسی۔ ”اب ان کے لیے تمہارے جملوں میں
 احترام بھی آ گیا۔“
 ”شہزادوں کا احترام تو کرنا چاہیے۔“
 ”ان کی عدم موجودگی میں تو وہاں تمہاری موجودگی
 بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔“
 ”یہ تو ہے۔“ ثانیہ نے کہا۔ ”یہ کل معلوم ہو جائے گا۔“
 دوسرے دن ثانیہ دفتر پہنچی ہی تھی کہ انٹرکام پر جنرل
 منیر نے اسے بتایا کہ وہ عمار سے ملے آ رہا ہے، اگر وہ
 مصروف نہ ہوں۔ ثانیہ نے عمار کو اطلاع دی۔
 ”ٹھیک ہے۔ اس سے کہہ دو کہ وہ آ سکتا ہے اور تم
 بھی آؤ۔۔۔۔۔“
 ”بہتر۔“
 ثانیہ نے انٹرکام پر ہی جنرل منیر کو بتایا کہ وہ آ سکتا
 ہے پھر وہ خود فوراً ہی عمار کے کمرے میں پہنچ گئی اور اس کے
 اشارے پر بیٹھ گئی۔
 عمار بولا۔ ”میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے بلایا ہے

آکشی حصہ

کہ جس اشتہار کی وجہ سے تم انٹرویو کے لیے آئی تھیں، اسی
 اشتہار کی وجہ سے ایک اور لڑکی بھی آئی تھی لیکن کیا رہ جائے
 تھے بجائے وہ نوبت ہی آگئی تھی اس لیے اسے جنرل منیر
 نے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا تھا کہ وہ دو گھنٹے بعد آئے لیکن وہ
 نہیں آئی۔ کل اس نے جنرل منیر کو بتایا کہ وہ واپس گھر گئی
 تھی تو وہاں ہنگامی صورت حال تھی۔ اس کے والد اس کی
 والدہ کو اسپتال پہنچانے کے لیے ایبویٹس منگوا رہے تھے۔
 اس کی والدہ پر فغان کا منتر ایک ہو گیا تھا۔ لڑکی بھی ماں کے
 ساتھ اسپتال گئی اس لیے انٹرویو کے لیے نہیں آ سکی۔
 اسپتال میں بھی وہ خاصے دن ماں کے ساتھ رہی۔ پھر جب
 والدہ گھر آ گئیں تو بھی وہ بالکل ٹھیک نہیں تھیں۔ ان کی فزیک
 تھراپی ہو رہی تھی اور انہیں مستقل طور پر بھی کسی سہارے کی
 ضرورت تھی۔ لڑکی دل و جان سے ان کی خدمت میں
 مصروف رہی۔ اب اس کی والدہ ٹھیک ہو گئی ہیں۔ پرسوں
 اس نے جنرل منیر کو فون کر کے ساری بات بتائی تھی اور
 پوچھا تھا کہ کیا وہ اب بھی اس جاب کے لیے درخواست
 دے سکتی ہے؟“
 ”جی ایم صاحب نے اس سے کہہ دیا ہوگا کہ اب وہ
 جاب خالی نہیں ہے۔“
 ”ہاں۔ انہوں نے اس سے یہی کہا تھا۔ کل جب
 میں دفتر سے جا رہا تھا تو انہوں نے اس کا تذکرہ کیا۔ میں
 نے ان سے کہا تھا کہ وہ فون کر کے اس لڑکی کو بلا لیں اور خود
 ہی اس کا انٹرویو کر لیں، میں آج اور کل بہت مصروف
 ہوں۔ انٹرویو لینے کے لیے وقت نہیں نکال سکوں گا۔“
 ”لیکن اب اس کی کیا ضرورت ہے بہر؟“ ثانیہ کچھ
 بے چین ہوئی۔
 عمار کے کچھ بولنے سے پہلے ہی دروازہ ٹوک کیا گیا۔
 ”کم ان۔“ عمار نے قدرے بلند آواز میں کہا۔
 دروازہ کھلا۔ ثانیہ نے جی ایم کو اندر آتے دیکھا۔
 اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔
 ”ہوں۔“ عمار نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
 ”کوئی بہت ضروری بات ہوگی ورنہ آپ مجھے ڈسٹرب نہیں
 کرتے۔ میں نے بتا دیا تھا کہ میرے دو دن بہت
 مصروفیت میں گزر رہے۔“
 ”جی سر!“ جی ایم نے کہا۔ ”مجھے یہی خیال تھا کہ
 ابھی آپ دفتر میں ہیں لیکن کسی وقت بھی دفتر سے جاسکتے
 ہیں۔ دراصل وہ لڑکی آج بھی نوبت ہی آگئی تھی۔ میں نے
 اس کا کسی وی وی دیکھ لیا ہے۔ اس کے انٹرویو میں کچھ وقت لگا۔

جا رہا ہوں۔“ عمار نے میری ایک دراز کھولتے ہوئے کہا۔
 جی ایم چلا گیا۔
 ”اب تم جا کر اپنا کام دیکھو۔“ عمار نے دراز سے کچھ نکالتے ہوئے کہا۔ ”میری ملاقاتیں اور کل کی آئینل بینک، سب کنسل کر دو۔ اور ہاں..... جاتے وقت جی ایم سے ملتی جانا۔“
 عمار نے پہلی مرتبہ ثانیہ کو اپنا موبائل نمبر دیا۔
 ”اب میں چلا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔
 ”اب میں جی ایم سے مل کر کیا کروں گی؟“ ثانیہ کی پلکیں پیچک نکلیں۔
 ”جی ایم سے ملنے کے بعد تمہیں اندازہ ہو جائے گا۔“ عمار نے کہا اور پھر اس طرح دروازے کی طرف بڑھا جیسے بہت غلٹ میں ہو۔
 ثانیہ ڈوبے ہوئے دل کے ساتھ اپنے کمرے کی کرسی پر جا بیٹھی۔
 ثانیہ کو بہر حال ملازمت کی ضرورت تھی لیکن اب وہ ایسی کمپنی میں کسی دوسری جگہ کام کرنے کے لیے ذہنی طور پر قطعی تیار نہیں تھی۔ وہ کہیں اور ملازمت ڈھونڈتی لیکن اسے یہ صدمہ رہتا کہ وہ اپنے خوابوں کے شہزادے سے ملنے کے بعد اس سے دور ہو گئی۔
 ہدایت کے مطابق اس نے انٹرکام اور ٹیلی فون استعمال کر کے عمار کی تمام مصروفیات کنسل کر دیں۔ اس کے بعد اس کا دل نہیں چاہا کہ اس کرسی پر بیٹھی رہے۔ ابھی دفتر کا وقت ختم نہیں ہوا تھا لیکن اب اس کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ وہ سب درازیں وغیرہ منتقل کر کے اٹھی اور گراؤنڈ فلور پر جی ایم کے کمرے میں پہنچی۔
 جاتے ہی اس نے کہا۔ ”جب مجھے درخواست کیا جا چکا ہے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی کہ میں دفتر کا وقت ختم ہونے پر ہی جاؤں۔ میں اب یہاں بیٹھ کر کیا کروں گی۔ سر نے جو ہدایات دی تھیں، ان پر عمل کر چکی ہوں۔ آخری ہدایت یہ تھی کہ جاتے وقت آپ سے مل کر جاؤں۔“
 ”ہاں، یہ ضروری تھا۔“ جی ایم نے اس کی طرف ایک چپک بڑھایا۔ ”یہ تمہاری تین ماہ کی تنخواہ کا چیک ہے کیونکہ تمہیں کسی نوٹس کے بغیر درخواست کیا گیا ہے اس لیے اصولاً تمہیں تین ماہ کی تنخواہ دی جا رہی ہے۔“
 ثانیہ کو خیال ہی نہیں آیا تھا کہ اسے چیک لینے کے لیے جی ایم سے ملنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ چپک اس کے ہاتھ میں تو آ گیا لیکن اس کا جی چاہا کہ اس کے پڑنے

پڑنے کر کے چھینک دے۔
 ”اور یہ لو۔“ جی ایم نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔
 ”اب یہ کیا ہے؟“ ثانیہ نے کئی سے پوچھا۔
 ”پڑھ لو۔“
 ثانیہ نے بے دلی سے لفافہ کھول کر اس میں رکھا ہوا کاغذ نکالا اور پھر تحریر پر نظر پڑتے ہی اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اسے اب عمار کی پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے اپنا سٹ کیا گیا تھا۔ وہ کتنے کی سی حالت میں کھڑی رہ گئی۔
 جی ایم ایک فائل اٹھا کر اسے پڑھنے لگا۔
 ثانیہ ڈگمگاتے قدموں سے کمرے سے باہر نکلی۔ اس کا دل اب بھی خوشی سے لیپوں اچھل رہا تھا۔ وہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھ رہی تھی کہ اسے اپنے خوابوں کے شہزادے سے بہت قریب ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ پرائیویٹ سیکرٹری کا منصب آٹھ گھنٹے کے لیے نہیں، چوبیس گھنٹوں کے لیے ہوتا ہے۔ وہ دفتر میں ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے موبائل سے عمار کا نمبر ملا یا۔
 ”میں! عمار کی آواز آئی۔“
 ”میں..... ثانیہ!.....! لفظ اس کے حلق میں اٹکنے لگے۔
 ”تمہیں اپنا سٹنٹ لیٹر مل گیا ہوگا؟“
 ”جی سر!“
 ”میں نے فون کرنے کے لیے اس لیے کہا تھا کہ جلد از جلد تمہارا فیصلہ جان لوں۔ اگر تمہیں یہ جاب منظور نہ ہو تو لیٹر چھڑا کر پیچک دو۔“
 ”سر! میں یہ اعزاز کیسے ٹھکرا سکتی ہوں۔“ ثانیہ کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔
 ”گڈ!“ عمار نے کہا۔ ”کسی وجہ سے مجھے توقع بھی یہی تھی۔“
 ”کس وجہ سے سر؟“
 ”بتا دو گا۔ تم اپنا سامان لے کر کل ہوٹل آ جاؤ۔ تمہیں میرے ساتھ ہی اسٹنٹ چلانا ہوگا۔“
 ”مجھے علم نہیں کہ آپ کہاں مقیم ہیں؟“
 عمار نے ہوٹل کا نام بتایا اور کہا۔ ”میں سینکڈ فلور کے ایک سوئٹ میں ہوں۔ تم بارہ بجے تک پہنچ جاؤ۔“
 ”ساتھ کرنا۔“
 ”سر! میں بروقت پہنچ جاؤں گی۔“ اب ثانیہ کی سانس بھی خوشی سے پھولنے لگی۔ دوسری طرف سے رابطہ منتقل کر دیا گیا۔
 اب ثانیہ دفتر سے نکلی۔ اس کا مخصوص آٹو رکشا تو

وقت پر ہی آتا۔ اس وقت ثانیہ کو دوسرا رکشا کرنا پڑا۔ شینہ ہاسٹل کے دروازے سے نکل رہی تھی۔
 ”کہاں جا رہی ہو؟“ ثانیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”تھوڑی سی شاپنگ کرنا ہے۔ تم اتنی جلدی کیسے آگئیں؟“
 ”مجھے ملازمت سے نکال دیا گیا ہے۔ چلو، کمرے میں چلو۔“ ثانیہ نے اسے کھینچا۔
 ”ملازمت سے نکالے جانے پر اتنی خوش ہو؟“ شینہ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے حیرت سے کہا۔
 ”کمرے میں تو چلو، بتاتی ہوں۔“
 ”نہ جانے کیا ہوا ہے۔“ شینہ بڑا کر رہ گئی۔
 ”کمرے میں پہنچ کر ثانیہ نے اسے بستر پر بٹھایا۔
 ”مجھے دوسرا اپنا سٹنٹ لیٹر مل گیا ہے۔ اب میں عمار کی پرائیویٹ سیکرٹری ہوں۔“
 ”مبارک ہو۔“ شینہ نے فوراً کہا۔
 ”وہ یہاں ایک ہوٹل میں مقیم ہے۔ دو ایک دن میں اسٹنٹ روانہ ہوں گے۔ مجھے ساتھ لے کر جائیں گے۔ مجھے کل دوپہران کے ہوٹل پہنچنا ہے۔“
 ”ثنانیہ! یہ تمہاری بڑی خوش نصیبی ہے لیکن مجھے بہت یاد آؤ گی بلکہ سچی لڑکیاں تمہیں یاد کریں گی۔ ایسی کوئی نہیں جو تمہیں پسند نہ کرتی ہو۔ اسٹنٹ میں کب تک رہنا ہوگا؟“
 ”یہ مجھے ابھی نہیں معلوم۔“ ثانیہ اس کے برابر میں بیٹھ کر اس کی گود میں لیٹ گئی۔
 ”دہاں سے فون کرتی رہنا۔“ شینہ نے محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔
 ”یہ ممکن ہی کہاں ہے کہ میں تمہیں بھول جاؤں۔“
 رات کے کھانے تک سہاری لڑکیوں کو اس کے جانے کا علم ہو گیا۔
 ثانیہ نے ہاسٹل کا حساب کتاب کیا اور رات ہی کو اپنا سامان سینٹنے لگی۔
 ☆☆☆☆
 دوسرے دن دوپہر کو عمار نے ہوٹل کے سوئٹ میں ثانیہ کو خوش آمدید کہا اور اپنے پیچھے کھڑی ہوئی عورت سے بولا۔ ”ان کا سامان اسی کمرے میں پہنچا دو جس کے بارے میں تمہیں بتا چکا ہوں۔“
 عورت نے مؤدبانہ انداز میں سر ہلا دیا۔ عمار ثانیہ کو لے کر ایک طرف بڑھا۔
 ”سر! یہ عورت کون ہے؟“ ثانیہ نے پوچھا۔ ”ملازمت؟“

”ظاہر ہے۔“ عمار نے کہا۔ ”جب بھی اسٹنٹ سے یہاں آتا ہوں، اسے ساتھ لاتا ہوں۔ بہت اچھی عورت ہے۔ اس کا شوہر جو جلی میں ملازم ہے۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا کرتا ہے۔“
 وہ خاصا سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا۔ ثانیہ بیٹھ گئی۔ وہ اب بھی خوشی سے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔
 ”لچ میں ابھی دیر ہے۔“ عمار نے کہا۔ ”میں اس دوران میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کل جب تم نے میری پرائیویٹ سیکرٹری بننا منظور کر لیا تھا تو میں نے فون پر تم سے کہا تھا کہ کسی وجہ سے مجھے اسی کی توقع تھی اور تم نے پوچھا تھا، کس وجہ سے؟“
 ”جی سر!“
 اس وقت ثانیہ نے پہلی مرتبہ عمار کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھی۔
 ”ثنانیہ! وجہ ایک ہی ہے۔“ وہ بولا۔ ”میں نے ابتدا ہی سے محسوس کر لیا تھا کہ مجھے دیکھتے وقت تمہاری نگاہوں میں پسندیدگی کی چمک ہوتی ہے۔“
 ثانیہ جھپٹ گئی۔ ”جی..... جی..... جی سر!“ وہ ہٹا گئی۔
 ”میرا خیال درست ہے نا؟“
 ”جی۔“ ثانیہ کی نظریں جھپک گئیں۔
 ”اور کل ہی میں نے تم سے کہا تھا کہ تم مجھے اچھی لگی ہو اس لیے میں تمہیں بوریت کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتا۔ یعنی یہ کہ مجھے بھی تم پسند ہو۔“
 ثانیہ کی زندگی میں بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ بہت کم وقفے سے اس کا دل خوشی کے بھنور میں پھرانے لگے۔
 ”اب یہ فیصلہ بھی تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ عمار قدرے توقف سے بولا۔ ”جب ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو اس سے آگے کوئی قدم اٹھانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ ہاں، اگر تم اپنی والدہ وغیرہ سے بھی بات کرنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ بہت زیادہ اشاراتی نہیں ہے۔“
 ”جی۔“ ثانیہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”میں خود بخود ہوں۔“
 ”مجھے اپنے کسی بھی معاملے میں کسی سے بات کرنے کی یا اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔“
 ”تو پھر میں چاہوں گا کہ ہمیں اگلا قدم اٹھانے میں دیر نہیں کرنا چاہیے۔“
 ”جی۔“

”میری طرح کچھ توکل کر بات کرو۔“

”مم..... میں لڑکی ہوں سر!“

”تو جو کچھ میں نے کہا، وہ تمہارے دل میں بھی ہے۔“

”جی۔“

عماد صوفے سے اٹھ کر تانیہ کے صوفے پر اس کے برابر میں آ بیٹھا اور اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ تانیہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ اپنے سارے وجود میں ایک ایسا نشہ تیرا محسوس کرنے لگی تھی جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کیفیت میں اس نے عماد کی آواز ایسے کئی جیسے کہیں دور سے آرہی ہو۔

”تو پھر ہم کل ہی شادی کر لیں گے۔ سول میرج..... یا جیسے تم چاہو۔“

اس موقع پر بھی تانیہ کی سانسیں پھول گئیں۔ مضبوطی سے بیٹھا رہتا اس کے لیے مشکل ہو گیا۔ اس کا سر عماد کے شانے پر ڈھلک گیا۔

”جب ہم اسٹیج پہنچیں گے۔“ عماد بولا۔ ”تو ہم دو نہیں، ایک ہو چکے ہوں گے۔“

تانیہ اب کچھ بول بھی نہیں سکی۔ زندگی میں بعض اوقات اچانک ایسی تبدیلی آتی ہے کہ انسان گنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی بات تانیہ نے دوسری صبح فون پر شینے سے سنی۔

”ہاں تانیہ!“ شینے نے جواب میں کہا۔ ”ایسا یقیناً ہوتا ہوگا۔ میں خوش ہوں کہ تمہیں اپنے خوابوں کا شہزادہ جو نظر آتا تھا، وہ تمہیں مل بھی رہا ہے۔“

”لیکن رات کو میں نے ایک عجیب خواب دیکھا جس سے میں ڈری ہوئی ہوں۔“

”ایسا کیا خواب دیکھا؟“

”میں نے خود کو ایک اجنبی سے مقام پر دیکھا جہاں میرے چاروں طرف آگ تھی اور شعلے میری طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔“

”ایسے خواب بھی نظر آ جاتے ہیں۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟“

”یہ تو میں نہیں جانتی کہ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے لیکن مجھے ڈر لگا ہے۔“

”کسی وہم میں مت پڑو۔ اس خواب کو علامتی سمجھو۔ تم ایک بہت بڑے آدمی کی بیوی بننے جا رہی ہو۔“

”میرے لیے دعا کرنا۔“

”پھر وہی دہیوں جیسی بات۔“

تانیہ ہنسنے لگی لیکن محسوس یہ کیا جیسے زبردستی ہنسی ہو۔

اسی شام عماد اس سے کہہ رہا تھا۔ ”ہماری شادی تو ہوگئی لیکن شب عروسی ہم اسٹیج پہنچ کر اپنی حویلی میں منائیں گے۔ دو پہر کو یہاں سے ہماری روائی ہوگی۔ پہلے ہوائی جہاز کا سفر ہوگا۔ اس کے بعد بجلی کا پٹرکا۔ بجلی کا پٹر حویلی کے سامنے اترے گا۔“

☆☆☆

دوسرے دن جب بجلی کا پٹر اپنی منزل پر پہنچ کر پہنچے ہوئے لگا تو عماد نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہے ہماری حویلی۔“

”آپ اسے حویلی کہہ رہے ہیں؟ تو بہت بڑا محل ہے۔ مجھے پورے سیکریٹ یاد آ گیا جہاں سب کچھ سرخ اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔“

”نچ پورے سیکریٹ کی گئی ہو تم؟“

”ایک بار اتفاق ہوا ہے۔“ تانیہ نے جواب دیا پھر پوچھا۔ ”بہی پڑے وہ کتنی دور ہے؟“

”ایک میل سے کچھ زیادہ ہے۔“

”عجب تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس محل کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جانے میں آدمی کو پندرہ منٹ تو لگتے ہوں گے۔“

”تمہارا انداز درست ہے۔“

”تو وہاں تک ہم پیدل جا سکیں گے؟“

”جھانک کر نیچے دیکھو۔ تمہیں ایک کار کھڑی نظر آئے گی جو ہمیں حویلی کے خاص احاطے تک پہنچائے گی۔ میں نے لیڈی برگنز کو پیغام بھیج دیا تھا کہ بجلی بیڈ تک آنے والی کار وہ خود رانیو کریں۔“

بجلی کا پٹر لینڈ کر گیا۔ وہاں ایک خوبصورت کار کے قریب دو خواتین کھڑی تھیں جن میں سے ایک تانیہ کے یقین کے مطابق لیڈی برگنز تھی۔ سرخ اسکرٹ میں لمبوں اور ہاتھوں پر اسکن کلر کے دستاں چڑھائے ہوئے۔ دوسری جوان العر اور خوبصورت لڑکی ساڑی میں تھی جو ہاتھ پر بندیا لگائے ہوئے تھی۔ وہ دونوں اس وقت آگے بڑھ آئیں جب عماد اور تانیہ بجلی کا پٹر سے اترے۔

”لیڈی برگنز!“ عماد نے تانیہ سے تعارف کرایا۔

”میں سال سے حویلی کی منتظر یا نگراں جو چاہے کہہ لو۔۔۔۔۔۔“

اور لیڈی برگنز آہی آہی ہماری محبوب شریک حیات۔“

”پرنس! آپ کے پیغام کے بعد یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔“

تانیہ کو دو باتوں نے چونکایا۔ ایک تو لیڈی برگنز

بہت شستہ اور پول رینی تھی اور دوسرے اس نے عماد کو پرس کہا تھا۔ وہ تانیہ کے قریب آئی اور تانیہ کے گل سے گل ملا کر اس کا بوسہ لیا۔ ”نئی زندگی میں خوش آمدید!“

”اور یہ ہے شرمیلا!“ عماد نے پختہ عمر کی لڑکی کا تعارف کرایا۔ ”ایک اچھی انٹیریئر ڈیکورٹر۔ دس سال سے حویلی کے اندرونی حصوں کو آئے دن نئے انداز سے سجاانا کا شوق بھی ہے۔“

اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ تانیہ سے مصافحہ کیا۔ ”میں بھی آپ کو نئی زندگی کی مبارکباد دوں گی۔“

”شکریہ۔“ تانیہ نے کہا۔

”آئیے پرس!“ لیڈی برگنز نے کار کی طرف اشارہ کیا۔

”یہاں سے میں ڈرائیو کروں گا۔“ عماد نے کہا۔

لیڈی برگنز نے کار کی چابی اس کی طرف بڑھادی۔ روائی اس طرح ہوئی کہ تانیہ ڈرائیو تک سیٹ کے برابر میں بیٹھی۔ شرمیلا اور لیڈی برگنز اچھپکی سیٹ پر بیٹھیں۔

”یہاں موسم خوشگوار ہے۔“ عماد بولا۔

”مگر میاں شروع ہو رہی ہیں پرنس!“ شرمیلا بولی۔

تانیہ پھر چونکی۔ شرمیلا نے بھی عماد کو پرس کہا کہ مخاطب کیا تھا۔

شرمیلا نے مزید کہا۔ ”پہاڑی سلسلے کے گلیشیر پھیلنے لگے ہیں۔ ویسے آپ کے آنے سے بھی تو موسم پر فرق پڑے گا۔ کل تک موسم اتنا اچھا نہیں تھا۔“

”ہوں۔“ عماد خفیف سا مسکرایا۔

لیڈی برگنز نے تانیہ کے شانے کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”ان کی وجہ سے آپ بہت خوش ہیں، پرنس! سال بھر بعد آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی۔ آئیے میں آپ کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔“

اس بات پر تانیہ بھی مسکرا دی۔ اس نے سوچا کہ لیڈی برگنز اس کے ساتھ شفقت سے ہی پیش آیا کرے گی۔

ان چند باتوں میں ایک میل کا فاصلہ طے ہو گیا۔ دو باوردی شخص قریب آئے۔ ان میں سے ایک نے عماد کی طرف سے کار کا دروازہ کھولا۔ دوسرے نے تانیہ کی طرف کا دروازہ کھولا۔

لیڈی برگنز اور شرمیلا خود ہی دروازہ کھول کر اترتی تھیں۔

”پرنس!“ شرمیلا بولی۔ ”آج ہی سے حویلی میں آپ کے انتخاب کو پرنسز کہہ کر مخاطب کیا جائے گا۔“ اس کا اشارہ واضح طور پر تانیہ کی طرف تھا۔

”نہایت مناسب!“ عماد نے کہا۔

تانیہ کو خیال آیا کہ یہ کوئی دوسرا عماد ہے اور وہ نہیں ہے جس کی وہ آتش بیکریٹری تھی۔

اونچے دروازے پر قطار میں کھڑے ہوئے چہ آدمیوں نے سلامی دی۔ تانیہ کا سیدھے لبریز ہو گیا۔

☆☆☆

رات کے کھانے کے بعد لیڈی برگنز اور شرمیلا نے ان دونوں کو اداری منزل کی خواب گاہ میں پہنچا دیا جس کی آرائش دیکھ کر تانیہ نے بے اختیار کہا۔ ”یہ تو کسی مغل شہزادے کی خواب گاہ معلوم ہو رہی ہے۔“

”یہ سب کچھ شرمیلا نے کیا ہوگا۔“

”ابھی ہم جہاں جہاں سے گزرے ہیں، وہ بھی خوب ہے۔ کہیں تیروں کے اور کہیں نیم عریاں لڑکیوں کے مجھے..... کہیں بڑی بڑی پیشنگز جن کے فریم سبک سرمر کے ہیں اور.....“

”تم بہت خوش ہو۔“ عماد نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور اسے اسی طرح لیے ہوئے نہایت کشادہ بیڈ کی طرف بڑھا۔

خواب گاہ بھی بہت بڑی تھی جسے نئے انداز کے فرنیچر سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ایک سمت کی دیوار میں تین درجے تھے جن پر پڑے ہوئے پردوں کے ساتھ رنگارنگ موتیوں کی لڑیاں بھی لہرا رہی تھیں۔

”سب کچھ مجھے خواب سا لگ رہا ہے۔“ تانیہ بولی۔

”دو چاروں میں عادی ہو جاؤ گی اس ماحول کی۔“

پھر وہ دونوں بستر پر بیٹھے ہی تھے کہ تانیہ نے جلدی سے اپنا موبائل نکالا۔

”ارے!“ عماد بولا۔ ”اس وقت کے فون کرو گی؟“

”فون نہیں کرنا۔ کوئی میسج آیا ہے۔ اوہ!“ تانیہ میسج دیکھ کر مسکرا دی پھر اس نے موبائل عماد کے سامنے کر دیا۔

میسج شینے کا تھا۔ ”میری پھولوں کی طرح مچکتی خواہشات کے ساتھ شب عروسی مبارک ہو۔“

”خوب!“ عماد نے کہا۔ ”کوئی بہت قریبی دوست ہے۔“

”اور بہت پیاری۔“ تانیہ نے جواب دینے کے بعد شینے کو میسج بھیجا۔

”تمہارے اس پیار کو میرا بہت سا پیارا آئینے میں اپنے عکس کو میری طرف سے پیار کرنا۔“

اسی وقت عماد نے تانیہ کو پیار کر لیا اور اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔

ثانیہ بولی۔ ”ایسی ہی کسی خواب گاہ میں آپ سال بھر پہلے بھی اتنے ہی خوش ہوتے تھے؟“

”کیا؟“ عماد بلیکٹ بہت سنجیدہ ہو گیا۔

ثانیہ بولی۔ ”یہی تھوڑا سا شائلی ہوئی۔“

عماد ایک جھٹکے کے ساتھ بستر سے اتر گیا۔ خوشی کا سارا تاثر اس کے چہرے سے غائب ہو گیا۔ ثانیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ عماد کا چہرہ اسے پتھر یا ہوا سا لگتا تھا۔

”پرنس!“ ثانیہ پریشان ہو گئی۔

عماد اسے کوئی جواب دیے بغیر تیزی سے ایک درہچے کی طرف بڑھا۔ ثانیہ گھبرا کر بستر سے اتری۔ اس نے دیکھا کہ عماد نے جھٹکے سے پردے اٹھائے۔ دونوں ہاتھوں کے زور پر اوپر اٹھا اور نیچے چھلانگ لگا دی۔

”پرنس!“ ثانیہ چیخ پڑی اور دوڑتی ہوئی درہچے تک پہنچی۔ اس نے خاصی حد تک آگے جھک کر نیچے دیکھا۔ اس طرف بہت بڑا سوئٹنگ پول تھا۔ عماد اسی میں نظر آیا۔

ثانیہ دوڑتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ ننگے پیر تھی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی کہ شرمیلا سامنے آگئی۔

”کیا بات ہے پرنسز! آپ بہت گھبرائی ہوئی ہیں۔“

پرنس کہاں ہیں؟“

”انہوں نے درہچے سے نیچے سوئٹنگ پول میں چھلانگ لگا دی۔ میں وہیں جانا چاہتی ہوں۔“

”آپ تو نیچے جانے کا اور سوئٹنگ پول تک کا راستہ جانتی ہی نہیں۔ چلیں، میں آپ کو پہنچا دیتی ہوں۔“ شرمیلا نے ثانیہ کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف قدم بڑھایا۔ ”لیکن وہ سوئٹنگ پول میں اس وقت کیسے کود گئے؟“

”بہت غصے میں آگئے تھے۔ بس اچانک اٹھے اور۔۔۔۔۔“

”غصے میں کیوں؟“ شرمیلا رک گئی۔

”شاید انہیں میری ایک بات بہت بری لگی تھی۔“

اب شرمیلا نے اس کا راستہ روک لیا۔ ”پھر تو آپ واپس جائیے۔ جب انہیں غصہ آجائے تو کسی کو ان کے قریب جانے کی اجازت نہیں۔“

”میں کی نہیں ہوں۔“ ثانیہ ہڈیانی انداز میں بولی۔

”ان کی بیوی ہوں۔“

”آپ بھی اس وقت ان کے قریب نہیں جاسکتیں۔ واپس جائیے۔“ شرمیلا کے لہجے میں سختی تھی۔

”تم کون ہوتی ہو مجھے حکم دینے والی۔“ ثانیہ چیخ پڑی۔

”سوری!“ شرمیلا کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ”میں نے وہ کہا ہے جو آپ کے حق میں بہتر ہے۔“

کسی طرف سے لیڈی برگنزا اتیزی سے وہاں آئی۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”آپ باہر کیوں ہیں پرنسز۔۔۔۔۔ اور ننگے پیر؟“

”میں سوئٹنگ پول تک جانا چاہتی ہوں۔“ ثانیہ بولی۔

”کیوں؟ اور پرنس کہاں ہیں؟“

ثانیہ سے پہلے شرمیلا بول پڑی۔ ”آس نے وہ ساری بات بتائی جو اسے ثانیہ سے معلوم ہوئی تھی پھر کہا۔“ میں نے ان سے کہا کہ وہ واپس جائیں۔ پرنس غصے میں ہوں تو کسی کو ان کے پاس جانے کی اجازت نہیں۔ اس بات پر یہ مجھ پر بگڑنے لگیں کہ تم کون ہوتی ہو مجھے حکم دینے والی۔“

”شرمیلا ٹھیک کہہ رہی ہے پرنسز!“ لیڈی برگنزا نے آہستگی سے ثانیہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”دیے آپ نے کیا کہا تھا جو انہیں غصہ آیا؟“

”ان کی پہلی بیوی کا نام شائلی ہے نا؟“ ثانیہ نے پوچھا۔

لیڈی برگنزا چند لمحے تک تو ثانیہ کا منہ کھینچتی رہی پھر اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ”آپ کو ان سے شائلی کی بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ جو بھی ان سے شائلی کی بات کرے، وہ اس سے خوش نہیں رہتے۔ آپ خواب گاہ میں جائیے، آرام کیجیے۔ جیسے ہی ان کا غصہ ٹھنڈا ہوگا، وہ آپ کے پاس آجائیں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ آپ سے بہت محبت کرنے لگے ہیں۔“

”یہ کیسی محبت ہے کہ۔۔۔۔۔“

لیڈی برگنزا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نے کہا نا۔۔۔۔۔ آپ جا کر آرام کیجیے۔ پرنس خود آجائیں گے آپ کے پاس۔“

ثانیہ ایک جھٹکے سے بیڑی اور تیزی سے چل کر بستر پر جا لیٹی۔ اس کی آنکھیں میٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے اس طرح ذلیل کرنے سے بہتر تھا کہ وہ مجھے ہمیشہ کے لیے واپس اپنے شہر بھیج دیتے۔ وہ اب عماد کو شدت سے چاہنے لگی تھی اور اس سے دور نہیں ہونا چاہتی تھی۔

کچھ دیر تک رونے کے بعد اس نے اپنی آنکھیں خشک کیں اور اس کا چہرہ ایسا نظر آنے لگا جیسے پتھر یا گھاس ہو گیا۔ لیڈی برگنزا کی آواز اس کے دماغ میں گونجی رہی۔

”جیسے ہی ان کا غصہ ٹھنڈا ہوگا، وہ آپ کے پاس آجائیں گے۔ غصہ کب ٹھنڈا ہوگا؟ ثانیہ نے سوچتے ہوئے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی جو عماد نے اس کی کلائی پر خود باندھی تھی۔ گھڑی میں ہندسوں کی جگہ نئے سے ہیرے تھے جو ظاہر کر رہے تھے کہ عماد کو گئے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ

ہو گئے تھے۔

حویلی پر مکمل سکوت طاری تھا۔ دو گھنٹے اور گزر گئے، عماد نہیں آیا۔

وقت گزرتا رہا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کہیں بہت دور چلی گئی تھی۔ وقت اس طرح گزرا کہ صبح ہو گئی۔ وہ اس وقت بیدار ہوئی کہ عماد نظر آیا۔ وہ لباس تبدیل کیے ہوئے ایسا ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا جیسے پوری نیند لے کر اٹھا ہو۔

”ارے!“ وہ بولا اور تیزی سے ثانیہ کے قریب آیا۔ ”تمہاری آنکھوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تم سوئی ہی نہیں ہو۔“

ثانیہ روتے ہوئے اس کے سینے سے لگ گئی۔ عماد نے بھی اسے اپنی آغوش میں بھر لیا اور اپنے ہونٹ اس کے گال پر رکھ کر بولا۔ ”جلدی سے شاور لے لو۔ بریک فاسٹ لینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ پھر وہ ثانیہ کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو پونے لگا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

”کم ان۔“ عماد نے بلند آواز میں کہا۔

ثانیہ نے جلدی سے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔ اس نے دروازہ کھولنے کی آواز کے بعد لیڈی برگنزا کی آواز سنی۔ ”بریک فاسٹ دس منٹ میں لگایا جا چکا ہوگا پرنس!“

”آج کچھ تاخیر سے بریک فاسٹ لیا جائے گا۔“

پرنسز ابھی تیار نہیں۔“

ثانیہ تیزی سے ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

”بہتر ہے پرنس!“ لیڈی برگنزا کی آواز سنائی دی۔

ثانیہ ہاتھ روم میں داخل ہو گئی۔ ہاتھ روم کو اس نے نظر انداز کر دیا اور صرف منہ دھویا۔ ہاتھ روم اتنا بڑا تھا کہ اس کے دوسرے حصے میں وہ سب سامان تھا جو ڈریسنگ روم میں ہوتا ہے۔ ثانیہ کو تیار ہونے میں آدھا گھنٹا لگا۔ اس نے نعلت کی گئی اور سوچتی رہی کہ کیا عماد کی محبت ایسی ہی رہے گی کہ اسے رلاتی رہے؟

وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو عماد ٹپکتے ہوئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

”گڈ!“ اس نے ثانیہ کو تفریحی نظروں سے دیکھا۔

”بہت اچھی لگ رہی ہو۔“

ثانیہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

”آؤ۔“ عماد نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی خاص بات ہوئی

ہی نہ ہو یا جیسے اسے کبھی آجانی نہ ہو۔

ڈانگ ہال کی طرف جاتے ہوئے اس نے ثانیہ سے کہا۔ ”میری ایک چھوٹی بہن ہے۔ چند سال چھوٹی ہے۔ انیلا نام ہے۔ شادی شدہ ہے۔ دو سال پہلے اس کی شادی ہو گئی تھی۔ شوہر پولیس آفیسر ہے، ایس ایس ڈاؤر! انیلا کا فون آیا تھا۔ ناراض ہو رہی تھی کہ میں نے اسے اپنی شادی کی اطلاع تک نہیں دی۔ اسے شادی کا کلم کیسے ہوا، یہ میں نہیں جانتا۔“ وہ ہنسا۔ ”آخر پولیس آفیسر کی بیوی ہے۔ اسے سب کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے رات کے کھانے پر بلایا ہے۔ نادر سے میں خوش نہیں ہوں لیکن ہے تو بہن کا شوہر۔ اسے بھی بلایا ہے۔ میں انیلا کی اس پسند سے خوش نہیں تھا اور نہ ہوں۔ شاید نادر بھی مجھے پسند نہیں کرتا لیکن رشتے کی وجہ سے ہم دونوں ایک دوسرے سے ملنے پر مجبور ہیں۔ تمہیں اتنی تفصیل سے یہ سب کچھ اس لیے بتا دیا کہ گفتگو کرتے ہوئے انہیں محسوس ہو کہ تم ان کے بارے میں سب کچھ جانتی ہو۔“

متحدہ عرب امارات میں مقیم

اردو قارئین کے لیے خوشخبری

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز کراچی (پاکستان)

کے چاروں رسائل

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت

ایک فون کال کے فاصلے پر

آپ کال کریں، مطلوبہ رسالہ آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔ اردو بک ورلڈ ایف زیدی۔ بزنس سینٹر، شارجہ پبلشنگ سٹی فری زون، الزاہیہ، شیخ محمد بن زائدہ روڈ کی ای 311 شارجہ

971504805734

URDU BOOKS WORLD FZC.

BUSINESS CENTRE

SHARJAH PUBLISHING CITY

FREE ZONE, AL ZAHIA,

SHEIKH MOHAMMED BIN ZAYED RD, E311, SHARJAH, UNITED ARAB EMIRATES

”میں خیال رکھوں گی۔“ ثانیہ نے کہا۔
اس وقت وہ دونوں ڈانٹنگ ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ بہت لمبی ڈانٹنگ لمبل تھی جس پر بریک فاسٹ کے لیے نہ جانے کیا کچھ موجود تھا۔ اتنا کچھ کہ دو درجن افراد کے لیے بھی کافی ہوتا۔

”آخر ایک پرس کی ڈانٹنگ لمبل ہے۔“ ثانیہ نے سوچا۔
ایک سوٹڈ بونڈ جس انہیں سر کرنے کے لیے موجود تھا۔ اس نے عماد کے بعد ثانیہ کو بھی نیپکن دیا تو ثانیہ کو جھکا لگا۔ نیپکن پر وہی پینٹنگ چھپی ہوئی تھی جو ثانیہ نے پہلی بار عماد کے کمرے میں دیکھی تھی۔ ایک سابق آئسن سیکریٹری کے بقول اس پینٹنگ میں کئی جگہ تجریدی انداز میں شانی کا نام لکھا تھا جسے وہی پڑھ سکتا تھا جو تجریدی آرٹ کو سمجھتا ہو۔
”شاید گزشتہ رات کے کھانے پر بھی ایسا ہی نیپکن ہو۔“ ثانیہ نے سوچا۔ اس وقت وہ اس کی طرف دھیان نہیں دے سکی تھی۔

عماد نے اورج اسکاوش کا ایک گھونٹ لے کر ثانیہ سے کہا۔ ”مجھے ابھی ایک کام سے جانا ہے۔ گھبرانا مت۔“
شرمیلا انہیں اسٹرین کرے گی۔ میں نے اسے ہدایت کر دی ہے۔ وہ حویلی کی صرف ڈیکوریشن نہیں، ہر معاملے میں آگے آگے رہتی ہے۔ اسے لیڈی برگنزا کی معاون سمجھو۔“
اسی وقت لیڈی برگنزا اندر آئی۔ ”سب کچھ ٹھیک ہے پرنسز؟“ اس نے ثانیہ سے پوچھا۔

”ہی۔“ ثانیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”حویلی میں آپ کی وجہ سے سب کچھ ٹھیک ہی رہتا ہوگا۔“
لیڈی برگنزا کے پیچھے شرمیلا بھی آئی۔ ثانیہ نے اس سے نظریں چرا لیں جبکہ وہ ثانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے خوش دلی سے مسکرائی۔ بریک فاسٹ کے بعد عماد نہیں چلا گیا۔
شرمیلا نے ثانیہ سے کہا۔ ”میں آپ کی پسند اور نا پسند سے واقف ہونا چاہتی ہوں پرنسز! پرس مجھے ہدایت کر گئے ہیں کہ۔۔۔“

”وہ مجھے بتا گئے ہیں۔“ ثانیہ نے اس کی بات کاٹی۔
”لیکن میں اس وقت صرف سونا چاہتی ہوں۔“
”بہتر ہے۔“ شرمیلا نے کہا۔ ”میں آپ کو خواب گاہ تک پہنچا دیتی ہوں۔“
”میں خود چلی جاتی ہوں۔“

”آپ جھٹک جائیں گی پرنسز!“ شرمیلا نے کہا۔
”یہاں تو آپ کو پرس لے آئے تھے۔ آپ تنہا واپس نہیں جاسکتیں گی۔ میں آپ کو کئی مرتبہ ساری حویلی دکھاؤں گی تو

آپ کچھ کچھ سمجھ سکیں گی۔ فی الحال تو یہ حویلی آپ کے لیے بھول چلیاں ہی ثابت ہوگی۔“
”شرمیلا ٹھیک کہہ رہی ہے پرنسز!“ لیڈی برگنزا نے لقمہ دیا۔

خود ثانیہ کو بھی احساس تھا کہ وہ عماد کے ساتھ جن راہداریوں سے گزر کر وہاں تک آئی تھی، وہ اب اسے یاد نہیں تھیں۔

☆☆☆

رات کے کھانے پر انیلا اور ایس بی نادر، عماد اور ثانیہ سے باتیں بھی کر رہے تھے بلکہ انیلا، ثانیہ سے زیادہ باتیں کر رہی تھی اور بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ عماد اور نادر ایک دوسرے سے بہت کم مخاطب ہو رہے تھے۔ عماد تو بہت ہی کم بول رہا تھا۔ کوئی بھی محسوس کر سکتا تھا کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے ٹالاں ہیں۔

کھانے کے بعد قبوہ بننے کے لیے لیڈی برگنزا انہیں ایسی جگہ لے گئی جسے لاؤج کہا جاسکتا تھا۔ شرمیلا بھی ساتھ تھی لیکن وہ دونوں ان کے ساتھ نہیں بیٹھیں، بس انہیں دیکھتی رہیں اور آپس میں دیرے دیرے باتیں کرتی رہیں۔

قبوہ صرف انیلا اور ثانیہ ہی رہی تھیں۔ عماد اور نادر شیمپین پی رہے تھے۔ اچانک عماد ہاتھ میں پیگ لیے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں اس وقت باہر کا نظارہ کرنا چاہتا ہوں۔ شرمیلا نے مجھے بتایا ہے کہ آج رات آسمان تاروں سے بھرا ہوا ہے۔“ وہ ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔

”پرنسز!“ نادر، ثانیہ سے بولا۔ ”مہمان نوازی کوئی آپ کے شوہر سے ہی سیکھ سکتا ہے۔“

”اس وقت یہ کہنا ضروری نہیں تھا۔“ انیلا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ نادر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔ انیلا، ثانیہ سے باتیں کرنے لگی۔

”تاروں بھرا آسمان۔۔۔۔۔“ نادر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”ذرا میں بھی دیکھ لوں۔“ وہ اسی طرف بڑھ گیا جدھر عماد گیا تھا۔ پیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔

تین چار منٹ تک انیلا اور ثانیہ کے درمیان باتیں ہوتی رہیں۔ ثانیہ بے چین رہی۔ نہ جانے کیوں اس کی خواہش تھی کہ وہ عماد اور نادر کی باتیں سنے۔ اسے یقین تھا کہ نادر، عماد کی طرف ہی گیا ہے۔

”انیلا!“ ثانیہ سے رہانہ گیا۔ ”اگر تم برانہ ناتو میں ذرا اپنے بیڈروم سے ہو کر واپس آئی ہوں۔“

”ارے نہیں۔ میں برا کیوں مانوں گی۔ بس، ذرا جلدی آئے گا۔“

ثنانیہ نے شرمیلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم چند منٹ انیلا کو انٹرٹین کرو۔“

”ضرور۔“ شرمیلا مسکرا دی۔
لیڈی برگنزا کے چہرے پر کچھ فکر مندی تھی۔ وہ بار بار اس طرف دیکھ رہی تھی جدھر عماد اور نادر گئے تھے۔ ثانیہ دوسری طرف سے گھوم کر اس طرف بڑھی جہاں اس کے اندازے کے مطابق عماد اور نادر کو ہونا چاہیے تھا۔ اس طرف کئی در پیچھے تھے جن سے باہر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔

ثنانیہ کو تین در پیچوں میں سے درمیانی در پیچے پر عماد اور نادر دکھائی دے گئے۔ ثانیہ کی طرف ان کی پشت تھی۔ وہ دے قدموں اتنی آگے بڑھی کہ ان کی آوازیں سن سکے۔ ایسی جگہ اسے کسی دھات کے گل دان کی آڑ بھی مل گئی۔ گل دان خاصا اونچا اور اتنا چوڑا تھا کہ اس کی آڑ میں دو آدمی بھی چھپ سکتے تھے۔ گل دان میں لگے ہوئے مصنوعی پھول بھی بڑے بڑے تھے۔

وہاں سے ثانیہ نے نادر کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا۔ ”موت طبعی بھی ہوتی ہے، حادثاتی بھی اور قتل کی وجہ سے بھی۔ میں جس کیس کی تفتیش کر رہا ہوں، وہ مجھے مرڈر معلوم ہوتا ہے اور تین کرپس پرس کہ پولیس جان کر رہے گی کہ شانی کی موت طبعی تھی یا اس کا مرڈر۔۔۔۔۔“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی عماد نے اپنا پیگ بڑے غصے سے فرش پر پھینچ دیا۔ اس میں تھوڑی سی شراب رہ گئی تھی جو فرش پر پھینکی اور کرپل پیگ ریڑھ ریڑھ ہو کر بکھر گیا۔

عماد تیزی سے جس جانب مڑا، ادھر ہی ثانیہ کھڑی تھی۔ اس نے جلدی سے خود کو زیادہ سے زیادہ چھپایا۔ اس نے چند لمحوں میں دیکھ لیا تھا کہ عماد کے چہرے پر شدید تناؤ تھا۔ وہ تیزی سے چلا ہوا ثانیہ کے قریب سے گزر گیا۔ اگر وہ سرگھبرا کر دیکھ لیتا تو اسے ثانیہ دکھائی دے جاتی۔ اسی خدشے کے تحت ثانیہ کا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا تھا لیکن عماد کسی جانب سرگھمائے بغیر تیزی سے ٹھٹکا چلا گیا۔

ثنانیہ نے سکون کی سانس لیتے ہوئے گل دان کی دوسری جانب سے در پیچے کی طرف جھانکا۔ اسے نادر کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ دکھائی دی۔ وہ شراب کا ایک گھونٹ لے کر اس طرف جانے لگا جہاں سے اٹھ کر آیا تھا۔ ثانیہ بہت تیزی سے چلتے ہوئے نادر سے پہلے انیلا

شکایت

گاہک۔ (ہوں کے مالک سے) ”یہ تو کیا بہت گندنا ہے۔ ہاتھ صاف کرنے کے قابل نہیں۔“
مالک۔ ”عجب بات ہے۔ صبح سے سو آدمی اس سے ہاتھ صاف کر چکے ہیں مگر کسی نے شکایت نہیں کی۔“

مرسلہ۔ غلام حسین اختر، سرگودھا

مردہ پرست

ہم لوگ زندہ بندے کو تو روٹی نہیں دے مگر مرے ہوؤں کے نام پر دیکھیں پکا کر ان لوگوں کو کھلا دیتے ہیں جن کے پیٹ پہلے ہی بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

اشفاق احمد کی تحریر سے اقتباس
مرسلہ۔ جادو اختر رانا، پاکستان شریف

کے قریب پہنچ گئی جہاں شرمیلا اس سے کہہ رہی تھی۔ ”میں آج پرنسز کو ساری حویلی دکھاؤں گی۔“
”ضرور دکھانا چاہیے۔“ انیلا نے کہا۔ ”بس اس طرف نہ لے جانا۔“
”کس طرف کے لے جانے کی بات ہو رہی ہے؟“
نادر نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

”ضرور ہی ہے کہ پرنسز کو ساری حویلی دکھا دی جائے۔ کسی کو بھی حویلی کے راتے آسانی سے یاد نہیں رہ سکتے۔“
”سوری انیلا!“ ثانیہ نے کہا۔ ”میں جو چیز لینے گئی تھی، وہ ملی نہیں۔ جانے کہاں رکھ کر بھول گئی ہوں۔“

”کیا چیز ہے پرنسز! میں ڈھونڈ دوں گی۔“ شرمیلا بولی۔
ثنانیہ، انیلا سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن انیلا کے موبائل پر کال آئی اور اس نے موبائل کان سے لگایا۔

”بہتر بہتر۔“ انیلا نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا اور نادر کو گھورتے ہوئے کچھ کہنے والی تھی کہ نادر بول اٹھا۔
”بس، اب گھر چلو۔“ وہ خالی پیگ رکھ کر جانے کے لیے مڑ گیا۔

انیلا بہت سنجیدہ نظر آنے لگی تھی لیکن اس نے اٹھ کر ثانیہ کو گلے لگایا۔
”بہت سنجیدہ ہو گئیں۔“ ثانیہ نے کہا۔ ”کس کا ٹون تھا؟“
انیلا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”پرس کہہ رہے تھے کہ میں اپنے شوہر کے ساتھ فوراً یہاں سے چلی

جاؤں۔“ پھر وہ زبردستی مسکرائی۔ ”پھر ملیں گے۔“ وہ تانیہ سے الگ ہو کر نادر کے پیچھے چلی گئی۔

لیڈی برنگز کے چہرے پر اب بھی کبیر تاتی۔ اس نے کہا۔ ”یہ دونوں جب تہائی میں بیٹھا ہوتے ہیں تو ضرور کچھ گڑبڑ ہوتی ہے۔ نادر نے ضرور کوئی ایسی بات کہہ دی ہوگی کہ پرس کو غصہ آ گیا اور انہوں نے ایلا کو فون کر دیا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ فوراً چلی جائے۔ نہ جانے نادر کیا کہہ بیٹھا ہے۔“

تانیہ جانتی تھی کہ پرس کے غصے کا سبب یہ تھا کہ نادر نے شائلی کا نام لیا تھا۔ اس کی باتیں تانیہ کے لیے سستی خیز بھی تھیں۔ لہذا ایسا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ شائلی کوئی کیا گیا تھا۔

”آئے پرسز!“ شرمیلا بولی۔ ”آپ کو حویلی دکھاؤں۔“

”حویلی کے ارد گرد کا جائزہ لینا چاہتی ہوں۔“ تانیہ نے کہا۔ ”لیکن پہلے ذرا ایک بار پھر اپنی خواب گاہ میں جاؤں گی۔“

”آپ دراصل پرسز کو دیکھنا چاہتی ہیں۔“ شرمیلا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن وہ آپ کو وہاں نہیں ملیں گے۔ حویلی سے ہی کہیں چلے گئے ہوں گے۔“

”میں خواب گاہ میں جانا چاہتی ہوں۔“ تانیہ نے مڑتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے وہاں کا راستہ تو یاد کر لیا ہے۔“

ناشتے کے بعد جب وہ شرمیلا کے ساتھ خواب گاہ میں گئی تھی تو اس نے راہدار پوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔

”جائے۔“ شرمیلا نے کہا۔ ”اگر آپ بھنگ بھی منگیں تو میں آپ کو ڈھونڈ لوں گی۔“

تانیہ نے جواب میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور قدم بڑھاتی چلی گئی۔ شرمیلا کی بات درست ثابت ہوئی۔ عمارت خواب گاہ میں نہیں تھا۔ تانیہ ٹہلنے لگی۔ نادر کے بیٹے اس کے ذہن میں گونجتے رہے۔ ان جملوں میں یہ اشارہ بھی یقیناً تھا کہ نادر، عمارت کی کوشاکی کا قاتل سمجھ رہا ہے۔

بے خیالی میں وہ دروازہ بند کرنا بھول گئی۔ شرمیلا اندر آئی۔

”میں نے کہا تھا کہ وہ اس وقت خواب گاہ میں نہیں ملیں گے۔“ وہ آتے ہی بولی۔ تانیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہونٹ سمجھ لے۔ وہ اب شرمیلا کو تائبند کرنے لگی تھی لیکن حویلی میں رہ کر اس سے گریز کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔

”وہ آجائیں گے پرسز!“ شرمیلا بولی۔ ”مگر منہ نہ ہوں یا شاید آپ ایس لپی کی باتوں پر غور کر رہی ہیں۔ آپ

انہی دونوں کی طرف گئی تھیں۔ ان کی باتیں سننا چاہتی تھیں۔ خواب گاہ میں جانے کا تو آپ نے یہاں کیا تھا۔ آپ جانتی ہوں گی کہ نادر نے کیا کہا ہوگا جس پر پرس کو غصہ آیا اور انہوں نے اپنی بہن کو فون کیا کہ وہ اپنے شوہر کو لے کر فوراً واپس چلی جائے۔“

”بہت عمار معلوم ہوتی ہے یہ۔“ تانیہ نے سوچا۔ اس نے شرمیلا کی باتوں کے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

”مجھے یقین ہے۔“ شرمیلا پھر بولی۔ ”ایس لپی نے کچھ بھی کہا ہو لیکن اس کی زبان پر شائلی کا نام ضرور آیا ہوگا۔ پرس کی اور بات پر اسے غصے میں نہیں آتے۔ آپ کو تو اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے لیکن ان باتوں میں اپنا دماغ نہ تھکا لیجئے۔ ملیں، میں آپ کو حویلی کی سیر کراؤں۔“

”میں نے کہا تھا کہ ارد گرد کا نظارہ کرنا چاہتی ہوں۔“ تانیہ نے کہا۔

”پرسز! وہ تو دن کی روشنی میں مناسب رہے گا۔“ شرمیلا نے کہا۔ ”کل میں آپ کو چھت پر لے چلوں گی۔ وہاں سے ہی اچھا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ اس وقت تو آپ حویلی کی سیر کر لیں۔“

”تو پھر میں اس کا وہ حصہ ضرور دیکھوں گی جس کے بارے میں ایلا نے تم سے کہا تھا کہ مجھے اس طرف نہ لے جانا۔“

”اوہ، تو آپ نے سن لیا تھا؟“ وہ بہت آہستہ سے بولی۔

”میری سماعت بہت تیز ہے۔“

”بہر حال، مناسب نہیں ہوگا کہ میں آپ کو اس طرف لے جاؤں۔“

”وجہ؟“

”یہ پرس کا حکم ہے کہ کوئی اس طرف نہ جائے۔ لیڈی برنگز ابھی نہیں جاسکتیں۔“

”وجہ؟“ تانیہ نے اپنا سوال دہرایا۔

شرمیلا چند لمحے چپ رہنے کے بعد بولی۔ ”وہاں شائلی کی خواب گاہ ہے۔ اس کی موت کے بعد کسی کو بھی وہاں جانے کی اجازت نہیں۔ خود پرس بھی نہیں جاتے۔“

”کم از کم اس کی طرف جانے کا راستہ ضرور دیکھوں گی۔“

شرمیلا توقف سے بولی۔ ”آپ کا اصرار نظر انداز کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔ وہ میں آپ کو دکھا دوں گی لیکن پلیز، آپ کسی وقت اس طرف جائے گا نہیں۔ اگر پرس کو معلوم ہو گیا تو وہ آپ سے بہت زیادہ ناراض ہوں گے۔“

”مجھے اندازہ ہے کہ وہ مجھ سے کس حد تک ناراض ہو سکتے ہیں۔“

”میں بھی جانتی ہوں کہ وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔“ شرمیلا نے مسکرا کر کہا۔ تانیہ کھڑی ہو گئی۔

”آئیے۔“ شرمیلا نے ادب سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ اندر سے کچھ ہے، باہر سے کچھ۔“ تانیہ سوچتے ہوئے آگے بڑھی۔

شرمیلا اسے لے کر چلی۔ تانیہ نے حویلی کے بہت سے حصوں کی آرائش پر رشتہ تبصرہ کیا اور کہا۔ ”تم غیر معمولی ڈیکور ہو۔“

”شکریہ پرسز!“

”اب میں زیادہ آگے جاؤں گی تو وہاں پر بہت تھک جاؤں گی۔“ تانیہ نے کہا۔ ”میرا اندازہ ہے کہ ابھی آدھا حصہ بھی نہیں دیکھا۔“

”درست خیال ہے آپ کا۔ ساری حویلی دیکھنے میں آپ کو تین دن تو لگ ہی جائیں گے۔ اگر دیکھے ہوئے حصوں سے سرسری گزرتی رہیں۔ کسی جگہ رک کر اس کا غائر جائزہ نہ لیں۔“

تانیہ واپسی کے لیے مڑی۔ ”کم از کم وہ حصہ ضرور دکھاؤ جہاں جانا منع ہے۔“

”آپ اس کے سامنے سے گزر چکی ہیں۔“ شرمیلا مسکرائی۔

”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ تانیہ نے خشک لہجے میں کہا۔

”اب بتا دوں گی۔ واپسی میں بھی ادھر سے گزرا جاسکتا ہے۔“

”کیا اس طرف شائلی کی خواب گاہ ہے؟“ تانیہ نے سوال کیا۔

”تم نے بتایا تھا کہ شائلی کے مرنے کے بعد ہی اس طرف جانے کے لیے پابندی لگائی گئی ہے۔“

”بے شک آپ بہت ذہین ہیں۔“

”یہ سامنے کی بات ہے۔ اس میں ذہانت کا کوئی دخل نہیں۔“

”جی..... میں آپ کی کوئی بات مسترد نہیں کر سکتی۔“

تانیہ خاموش رہی۔ قدم بڑھتے رہے۔

شرمیلا نے ایک جگہ رک کر کہا۔ ”اس طرف جانا منع ہے۔“

”اوہ۔“ فوری طور پر تانیہ کے منہ نے اتنا ہی نکالا۔

”مجھے امید ہے کہ آپ اس راہداری میں قدم نہیں رکھیں گی۔“

”میری خواب گاہ سے پہلے بھی اتنی ہی طویل راہداری ہے۔“ تانیہ نے کہا۔ ”کیا پرس اپنے لیے ایسی ہی خواب گاہ کا انتخاب کرتے ہیں؟“

”آپ کے ساتھ وہ ان کی دوسری خواب گاہ ہے۔“ شرمیلا نے کہا کہ آگے قدم بڑھائے۔ تانیہ وہاں رک کر راستے کا جائزہ لینا چاہتی تھی لیکن شرمیلا کی وجہ سے اسے بھی قدم بڑھانا پڑے۔

”میں اب آرام کرنا چاہتی ہوں۔ بہت تھک گئی ہوں۔“ تانیہ نے کہا۔ ”شاید پرس بھی آگے ہوں۔“

تانیہ کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ خواب گاہ میں عمارتیں تھیں۔

”بہر حال، اب آرام کروں گی۔“ تانیہ نے کہا۔

”تم جاسکتی ہو۔“

”جو حکم۔“ شرمیلا نے کہا اور جاتے وقت دروازہ بھیڑ گئی۔

تانیہ نے دروازہ اندر سے بند کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اجازت لیے بغیر لیڈی برنگز ابھی خواب گاہ میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ وہ بستر پر لیٹی عمار کا انتظار کرتی رہی۔ وہ زیادہ فکرمند اس لیے نہیں تھی کہ عمار اس کی وجہ سے غائب نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں ایس لپی نادر کے الفاظ چکراتے رہے۔ وہ ان باتوں کا تجزیہ کرنے سے بھی قاصر تھی۔ یہ گمان کرنا تو اس کے لیے مشکل ہی تھا کہ عمار نفرت کے باوجود شائلی کے قتل جیسی حرکت کر سکتا ہے۔ اس کی نظر میں فی الحال ایسا کوئی شخص بھی نہیں تھا جس پر وہ شبہ کر سکتی۔ اس کے علاوہ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ عمار کو اس سے نفرت کیوں ہوئی؟

انہی خیالات میں دو بجے کے بعد ہی وقت اسے نیند آگئی پھر اسے یہ احساس نہیں ہوسکا کہ کتنی دیر بعد اس نے بستر پر کسی اور کی موجودگی محسوس کی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے عمار کو دیکھا جو اس کے پہلو میں ایک کھائی آنکھوں پر کھینچا ہوا تھا۔

”اوہ، مائی پرسز!“ اس نے خوش ہو کر عمار کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”مجھے سونے دو جان!“ پرس نے اس کا ہاتھ اپنے سینے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ ساٹھا لیکن تانیہ کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے اس کے انداز میں کوئی جھنجھکی نہیں تھی۔

تانیہ سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگی کہ ابھی عمار کا غصہ کافی کم تو ہوا ہے لیکن تم نہیں ہوا ہے۔ صبح ہونے پر وہ معمول کے مطابق تھا۔ اس نے اس کا تانیہ سے باتیں کیں اور اس سے تیار ہونے کے لیے کہا۔ وہ خود بالکل تیار تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ تانیہ سے پہلے بیدار ہوا تھا۔ تانیہ تیار ہو کر اس کے ساتھ بریک فاسٹ کے لیے گئی۔

”آج بھی مجھے چھ گھنٹے کے لیے جانا چاہیے۔“ اس نے تانیہ سے کہا۔ ”کچھ ایسا کام ہے کہ روز ہی جانا پڑے لیکن یہ ضروری بھی نہیں ہے۔ شرمیلا بتاتا ہے کہ کل اس نے ہمیں حویلی کی سیر کرائی ہے۔“

شرمیلا نے مسکرا کر تانیہ کی طرف دیکھا۔ لیڈی برگنزا بھی تھیں گزشتہ روز کی طرح وہ صرف گمرانی کر رہی تھیں کہ سر دکنے والا پوری طرح چاق و چوبند ہے۔

تانیہ نے کہا۔ ”آج میں چھت پر جا کر ارد گرد کا نظارہ کروں گی۔“

”ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔“

بریک فاسٹ کے بعد شرمیلا نے کہا۔ ”چھت پر چلیں پرسن؟“

تانیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چھت پر چاروں طرف گھومنا آسان نہیں تھا۔ حویلی جتنی بڑی تھی، اس کے حساب سے چھت کو بڑا ہونا ہی چاہیے تھا۔ شرمیلا اسے بتاتی رہی۔

”یہاں سے ڈیڑھ سو میل جو پہاڑ ہیں، ان کا ایک سلسلہ ریاست تک آگیا ہے۔ دیکھ رہی ہیں آپ؟ برف اب آہستہ آہستہ پھیل رہی ہے۔“

”ہوں۔“ تانیہ نے سر ہلایا۔ ”یہ ریاست سے کتنی دور ہیں؟“

”سٹرمل کا فاصلہ ہے۔ وہاں دو درے بھی ہیں۔ ان سے گزر کر دو دوسرے شہروں تک پہنچا جاسکتا ہے۔“

”پہاڑوں کے نیچے جنگل بھی تو پھیلا ہوا ہے۔“

”جی۔“ شرمیلا نے جواب دیا۔ ”یہ جنگل زیادہ گھنے نہیں ہیں اور پہاڑی سلسلے میں چند میل دور ہیں لیکن جب برف زیادہ پھیلنے لگتی ہے تو درختوں تک پہنچ جاتی ہے۔ کسی وقت کوئی گلیشیر بھی پھسل کر جنگل تک آجاتا ہے۔“

”دروں سے گزر کر دوسرے شہر جانے کے لیے کار۔۔۔۔۔۔“

”جی نہیں۔“ شرمیلا نے اس کی بات کاٹی۔ ”جب ضروری ہے کیونکہ راستہ اونچا نیچا ہے اور جب برف پھیل رہی ہو تو اس طرف جانا خطرناک ہے۔“

”حویلی کی فصیل بہت اونچی ہے۔“ تانیہ نے کہا۔

”چھانک بھی ادھر ہی دکھائی دے رہا ہے۔“

”حویلی کا مرکزی دروازہ بھی ادھر ہی ہے نا۔۔۔۔۔۔ وہ اس طرف بلی پڑ دیکھ رہی ہیں آپ۔۔۔۔۔۔ بلی کا پتھر بھی کھڑا ہے۔ وہیں ایک گوار بھی عمارت بھی ہے۔ اس میں بلی کا پتھر کے دو پائلٹ اور بلی کا پتھر کی دیکھ بھال کرنے والے رہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ انجینئروں وغیرہ۔“

”میں اس کے بارے میں پوچھنے ہی والی تھی۔ جب ہم لوگ بلی کا پتھر سے اترے تھے تو میری توجہ تم لوگوں کی طرف تھی۔ اس چھوٹے سے کوارٹر کی طرف توجہ نہیں کی تھی لیکن جب کوئی کار میں اس طرف سے نکلتا ہے تو کیا پہاڑی درے کی طرف جاتا ہے؟“

”جی نہیں۔“ شرمیلا نے جواب دیا۔ ”پکڑ لے کر حویلی کی عقبی سمت میں جانا پڑتا ہے۔ آئیے اب اس طرف چلتے ہیں۔“

تانیہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

حویلی کی عقبی سمت میں اس نے حویلی کی فصیل سے دو فرلانگ آگے ایک دریا بہتے دیکھا۔ دریا کے پار اسٹیٹ کا شہر آباد تھا جہاں زیادہ اونچی عمارتیں نہیں تھیں۔ چھوٹے مکانوں کی بستیاں زیادہ تھیں۔ دریا پر ایک بلی بنا ہوا تھا جو بہت مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چوڑائی اتنی معلوم ہوتی تھی کہ دو سے زیادہ گاڑیاں نہیں گزرتی تھیں۔

”یہ دریا۔۔۔۔۔۔“ تانیہ بولی۔

شرمیلا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ دریا نہیں، نہر ہے لیکن اتنی چوڑی ہے کہ دریا معلوم ہوتی ہے۔“

”شہر کی طرف کے کنارے پر بہت سی کشتیاں نظر آ رہی ہیں لیکن ہماری طرف صرف دو ہی کشتیاں ہیں۔“

”ادھر زیادہ کشتیاں اس لیے ہیں کہ ساحل کے قریب پھیروں کی ہستی ہے۔ اس نہر میں پھیلنا بھی ہیں۔ ہماری طرف صرف دو کشتیاں اس لیے ہیں کہ انہیں صرف نہر کی سیر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔“

”مجھے شہر کی سیر کا بہت شوق ہے۔ سیر بھی کی ہے لیکن خود مجھے شہر جانا نہیں آتی۔“

”کچھ مشکل ہیں۔ میں سکھا دوں گی آپ کو۔“

”ابھی چلیں۔“ تانیہ نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ”لنچ میں تو ابھی دیر ہے۔“

”ابھی چلیے۔“ شرمیلا نے کہا۔ اس نے ایک طرف قدم بڑھائے۔

”پہلو تو نیچے جا کر کسی گاڑی میں فصیل کے باہر جانا ہوگا۔“

”جی نہیں۔ آپ آئیے تو۔“

”اوہ۔“ ذرا دیر بعد تانیہ کے منہ سے نکلا۔ ”ادھر تو بلی بنا ہوا ہے۔“

”جی۔“ شرمیلا نے کہا۔ ”اسی پر چل کر ہم فصیل تک پہنچ جائیں گے۔ دوسری طرف اترنے کے لیے سگی زینے ہیں۔“

”بہت سلیقہ برتا گیا ہے۔“ تانیہ نے تبصرہ کیا۔

وہ دونوں چھت چڑھے بلی پر چل کر فصیل تک پہنچیں اور سگی زینے سے اتر کر نہر کے ساحل کی طرف چل پڑیں جہاں کشتیوں کے قریب کچھ افراد بھی نظر آ رہے تھے۔

”کشتیوں کے ملاح ہیں۔“

”کسی ملاح کے سامنے سگی رانی نہیں بیٹھوں گی۔“

”ہم کسی ملاح کو ساتھ نہیں لیں گے۔“

قریب جا کر شرمیلا نے ملاحوں سے کہا۔ ”کشتی میں صرف پرسن اور میں جائیں گے۔ کشتی میں چلاؤں گی۔“

ملاحوں کو اس پر کوئی اعتراض کرنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ عماد کے ملازم تھے۔ شرمیلا تانیہ کو سب سے خوبصورت کشتی میں لے گئی۔

”یہ کشتی صرف چار افراد استعمال کر سکتے ہیں۔“

شرمیلا نے بتایا۔ ”لیڈی برگنزا، میں، پرسن اور۔۔۔۔۔۔“ وہ رکی پھر مسکرا کر بولی۔ ”اور آپ۔“

”میرا خیال ہے کہ تم شالنی کا نام لیے لیے رک لیتے ہو۔“

”تانیہ بولی۔“

شرمیلا نے چپو سنبھالتے ہوئے قدرے توقف سے کہا۔ ”جی ہاں، لیکن اب وہ نہیں ہے، آپ ہیں۔“

”ہوں۔“ تانیہ ادھر ادھر نظر دوڑانے لگی۔ پلٹ کر حویلی کی طرف بھی دیکھا۔

”وہ درہینے دیکھ رہی ہیں آپ؟“

”ہاں، نظر پڑی ہے ان پر۔“

”وہ شالنی کی خواب گاہ ہے۔“

تانیہ شرمیلا کا منہ کھتی رہ گئی۔

کشتی خاصی آگے بڑھ چکی تھی۔ شرمیلا بولی۔ ”اب آپ میرے قریب آکر بیٹھیے۔ میں بتاؤں گی کہ آپ چپو کیے سنبھالیں گی اور کیسے انہیں حرکت دیں گی۔ یہ کوئی مشکل آرٹ نہیں ہے۔ بس چپو چلانے میں ذرا طاقت لگانا پڑتی ہے۔“

تانیہ اس کے قریب جا بیٹھی اور پھر اس کی فریڈنگ شروع ہوئی۔ آدھے گھنٹے بعد ہی تانیہ نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بس میرے بازو جھکنے لگے ہیں۔ اب واپس چلا جائے۔“

”اب آپ بس بیٹھی رہیے۔ میں کشتی واپس لے جاتی ہوں۔ آپ لے جائیں گی تو بازو بہت زیادہ جھک جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ تانیہ نے کہا۔ ”میں دو چار بار اور مشق کر لوں تو بازوؤں کی جھکن کا اتنا زیادہ احساس نہیں ہوگا۔“

شرمیلا نے اس سے اتفاق کیا۔

☆☆☆

آئندہ چند دنوں تک عماد کا معمول رہا کہ وہ بریک فاسٹ کے بعد کھیں جاتا تو چھ کے وقت لوٹا پھر شام کو یا اوائل رات میں کھیں جاتا تو آدھی رات کو لوٹا لیکن تانیہ خوش تھی کہ باقی وقت تانیہ ہی کے ساتھ گزارتا اور تانیہ کو اس کی بھرپور محبت ملتی۔

رات کو وہ شرمیلا کے بغیر حویلی میں گھومتی رہتی تاکہ راستے اچھی طرح یاد ہو جائیں خصوصاً وہ راستہ جو شالنی کی خواب گاہ کی طرف جاتا تھا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ کتنی کتنی رات کو شالنی کی خواب گاہ میں ضرور جائے گی۔ وہ جانا چاہتی تھی کہ وہاں جانا کیوں ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ آخر وہاں ایسی کیا خاص بات تھی جو عماد و دوسروں کی نظروں میں نہیں لانا چاہتا تھا۔

اس نے شرمیلا کے ساتھ کشتی رانی کی مشق دو دن کی تھی۔ تیسرے دن سے وہ کشتی میں تنہا جانے لگی۔ اسے کشتی میں سیر کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ کشتی چلاتے ہوئے اس کی نظریں بار بار ان درپچوں کی طرف ضرور اٹھتی تھیں جن کے بارے میں شرمیلا نے بتایا تھا کہ وہ شالنی کی خواب گاہ کے درہینے تھے۔

وہ آٹھواں دن تھا جب وہ تنہا سیر کر رہی تھی۔ اس دن وہ شام کے وقت جب کشتی کو واپس ساحل کی طرف لے جانے لگی اور اس کی نظریں شالنی کی خواب گاہ کے ایک درہینے کی طرف اٹھیں تو اس نے دیکھا کہ جھٹلی بنا کر کسی نے جھانکا تھا اور پھر جھٹلی برابر کر دی تھی۔

تانیہ کو یوں لگا جیسے اس کا دل اچھل کر قلع میں آگیا ہو۔ شالنی کی خواب گاہ میں وہ آخر کون تھا جس نے درہینے سے جھانکا تھا۔ وہ جتنی تو بے رہی تھی کہ وہاں کوئی نہیں ہے اور کسی کو وہاں جانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔

تانیہ تیزی سے چپو چلاتے ہوئے ساحل تک پہنچی پھر تقریباً دوڑتی ہوئی سگی زینے تک گئی۔ فصیل پر پہنچ کر بلی عبور کیا۔ اس نے تیزی سے لڑکھا کہ اسی وقت شالنی کی خواب گاہ میں جانے کی۔

جب وہ حویلی میں داخل ہوئی تو رات کا اندھیرا زمین پر آچکا تھا۔ حویلی میں تیز مسموئی روشنیاں بھیلیاں جا بگی تھیں۔ وہ تیزی سے شالنی کی خواب گاہ کے راستے پر بڑھنے لگی۔ اس کی کوشش تھی کہ اس کے قدموں کی آواز لیڈی برگنزا یا شرمیلا تک نہ پہنچ سکے۔ آخر اس نے راہداری میں

قدم رکھ دیا پھر آٹھ دس قدم ہی اٹھائے تھے کہ عقب سے لیڈی برنگروا کی آواز سنائی دی۔
 ”رک جائیے پرنسز! اور نہ جائیے۔“
 لیکن ثانیہ پر اس وقت جنون طاری تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں اور آگے بڑھتی رہی پھر اس نے قدموں کی ایسی آوازیں سنیں جیسے پیچھے سے کوئی دوڑ کر اس کی طرف آ رہا ہو۔ اس نے اب بھی پلٹ کر نہیں دیکھا لیکن اس وقت اسے رکنا ہی پڑا جب شرمیلا اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔
 ”ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔“ ثانیہ چیخ پڑی۔
 ”ہرگز نہیں ہٹوں گی۔“ شرمیلا نے کہا۔ ”آپ وہاں نہیں جاسکتیں۔ پرنس کو معلوم ہو جائے گا تو ان کے غصے کا نشانہ آپ نہیں، میں بنوں گی۔“
 ”تو کی تو بہنو، میں آج جاؤں گی۔“
 تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے لیڈی برنگروا بھی قریب آ گئی۔
 ”واپس لو پیے پرنسز!“ ثانیہ نے پہلی بار ان کے لہجے میں بے پناہ سختی محسوس کی۔
 ”میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہاں کون ہے۔“ ثانیہ نے کہا۔
 ”وہاں کوئی نہیں ہے۔“
 ”ہے۔“ ثانیہ نے زور دے کر کہا۔ ”میں سستی میں سیر کر رہی تھی تو اس کے در پیچے سے کسی نے جھانک کر مجھے دیکھا تھا۔“
 ”کیا؟“ حیرت سے لیڈی برنگروا کا چہرہ کھلا کھلا رہ گیا۔ اس نے شرمیلا کی طرف دیکھا۔ شرمیلا بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
 ”آخر کون ہے وہاں؟ کون ہو سکتا ہے؟“ ثانیہ ہانپنے لگی۔
 لیڈی برنگروا نے مضبوطی سے اس کی کلائی پکڑ لی۔
 ”واپس چلیے۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ وہاں سے کس نے جھانکا ہوگا۔“
 ”کس نے؟“ ثانیہ بہت بے تاب تھی۔
 ”آپ راہداری سے باہر تو نکلیں۔“ لیڈی برنگروا کے لہجے میں نرمی آ گئی تھی۔ ”میں بتاؤں گی آپ کو۔“
 ”میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔“
 ”اے کوئی بھی اس طرح نہیں دیکھ سکتا جس طرح آپ دیکھنا چاہتی ہیں۔“

”کیوں؟“
 ”ابھی بتاتی ہوں۔“ وہ ثانیہ کو راہداری سے نکال لے گئیں۔ ایک قدم پیچھے شرمیلا بھی تھی۔ راہداری سے نکل کر لیڈی برنگروا رکیں اور شرمیلا سے کہا۔ ”بتاؤ انہیں کہ در پیچے سے کس نے جھانکا ہوگا۔“
 ثانیہ نے شرمیلا کی طرف دیکھا۔
 ”وہ.....“ شرمیلا رک کر بولی۔ ”شائنی کی روح ہوگی۔“
 ”کیا؟“ ثانیہ کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔
 ”میں پرنسز!“ لیڈی برنگروا بولی۔ ”وہ بیٹے میں ایک دوسرے جوہلی میں ضرور دکھائی دیتی ہے اور جب کوئی اس کے قریب جانے کی کوشش کرتا ہے، وہ غائب ہو جاتی ہے۔“
 ثانیہ نے حیرت سے لیڈی برنگروا کا چہرہ دیکھا جس پر ”جھوٹ“ کی کوئی علامت نہیں تھی۔
 ”ہاں۔“ لیڈی برنگروا نے مزید کہا۔ ”وہ بھی شرمیلا کو نظر آتی ہے اور کبھی مجھے۔ آپ کی ضد دیکھ کر بتا دیا میں نے آپ کو۔ اب پلنیز! پرنس سے نہ کہیے گا کہ ہم نے آپ کو یہ سب کچھ بتایا ہے۔“
 ”کیوں؟“
 ”وہ ہم پر غصے سے برسن پڑیں گے۔“
 ”غصہ اس بات پر کہ مجھے یہ سب کچھ بتا دیا گیا؟“
 ”ہاں۔ وہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ آپ خوفزدہ ہو جائیں۔“
 ”وہ بھی یہ سب کچھ جانتے ہیں؟“
 ”نہ صرف جانتے ہیں بلکہ کئی بار انہیں بھی شائنی کی روح نظر آ چکی ہے۔“
 ”مائی گاڈ!“ ثانیہ کے منہ سے نکلا اور سب کچھ سچ سمجھنے کے بعد اس کے روٹنے لگے ہوئے۔
 ”چلیے یہاں سے!“ لیڈی برنگروا نے پھر اس کی کلائی پکڑ لی۔
 ”میں چل رہی ہوں۔“ ثانیہ نے آہستہ سے کہا اور واپسی کے راستے پر قدم بڑھا دیے۔
 لیڈی برنگروا نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور کہا۔
 ”خواب گاہ میں لیٹ کر خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کیجیے۔ پرنس کے آنے میں ابھی دیر ہے۔ ان کے آنے تک آپ ایسی بن جائیے جیسے آپ شائنی کی روح کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔“
 ثانیہ نے آہستہ سے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ لیڈی

برنگروا اسے خواب گاہ میں لے گئی اور اسے بڑی محبت سے بستر پر لٹایا۔ شرمیلا بھی ساتھ آئی تھی لیکن دروازے سے واپس لوٹ گئی۔
 ”بیٹھے سبز برنگروا!“ ثانیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر پر اپنے قریب بٹھایا اور بولی۔ ”کہاں دیکھا ہے آپ نے شائنی کی روح کو؟“
 ”کئی ایک جگہ نظر نہیں آتی۔“ لیڈی برنگروا نے جواب دیا۔ ”کبھی حویلی کی کسی راہداری میں جاتی نظر آتی ہے، کبھی اس پل پر دکھائی دیتی ہے جو حویلی کو صیل سے ملاتا ہے۔ کبھی نہر پر پلٹتی دکھائی دیتی ہے۔ غرض یہ کہ وہ حویلی میں یا حویلی کے آس پاس کہیں دکھائی دے جاتی ہے۔“
 ”پرنس نے اسے کہاں دیکھا تھا؟“ ثانیہ نے پوچھا۔
 ”وہ اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہی تھی۔“
 ”راہداری میں؟“
 ”ہاں۔“ لیڈی برنگروا نے جواب دیا۔ ”پرنس اس کی طرف دوڑ پڑے تھے لیکن وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پرنس شاید مجھے نہ بتاتے لیکن میں اس وقت کسی طرف جانے کے لیے اس راہداری کے سامنے سے گزری تھی۔ میں نے پرنس کو راہداری سے باہر آتے دیکھا تھا۔ وہ مجھے اور میں انہیں راہداری سے لکھا دیکھ کر چونکے تھے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا تھا کہ انہیں اس طرف کوئی جاتا دکھائی دیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑے تھے لیکن پھر انہیں کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ انہوں نے حقیقت چھپانے اور مجھے ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ انہیں وہم ہوا ہوگا لیکن مجھے یقین ہے کہ انہوں نے بھی شائنی کی روح کو دیکھا ہوگا۔ شاید انہوں نے اسے ایک سے زیادہ مرتبہ مختلف مقامات پر دیکھا ہو۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے۔“
 ”اس کا چہرہ صاف دکھائی دیتا ہے؟“ ثانیہ نے پوچھا۔
 ”نہیں۔“ لیڈی برنگروا نے جواب دیا۔ ”ہمیشہ اس کی پشت دکھائی دیتی ہے۔ وہ کہیں جاتی ہوئی نظر آتی ہے اور ہمیشہ ایسی جگہ دکھائی دیتی ہے جہاں اندھیرا یا نیم تاریکی ہوتی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اسے آپ نے شام کے وقت دیکھا جب تاریکی نہیں ہوتی۔“
 ”نہیں، وہ مجھے دکھائی نہیں دی تھی۔ میں نے بس جھلسی ہٹی دیکھی تھی اور ایسا لگا تھا جیسے کسی نے جھانک کر مجھے دیکھا ہو۔ وہ اتنی تیزی سے ہٹ گئی تھی کہ میں اسے دیکھ نہیں سکی۔“
 ”ہوں۔“ لیڈی برنگروا کچھ سوچنے لگی پھر کھڑی ہو گئی۔ ”اب آپ آرام کریں۔ ان ساری باتوں کو ذہن

آلشی حصار سے جھٹکنے کی کوشش کیجیے۔“
 ”یہ ایسی بات تو نہیں جو ذہن سے نکل سکے۔“
 ”کوشش کیجیے۔“ لیڈی برنگروا نے دوبارہ کہا۔
 ”آکھیں بند کر کے پرنس کی محبت کے لمحات یاد کیجیے۔ پرنس کے آنے تک آپ کو نارمل نظر آنا چاہیے۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔
 ثانیہ نے آکھیں بند کر لیں اور لیڈی برنگروا کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنتی رہی پھر دروازہ بند ہونے کی آواز بھی سنائی دی۔ اب ثانیہ نے آکھیں کھول دیں۔ اس نے بس لیڈی برنگروا کو دکھانے کے لیے آکھیں بند کی تھیں۔ اس نے شینے سے رابطہ کرنے کے لیے اپنا موبائل نکالا۔ گزرے ہوئے دلوں میں اس نے شینے سے کئی مرتبہ باتیں کی تھیں۔ اسے حویلی کے تمام حالات سے آگاہ کر چکی تھی۔ یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس پل تار کے خیال کے مطابق شائنی کی موت طبعی نہیں تھی۔ اسے قتل کیا گیا تھا اور تار کے شے کے مطابق اسے عمارت سے قتل کیا تھا۔ اب اس نے شینے کو شائنی کی روح کے بارے میں وہ سب واقعات سنائے جو اس کے ساتھ پیش آ چکے تھے۔
 وہ واقعات سننے ہوئے شینے نے سچ میں دو تین سوال بھی کیے پھر سب کچھ سننے کے بعد بولی۔ ”روح کے بارے میں کچھ واقعات میں سن چکی ہوں لیکن یہ واقعہ ان سب سے جدا ہے۔“
 ”میرا دل اب بہت گھبرانے لگا ہے۔“
 ”ہمت سے کام لو۔ اس روح نے اب تک کسی کو نقصان تو نہیں پہنچایا۔ میں نے سنا ہے جو روحیں کسی ایک جگہ ڈیرا ڈال دیں یا کسی ایک ہی جگہ نظر آئیں تو انہیں وہاں سے بھگا یا جاسکتا ہے۔“
 ”کیسے؟“ ثانیہ نے بے چینی سے پوچھا۔
 ”اسٹیٹ میں کوئی بزرگ ہو تو اس سے رابطہ کرو۔ مجھے بھی ایک بزرگ کے پاس جانے کا موقع ملتا رہتا ہے اور مجھے ان کی دعا میں ملتی ہیں۔ میں بھی ان سے بات کروں گی۔“
 ”تم بات کرو۔ میں تو یہاں کسی بزرگ کو نہیں جانتی۔“
 ”اچھا، میں بات کرتی ہوں۔ ان سے مل کر، ساری بات بتا کر، ان سے مشورہ کر کے تمہیں فون پر بتاؤں گی۔“
 ”جلدی بتانا۔“
 ”ہاں، ہاں..... لیکن میں نے کہا تھا کہ گھبراؤ مت۔ اپنے اعصاب مضبوط رکھو۔ تم ایک پرنس کی بیوی ہو۔ ایسی قسمت ہر لڑکی کی نہیں ہوتی۔“

”کچھ دیر تک ٹائیڈ کا حوصلہ بڑھانے کے بعد شینہ نے پوچھا۔ ”اس وقت پرنس کہاں ہیں؟“

”مجھے یاد نہیں، میں نے نہیں بتایا تھا یا نہیں۔ ان کا معمول بن گیا ہے کہ بریک فاسٹ کے بعد کہیں جاتے ہیں تو بچ کے وقت لوٹتے ہیں اور اگر شام کو کہیں جاتے ہیں تو آدھی رات کو لوٹتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ نہیں ہیں۔“

”واپس آکر ڈنکر کرتے ہیں؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ اور میں بھی ان کے ساتھ ہی ڈنکر کرتی ہوں۔ شریلا اور لیڈی برگنزا اذیت پر ہی ڈنکر لیتی ہوں گی۔“

”لیڈی برگنزا نے تم کو اچھی نصیحت کی ہے کہ پرنس کو سب کچھ مت بتانا۔ تم لیڈی برگنزا اور شریلا کے ساتھ کی تو تم کسی نہ کسی حد تک عادی ہو چکی ہو۔ اگر پرنس نے غصے میں ان دونوں کو حویلی سے رخصت کر کے کہی اور کورکھ لیا تو تم بہت زیادہ تنہائی محسوس کرنے لگو گی۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟ میرا مشورہ غلط ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ ٹائیڈ نے آہستہ سے کہا۔ ”میں خیال رکھوں گی۔“

☆☆☆

دوسرے دن ٹائیڈ نے لیڈی برگنزا سے پوچھا۔ ”اسٹیٹ میں کوئی پہنچے ہوئے بزرگ ہیں؟“

”کیوں؟“ لیڈی برگنزا کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”شائلی کی روح کے بارے میں ان سے ملا جائے۔ وہ کوئی ایسا مل سکتے ہیں کہ اس پریشانی سے نجات مل جائے۔“

لیڈی برگنزا سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ وقت سے اس نے کہا۔ ”میں کسی بزرگ کو تو نہیں جانتی لیکن گرجا میں ایک بہت عمر رسیدہ خاتون ہیں۔ میں ایک آدھ بار ان سے مل چکی ہوں۔ اس سلسلے میں بھی ان سے ملا جاسکتا ہے۔“

”گرجا تو ظاہر ہے کہ شہر میں ہوگا؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“

”آپ مجھے ان سے ملوا سکتی ہیں؟“

”نہیں نہیں۔ آج شام کو نہ چلوں گی۔ آپ نے کہا ہے تو مجھے خیال آیا ہے کہ اس سلسلے میں ان سے ملا جاسکتا ہے۔“

”تو شام کو کیوں؟ ابھی کیوں نہیں؟“

”بہت بے مہربانی ہو رہی ہیں آپ۔ کچھ سوچے تو۔ بچ کا وقت قریب ہے۔ پرنس آتے ہی ہوں گے۔ انہیں بس اتنا بتا دیجیے گا کہ آج آپ شہر گھومنا چاہتی ہیں اور میرے ساتھ جائیں گی۔“

ٹائیڈ نے سوچے ہوئے سر ہلا دیا۔ کچھ دیر بعد اس

کے م میں آیا کہ بچ کے لیے ڈاننگ ٹیبل سجائی جا رہی تھی۔

”پرنس کا نوں آیا تھا۔“ لیڈی برگنزا نے بتایا۔ ”دس منٹ بعد وہ حویلی میں ہوں گے۔ فون انہوں نے کتنی میں اس طرف آتے ہوئے کیا ہے۔ اسی لیے میز لگانے میں جلدی بھی کی جا رہی ہے۔ آپ بچ کے لیے تیار ہوں۔“

”میں تیار ہوں۔“

لیڈی برگنزا اس کی خواب گاہ سے چلی گئی اور ٹھیک دس منٹ بعد عمارتِ خواب گاہ میں داخل ہوا۔ حسب معمول اس نے ٹائیڈ کو آغوش میں لے کر اسے پیار کیا اور بولا۔ ”آج بھوک بہت زیادہ لگ رہی تھی اس لیے میں نے کتنی میں ادھر آتے ہوئے فون کر دیا تھا۔ میز لگانی چاہی ہے، آؤ۔“

اس نے ٹائیڈ کا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف لے جانے لگا۔ ”کھانے کے بعد ہم آرام کریں گے۔“

”میں آج شہر گھومنے جاؤں گی۔“

”ضرور جاؤ۔ میں تو چاہتا ہوں کہ میری عدم موجودگی میں اپنے لیے کوئی مصروفیت نکال لیا کرو۔“

”آپ روزانہ کہاں جاتے ہیں؟“

”میں نے اسٹیٹ آنے سے پہلے ہی تمہیں بتا دیا تھا کہ یہاں اچانک ایک ضروری کام آ پڑا ہے۔ خالص تجارتی معاملہ ہے۔ دراصل شہر میں بھی ایک بڑی کمپنی ہے جس سے میری کمپنی کے تجارتی روابط ہیں۔ اسی سلسلے میں سینیٹر چل رہی ہیں۔“

”اتنی طویل؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ سلسلہ ابھی ایک ہفتے اور جاری رہے گا۔“

وہ دونوں ڈاننگ روم میں داخل ہوئے۔ ہمیشہ کی طرح ٹائیڈ کا ساتھ اسی شیکین سے پڑا جس پر وہ مخصوص پیئنگ موجود تھی۔ مگنی مرتبہ اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اس بارے میں عماد سے سوال کرے لیکن اس خیال سے رک گئی کہ عماد کا موڈ خراب نہ ہو جائے۔

کھانے کے بعد دونوں خواب گاہ میں لوٹ آئے۔ رات کے علاوہ یہ وقت بھی ایسا ہوتا تھا جب عماد، ٹائیڈ کو اپنی محبت سے سرشار کیے رہتا تھا۔

☆☆☆

شام کو وہ اندر چلا پھیلنے سے دو گھنٹے پہلے ہی حویلی سے چلا گیا۔

لیڈی برگنزا نے ٹائیڈ سے کہا۔ ”اسٹیٹ کی خاص کشتی پرنس کو دوسرے کنارے پر چھوڑ کر واپس آجائے تو ہم دونوں اسی میں روانہ ہوں گے۔“

”پرنسز! آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ شریلا پوچھ رہی تھی۔

ٹائیڈ کے بجائے لیڈی برگنزا بول پڑیں۔ ”پرنسز آج شہر دیکھنا چاہتی ہیں۔ جب میں نہ ہوں تو حویلی میں تمہاری موجودگی ضروری ہے ورنہ تم بھی ہمارے ساتھ چلیں۔“

شریلا نے مسکرا کر ٹائیڈ کی طرف دیکھا اور پھر لیڈی برگنزا کو حویلی کے کسی کام کے بارے میں بتا کر ان کے پاس سے چلی گئی۔

کچھ دیر بعد لیڈی برگنزا نے گھڑی دیکھ کر ٹائیڈ سے کہا۔ ”آئیے، اب چلیں۔ نہر کے کنارے پہنچنے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ اس وقت تک کشتی واپس آچکی ہوگی۔ اب آپ یہ لگائیں، بلکہ میں لگا دیتی ہوں۔“

وہ دونوں میڈل ”کراؤن“ کی شکل کے تھے جو ٹائیڈ کے خیال کے مطابق پلانٹیم سے بنائے گئے تھے۔ لعل اوز ہیروں نے انہیں بہت چمکدار بنا دیا تھا۔

”یہ کیوں لیڈی برگنزا؟“ ٹائیڈ نے پوچھا۔

”ناکہ شہر میں جو بھی آپ کو دیکھے، سمجھ لے کہ آپ ہی ان کی نئی پرنسز ہیں۔ وہاں کسی نے آپ کو اب تک دیکھا نہیں ہے نا۔“

وہ دونوں میڈل ٹائیڈ کے دونوں شانوں پر لگ گئے۔

ٹائیڈ نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”پہلے یہ میڈل شائلی لگاتی ہوگی؟“

”یہ نہیں لگاتی تھی لیکن وہ بھی ایسے ہی تھے۔ آپ کے لیے پرنس نے دوسرے بنوائے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ آپ شائلی کے میڈل لگائیں۔“

فصل عبور کر کے وہ دونوں نہر کے کنارے پہنچ گئیں۔ اسٹیٹ کی مخصوص کشتی اسی وقت واپس آئی تھی۔

ٹائیڈ نے اس کے ملاح کو دیکھ کر کہا۔ ”یہ تو کشتی سے اتر جائے۔ کشتی میں ہی چلاؤں گی۔“

”شریلا نے بھی مجھے بتایا تھا کہ آپ کو کشتی رانی کا بہت شوق ہے۔“

لیڈی برگنزا کے کہنے پر ملاح کشتی سے اتر گیا۔ ٹائیڈ اور لیڈی برگنزا کشتی میں سوار ہوئیں۔ ٹائیڈ نے چوڑھواٹھ گھنٹے وقت حویلی کے ان درجوں کی طرف دیکھا جو شائلی کی خواب گاہ کے تھے۔

”میں نے ان پر نظر رکھی ہے۔“ لیڈی برگنزا نے کہا۔ ”درجوں میں کوئی پہل نہیں ہے۔“ ٹائیڈ نے جواب میں کچھ کہے بغیر کشتی کھینا شروع کر دی۔

”ادھر سے بھی ایک کشتی آرہی ہے۔“ لیڈی برگنزا

کی پیشانی پر ایک سلوٹ پڑ گئی۔

”ادھر سے لوگ ادھر آتے ہی ہوں گے۔“ ٹائیڈ نے کہا۔

”وہ تو گھمبیروں کی بہت سی کشتیاں ہوتی ہیں۔“ لیڈی برگنزا نے کہا۔ ”صرف ایک کشتی کو ادھر آتے میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔“

”حویلی کے مہمان تو آتے ہی ہوں گے؟“

”اس صورت میں مجھے فون پر اطلاع مل جاتی ہے۔ آج تو میں بے خبر ہوں۔“

”ہوگا کوئی پتلا۔“ ٹائیڈ نے بے پروائی سے کہا۔

”نکل پڑا ہے نہر کی سر کے لیے۔“

لیڈی برگنزا کچھ نہیں بولی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی برقرار رہی۔ دونوں کشتیاں قریب ہوئی جا رہی تھیں۔ سامنے سے آنے والے کشتی راں کا چہرہ صاف نظر آنے لگا تھا۔

”اوہ!“ لیڈی برگنزا کے منہ سے نکلا۔ ”شہباز!“

ٹائیڈ نے لیڈی برگنزا کی طرف دیکھا۔ ”آپ جانتی ہیں اس شخص کو؟“ لیڈی برگنزا نے جواب دینے کے بجائے ہونٹ ہنچنے لگے۔

”تو شہباز نام ہے اس شخص کا۔“ ٹائیڈ نے سوچا۔

کشتیاں اور قریب ہو گئیں۔ نکا ایک شہباز نے اپنی کشتی کا رخ اس طرح موڑا کہ ٹائیڈ کی راہ سدود کر دے۔

ٹائیڈ نے تیزی سے الٹے چپو چلا کر اپنی کشتی کی رفتار کم کی۔

”شہباز! یہ کیا بد تیزی ہے؟“ لیڈی برگنزا جتنی۔

”تو یہ تین بی پرنسز!“ شہباز جسا۔ ”اچھا استعجاب ہے شائلی کے بعد پرنس کا لیکن۔۔۔۔۔“ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

ٹائیڈ نے کوشش کی کہ اپنی کشتی کا رخ بدلے اور شہباز کی کشتی کے برابر سے نکل جائے۔ دوسری طرف شہباز نے بھی سامنے سے ٹپنے کی کوشش کی اور بولا۔ ”مگنہ بانی پرنسز! پھر ملیں گے۔ شاید حویلی میں۔“

”اپنی موت کو دعوت دو گے اگر حویلی میں قدم رکھا۔“ لیڈی برگنزا نے تیز لہجے میں کہا۔ ”پرنس تم سے کہہ چکے ہیں کہ حویلی کے قریب بھی نظر آئے تو مارے جاؤ گے۔ تم جانے ہو پرنس کا غصہ کیا ہوتا ہے۔“

”وہ تو شائلی پر اتر چکا ہے۔“ شہباز نے کہا۔ اس وقت دونوں کشتیاں ایک دوسرے کے برابر سے گزر رہی تھیں۔

”دماغ خراب ہے تمہارا۔“ لیڈی برگنزا نے کہا۔

”اگر تم نہر کی سر کے لیے نکلے ہو تو ٹھیک ہے۔ اگر حویلی کی طرف جاؤ گے تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ پرنس نے ملازمین کو بھی

تمہارے بارے میں ہدایت کر دی ہے۔“
شہباز نے ہلکا سا ہتھکڑ لگایا اور اپنی شہرت کی رفتار بڑھا دی۔

”کون ہے یہ جیڑ؟“ ثانیہ نے لیڈی برگزرا سے پوچھا۔
”بدگیز ہی ہے، بدگیز!“ لیڈی برگزرا نے کہہ کر ہونٹ پیچھ لے۔

”مجھے اس کے بارے میں کچھ بتائیے۔“ ثانیہ بولی۔
”پھر کسی وقت بتا دوں گی۔“

”ثنائے خاموش رہی لیکن اس کا ذہن الجھ گیا تھا۔ آخر ایسا کیا واقعہ ہو چکا ہے کہ پرنس اسے مار ڈالنے کی دھمکی دے چکے ہیں۔ ثانیہ کے خیال میں یہ دھمکی ہی ہو سکتی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ پرنس کسی کو مار ڈالتے۔“

”شہر نہیں پسند آگے۔“ لیڈی برگزرا نے دوسرا ہی موضوع چھیڑ دیا۔ ”یہ کوئی پسماندہ ریاست نہیں ہے۔ غرباء کی بستی کو چھوڑ کر ہر طرف خوبصورتی نظر آئے گی۔ سڑکیں شفاف اور چمکتی ہوئی۔ اچھے ڈیزائن کی عمارتیں۔“

”گر جا بھی اچھا ہوگا۔ کیا آپ وہاں جانی رہتی ہیں؟“
”عبادت کے لیے جاتی ہوں۔ مگر جا بھی تمہیں پسند آئے گا۔“ لیڈی برگزرا نے شہباز کے بارے میں بات چیت اندھیرے میں دھکیل دی تھی۔ کتنی سال کے قریب پہنچے گل۔

ثنائے نے بھی وقتی طور پر شہباز کو ٹھکرا دیا۔ ”سائل کے بالکل قریب بھی ایک عمارت ہے۔“

”پرنس کی ہے۔“ لیڈی برگزرا نے جواب دیا۔
”وہاں تمہیں دو کاریں بھی دکھائی دے رہی ہوں گی۔ ان میں سے ایک تمہارے لیے ہے۔ دوسری کاریں یا شرمیلا استعمال کرتے ہیں۔ تیسری کاریں اس وقت موجود نہیں ہے۔ پرنس اسی میں نہیں گئے ہوں گے۔“

کتنی سائل سے جاگلی۔ اس وقت ایک منزلہ عمارت سے کئی یاوردی افراد باہر آ گئے۔ ان لوگوں نے اس وقت سلامی دی جب ثانیہ اور لیڈی برگزرا نے سائل پر قدم رکھا۔
”یہ سلامی مجھے نہیں۔“ لیڈی برگزرا مسکرائیں۔
”جہیں دی گئی ہے۔“

ثنائے نے ہاتھ ملا کر ان لوگوں کو جواب دیا۔ ایک شخص نے فوراً اس کا رکھ پھینکا اور ڈانڈ کھولا جو لیڈی برگزرا کے سینے کے مطابق ثانیہ کے لیے تھی۔

”یہ شوہر ہے۔“ لیڈی برگزرا نے دھمی آواز میں کہا پھر بلند آواز میں شوہر سے بولیں۔ ”اس وقت تمہاری

ضرورت نہیں ہے۔ پرنس کے لیے میں ڈرائیو کروں گی۔“
وہ دونوں کاریں کے قریب پہنچ گئیں۔ شوہر نے کاری پھینک لیشت کا دروازہ کھولا۔

”پرنس میرے برابر میں بیٹھیں گی۔“ لیڈی برگزرا نے کہا۔

شوہر نے فوراً ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کی سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور ادب سے کھڑا ہو گیا۔

”یہ اب میری کسی زندگی ہے۔“ ثانیہ نے سوچا۔
”سب کچھ خواب سا لگ رہا ہے۔ میں شہزادی این نہیں۔“

وہ کاریں بیٹھی تو شوہر نے دروازہ بند کر دیا۔ لیڈی برگزرا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر انجن اسٹارٹ کیا۔
”مجھے یہ سب کچھ خواب سا لگ رہا ہے۔“ ثانیہ نے طویل سانس لی۔

”ان لوگوں نے آپ کو آج پہلی بار دیکھا ہے لیکن سارا کرشمہ کراؤن کا ہے جو آپ کے شانوں پر لگے ہوئے ہیں۔“

کاریں سڑک پر رواں ہوئی، وہ شفاف اور شیشے کی طرح جبک دار تھی۔ ثانیہ کو دل میں کہنا ہی پڑا کہ اسٹیٹ کا شہر واقعی بہت خوبصورت ہے۔ شاندار بازار، پرشکوہ عمارتیں، چمکتی ہوئی قیمتی کاریں اور وہ سب کچھ جو دنیا کے ترقی یافتہ شہروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مگر جا بھی ایسا تھا جسے دنیا کے خوبصورت گرجاؤں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔

لیڈی برگزرا اور ثانیہ نے کاریں سے اتر کر سڑکیاں طے کرنا شروع کیں۔ ایک سیزمی پر ایک نہایت بوڑھی راہبہ دکھائی دی جس کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور ہونٹ خفیف سے متحرک تھے۔ وہ سیزمی پر اس طرح بیٹھی ہوئی تھی جیسے گرجا سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔

”ہمیں اسی سے ملنا ہے۔“ لیڈی برگزرا نے آہستہ سے کہا۔
”ایسا لگ رہا ہے جیسے گرجا سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو اور وہ صرف عبادت کے وقت گرجا کے اندر جاتی ہو۔“

”ہاں۔ دراصل پادری صاحب اسے پسند نہیں کرتے۔“
”کیوں؟“
”یہ کہیں ہوتے ہوئے بھی بعض اوقات کرسیاں کے مطابق باتیں نہیں کرتی۔“

ثنائے کو اس بات پر ہنسنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ وہ دونوں اس راہبہ کے قریب پہنچ گئیں۔ وہ لیڈی برگزرا کی طرف دیکھتے ہوئے اس طرح مسکرائی جیسے ان دونوں میں واقفیت ہو۔

”یہ ہماری پرنس ہیں۔“ لیڈی برگزرا نے تعارف کرایا۔
راہبہ ثانیہ سے بڑی شفقت سے پیش آئی۔
لیڈی برگزرا بولی۔ ”اس سے پہلے کہ پادری صاحب کہیں سے ہمیں دیکھ لیں، میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ پرنس آپ سے ملنے کیوں آئی ہیں۔“

راہبہ نے ثانیہ کی طرف دیکھا لیکن ثانیہ کے بجائے لیڈی برگزرا ہی بول پڑی۔ ”یہ ایک روح کی وجہ سے پریشان ہیں۔ میں تو اسے بہت دن سے حویلی میں دیکھ رہی ہوں لیکن یہ کیونکہ نئی آئی ہیں اس لیے پریشان ہو گئی ہیں۔“

”کس کی روح ہے؟“ راہبہ نے پوچھا۔
”اس کا چہرہ کبھی دکھائی نہیں دیا لیکن قیاس ہے کہ وہ ہماری سابقہ پرنس کی روح ہے جن کو شاید قتل کر دیا گیا تھا۔“

اس وقت ثانیہ بول پڑی۔ ”کیا روحمیں واقعی زمین پر آتی ہیں؟“
”ہاں، بے شک آتی ہیں لیکن صرف وہ روحمیں جنہیں کسی سے زندگی میں بے پناہ محبت رہی ہو یا پھر وہ کسی دشمن ہوں۔ کیا اس روح نے کسی کو کبھی کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے؟“

”ابھی تک تو نہیں۔“ لیڈی برگزرا نے جواب دیا۔
”تو پھر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی سے محبت کے باعث آتی ہوگی۔ پریشانی کیوں؟“

”اس کی وجہ سے پرنس خوفزدہ اور پریشان رہنے لگی ہیں۔“
”اس کا خیال ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرو۔“ راہبہ نے ثانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ حویلی میں آتی ہے تو شاید اسے پرنس سے محبت ہو۔۔۔۔۔ یا اس کے آنے کی وجہ کچھ اور ہے تو وہ اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد چلی جائے گی۔“

روحمیں زیادہ عرصے تک زمین پر نہیں رہتیں۔“
”اے قل کیا گیا ہے۔“ ثانیہ پھر بول پڑی۔ ”ہوسکتا ہے وہ اپنے قاتل سے انتقام لینا چاہتی ہو۔“

لیڈی برگزرا بولی۔ ”اور اس صورت میں قاتل حویلی ہی میں۔۔۔۔۔“
”ہاں۔“ راہبہ نے بات کاٹ دی۔ ”اگر ایسی بات ہو تو قاتل کو حویلی ہی میں ہونا چاہیے۔“

ثنائے بولی۔ ”دوسری بات بھی ہو سکتی ہے۔“
راہبہ نے استغماہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
ثنائے نے کہا۔ ”شاید وہ پرنس سے جہت زیادہ محبت کرتی ہو اس لیے اسے حویلی میں میرا آنا برا لگا ہو۔ وہ مجھے ہی نقصان پہنچانا چاہتی ہو۔“

”ہاں، ایک امکان یہ بھی ہے۔“
ثنائے کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔
”لیڈی برگزرا بولی۔“ پرنس تو اس سے نفرت کرنے لگے تھے بلکہ اب بھی کرتے ہیں۔“

”اس کے باوجود پرنس سے اس کی محبت باقی رہ سکتی ہے۔“
”پرنس شاید اسی بات سے خوفزدہ ہیں۔“ لیڈی برگزرا نے کہا۔ ”وہ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ کیا روحمیں کے انتقام سے بچا نہیں جاسکتا؟“

”بچنے کی کوشش کی جاسکتی ہے اگر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کس کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔“
”فرض کر لیں کہ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتی ہو۔“ ثانیہ بولی۔
راہبہ کچھ سوچنے کے بعد بولی۔ ”اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو کل آنا۔ میں تمہیں کوئی ایسی چیز دوں گی جسے تم اپنے بائیں بازو پر باندھ لیتا لیکن اگر وہ کسی اور کو نقصان پہنچانا چاہتی ہوگی تو پہنچا دے گی۔“

”کیا حویلی کے سب افراد کے لیے ایسی کوئی چیز نہیں دی جاسکتی؟“

”ہاں، ایک امکان یہ بھی ہے۔“
ثنائے کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔
”لیڈی برگزرا بولی۔“ پرنس تو اس سے نفرت کرنے لگے تھے بلکہ اب بھی کرتے ہیں۔“

”اس کے باوجود پرنس سے اس کی محبت باقی رہ سکتی ہے۔“
”پرنس شاید اسی بات سے خوفزدہ ہیں۔“ لیڈی برگزرا نے کہا۔ ”وہ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ کیا روحمیں کے انتقام سے بچا نہیں جاسکتا؟“

”بچنے کی کوشش کی جاسکتی ہے اگر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کس کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔“
”فرض کر لیں کہ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتی ہو۔“ ثانیہ بولی۔

راہبہ کچھ سوچنے کے بعد بولی۔ ”اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو کل آنا۔ میں تمہیں کوئی ایسی چیز دوں گی جسے تم اپنے بائیں بازو پر باندھ لیتا لیکن اگر وہ کسی اور کو نقصان پہنچانا چاہتی ہوگی تو پہنچا دے گی۔“

”کیا حویلی کے سب افراد کے لیے ایسی کوئی چیز نہیں دی جاسکتی؟“

اس سے پہلے کہ ثانیہ کو جواب ملا، لیڈی برگزرا کچھ پریشان ہو کر بولیں۔ ”پادری صاحب اسی طرف آ رہے ہیں۔“
”تو تم دونوں فوراً وہاں چلی جاؤ ورنہ تم پر ان کے سوالات کی بوچھاڑ ہو جائے گی کیونکہ تم دونوں مجھ سے باتیں کر رہی ہو۔“

”ہمارے بعد وہ آپ کو سوالات کا ہدف بناسکتے ہیں۔“
”وہ میں سنبھال سکتی ہوں۔ تم دونوں جاؤ۔“
”آئیے پرنس!“ لیڈی برگزرا نے کہا۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر ثانیہ بھی گھبرا گئی اور لیڈی برگزرا کے ساتھ سیزھیاں اترنے لگی۔ کاریں بیٹھ کر وہاں سے ان کی روانگی عمل میں آئی۔

”یہ آپ نے اچھا کیا کہ اپنی حفاظت کا بندوبست کرنے کے لیے کہہ دیا۔“ لیڈی برگزرا نے کہا۔ ”اب کم از کم آپ خوفزدہ نہیں رہیں گی۔ کل آپ زحمت نہ کیجیے گا۔ میں خود یہاں آ کر وہ چیز لے لوں گی جو آپ کو اپنے بازو پر باندھنا ہوگی لیکن آپ نے سب لوگوں کے لیے بات کیوں کی تھی۔“

میں اور شرمیلا تو روح سے خوفزدہ نہیں ہیں۔ رہی پرنس کی بات، تو وہ مجھے یقین ہے کہ اپنے بازو پر کچھ نہیں باندھیں گے۔ اس بات پر وہ آپ سے خفا بھی ہو سکتے ہیں۔“

ثنائے نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ حقیقتاً وہ کوئی

حفاظتی اقدام پرس ہی کے لئے کر دانا چاہتی تھی۔ اگرچہ وہ اس معاملے میں پرس کو مصیبت سمجھتی تھی لیکن اس کے لاشعور میں کہیں یہ خیال بھی تھا کہ شاید پرس ہی نے غصے کے عالم میں شائنی کو مار ڈالا ہو۔

”جواب نہیں دیا آپ نے؟“ لیڈی برگنر ابولی۔

”میں نے یونہی کہہ دیا تھا۔“ ثانیہ نے ٹالا۔

”میرے ذہن میں کوئی خاص خیال نہیں تھا۔“

پھر نعرے کے ساحل تک دونوں خاموش رہیں اور اپنی اپنی جگہ کسی نہ کسی سوچ میں ڈوبی رہیں۔

”اوہ“ ساحل پر پہنچتے ہی لیڈی برگنر کے منہ سے نکلا۔

”پرس آج جلدی واپس آگئے۔“

ثانیہ نے وہاں ایک اور کار دیکھی جو جاتے وقت نہیں دیکھی تھی۔

لیڈی برگنر ابولی۔ ”شاید ان کا کام ختم ہو گیا ہو۔“

ثانیہ نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اب ان دونوں کا سرشتی میں شروء ہوا۔ اب بھی وہ دونوں خاموش ہی رہیں اور یہ سکوت اس وقت ٹوٹا جب سامنے سے ایک کشتی آتی دکھائی دی۔

”یہ تو پرس کی کشتی ہے اور پرس بھی اس میں ہیں۔“

”نہ جانے کیوں جلدی آئے تھے اور اب پھر جارہے ہیں۔“ ثانیہ نے کہا۔

دونوں کشتیاں ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئیں۔

پرس کی کشتی، کشتی راں چلا رہا تھا۔ پرس نے اسے ہدایت کی ہوئی کہ وہ رفتار کم کرے۔ لیڈی برگنر نے بھی رفتار کم کی۔

”اتنی جلدی شہر دکھائی گئی؟“ پرس نے ثانیہ سے کہا۔

”بس، جی رہا تھا کہ پھر کسی دن شہر دیکھنے کے لیے زیادہ دیر کے لیے نکلوں گی لیکن آپ جلدی آئے بھی اور اب واپس شہر کی طرف جارہے ہیں شاید۔“

”ہاں۔“ پرس نے جواب دیا۔ ”ایک چیز لے جانا بھول گیا تھا۔ دبی لینے کے لیے واپس آنا پڑا۔ جلدی میں ہوں۔ تم جلو، میں اپنے وقت پر آؤں گا۔“

پرس کو واقعی اتنی جلدی تھی کہ انہوں نے کشتی کی رفتار تیز کر دادی۔ لیڈی برگنر نے بھی رفتار بڑھائی۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا جب وہ دونوں حویلی پہنچیں۔

”پرس کے آنے میں تو ابھی دیر ہے۔“ لیڈی برگنر ابولی۔

”اور آپ کے چہرے سے ابھی تک پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔ اپنا دھیان بٹائیے۔ کسی کھیل سے کوئی دلچسپی ہے آپ کو؟“

”بیلنٹن میں بہت اچھا کھلتی ہوں۔“ وہ تو میں بھی کبھی شرمیلا کے ساتھ کھلتی ہوں لیکن وہ اتنا ڈری ہے۔“

”مجھے اتنا شہور نہ کیجیے۔“ شرمیلا نے کسی طرف سے آکر بٹنے ہوئے کہا۔ لیڈی برگنر ابھی ہنس کر رہ گئیں پھر وہ تینوں ہی ایک کشادہ جگہ پر پہنچ گئیں جہاں بیلنٹن کھیلنا جاتا تھا۔

بیلنٹن کھیلنے وقت شرمیلا خواہ مخواہ ثانیہ کو اپنی دانست میں ایسے پس دیتی رہی کہ وہ لیڈی برگنر کو ہراسے لیکن ثانیہ نے اس کی بات نہیں مانی۔ اسے اپنے کھیل پر بھر وسا تھا۔ اس کھیل میں واقعی اس کا دھیان کافی بٹ گیا پھر جب اس کی نظر وہاں لگی ہوئی دیویدیکو گھڑی پر پڑی تو اس نے ہاتھ روک لیا۔

”بہت وقت گزر گیا۔ پرس بھی اب آنے والے ہوں گے۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

اسے یہ بھی خیال آیا تھا کہ اس کی وجہ سے لیڈی برگنر نے ڈرتے نہیں کیا تھا۔ وہ پرس کے آنے سے پہلے ڈنر کر لیا کرتی تھی۔

☆☆☆

بستر پر لیٹنے کے بعد اسے شینہ کو فون کرنے کا خیال آیا لیکن زیادہ رات ہو جانے کے باعث اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگی کہ راہبہ کی باتیں کس حد تک درست ہو سکتی تھیں؟

وہ اس وقت چونکی جب اس کے سر ہانے سے ایک تیز نسوانی سرگوشی سنائی دی۔ ”میں تجھے مار ڈالوں گی۔“

وہ خوف اور گھبراہٹ میں ایک جھٹکے سے اٹھی۔ اس کے سر ہانے یا بستر کے پیچھے کوئی بھی نہیں تھا پھر اس نے ایک تیز سرسراہٹ سنی۔ اسے یوں لگا کہ اس کے سر ہانے سے نکلے کے نیچے سے کوئی چیز سرسراتی ہوئی نکلی اور تیزی سے پیچھے ہٹ کر پردوں کے پیچھے غائب ہو گئی۔

ثانیہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے دروازے کی طرف دوڑی۔ وہ شرمیلا اور لیڈی برگنر کو پکار رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ اس کی کوشش سے پہلے ہی کھل گیا۔ دوڑتی ہوئی ثانیہ، پرس سے ٹکرائی۔

”کیا ہوا ثانیہ؟“ پرس نے حیرت سے پوچھا۔

”مجھے بجائیے پرس!“ ثانیہ اس سے لپٹ گئی۔ ”وہ مجھے مار ڈالے گی۔“

”کون؟“ کسی کی بات کر رہی ہو؟“

”روح۔“ ثانیہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”وہ سانپ بن کر میرے سر ہانے آئی تھی۔ وہ..... وہ.....“ ثانیہ نے

اکٹھی حصار

پیچھے دیکھتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔

”یہاں کوئی روح وغیرہ نہیں ہے۔“ پرس نے کہا۔

”تمہارا وہم ہے۔“

”نہیں۔“ ثانیہ چیخی۔ ”اس نے کہا بھی تھا کہ وہ مجھے مار ڈالے گی۔“

”ہوش میں آؤ۔“ پرس نے سخت لہجے میں کہا۔

اسی وقت لیڈی برگنر اور شرمیلا تقریباً دوڑتی ہوئی وہاں آئیں۔ انہوں نے ثانیہ کی چیخ پکار سن لی ہوگی۔

”کیا ہوا؟“ لیڈی برگنر نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ پرس نے کہا اور ثانیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے تقریباً گھمٹا ہوا بستر کی طرف لے گیا پھر کہا۔ ”یہاں کوئی سانپ نہیں ہے۔“

”وہ.....“ ثانیہ نے انگلی سے پردوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”سانپ بن کر آئی تھی۔ ان پردوں کے پیچھے چلی گئی۔“ ثانیہ کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

”تم تیشی رہو، میں دیکھتا ہوں۔“ پرس نے کہا اور پردوں کی طرف گیا۔ اس نے پردے ہٹائے اور بولا۔

”یہاں کچھ نہیں ہے۔“

”وہاں سے غائب ہو گئی ہوگی۔“ ثانیہ اب بھی ہانپ رہی تھی۔

”سب وہم ہے تمہارا۔“ پرس بستر کی طرف لوٹا۔

لیڈی برگنر اب بھی وہاں موجود تھیں۔

”اسے روح کا خیال کیسے آگیا؟“ پرس نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ بتایا تھا کیا؟“

لیڈی برگنر نے دے لہجے میں کہا۔ ”پرس نے نہر میں کشتی چلاتے ہوئے اس کی خواب گاہ کے ایک درختے میں کسی کو دیکھا تھا۔“ لیڈی برگنر نے ”اس کی“ کے الفاظ اس طرح ادا کیے تھے کہ شائنی کا نام نہ لینا پڑے۔

شرمیلا بولی۔ ”یہ اسی وقت حویلی میں آکر اس کی خواب گاہ کی طرف جانا چاہتی تھیں۔ راہداری میں دوڑتے ہی پڑی تھیں۔ میں نے اور لیڈی برگنر نے انہیں بڑی مشکل سے روکا تھا۔“

”اور کچھ بتایا بھی تھا؟“ پرس نے بہت ہی سخت لہجے میں پوچھا۔

شرمیلا نے نظریں جھکا لیں۔

لیڈی برگنر نے آہستہ سے کہا۔ ”انہیں وہاں جانے سے روکنے کے لیے بتانا ہی پڑا تھا۔“

”تو یہ واقعہ مجھ سے کیوں پوشیدہ رکھا گیا؟“ پرس

نے تیز لہجے میں کہا۔

اب بھی لیڈی برگنر نے ہی جواب دیا۔ ”ڈر تھا کہ آپ ہم پر ناراض ہوں گے۔“

پرس نے ہونٹ جھنجھ کر ان دونوں کو گھورا پھر ہاتھ ہلا کر تلخ لہجے میں بولا۔ ”جلی جائیں آپ دونوں یہاں سے۔“

وہ دونوں سر جھکائے وہاں سے چلی گئیں۔ دروازہ بھی بند کر گئیں۔

”آرام کرو۔“ عماد نے ثانیہ کے دونوں شانوں پر نری سے ہاتھ کے دباؤ ڈال کر اسے لٹا دیا۔

”پرس! ایسٹ جھوڑ دیجیے۔“ ثانیہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ”یہاں سے واپس چلے پلے ورنہ مجھے اس لیے مار ڈالے گی کہ آپ نے مجھ سے شادی کی ہے۔“

”میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی نہیں مار سکتا۔“ عماد نے اس کے برابر میں لیٹ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”کیا آپ نہیں مانتے کہ وہ اس کی روح ہے۔ آپ نے بھی تو اسے دیکھا ہے۔“

”میں نے ان دونوں سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ میرا وہم ہو سکتا ہے۔“

”وہ دونوں اسے کئی بار دیکھ چکی ہیں۔“

”انہیں بھی وہم ہو سکتا ہے۔“ عماد جھنجھلا سا گیا۔

”مجھ سے تو وہ بولی بھی۔“

”اسے بھی تمہارا وہم کہوں گا۔ روح کا خیال تمہارے اعصاب پر چھا گیا ہے۔ تم کچھ بھی سن سکتی ہو۔“

ثانیہ نے سمجھ لیا کہ عماد اس کی بات مان بھی رہا ہوگا تو اس کا اظہار نہیں کرے گا۔ وہ چپ ہو گئی۔

”آنکھیں بند کر کے ذرا دیر آرام کر لو۔“ عماد نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”ٹر سکون ہو جاؤ تاکہ پھر چل کر کھانا کھا سکیں۔ مجھے بہت زور کی بیوک لگ رہی ہے۔“

”یہ شہباز کون ہے؟“ ثانیہ پوچھتی۔

عماد چونکا۔ ”تم اسے کیسے جانتی ہو؟“

”جب میں لیڈی برگنر کے ساتھ کشتی میں شہر جا رہی تھی تو سامنے سے وہ بھی کشتی میں آ رہا تھا۔“ ثانیہ نے سارا واقعہ ہر ادیا۔

عماد نے کہا۔ ”وہ اچھا آدمی نہیں ہے اس لیے میں نے حویلی میں اس کی آمد روک دی ہے۔“

”پہلے آتا تھا؟“

”ہاں۔“

”وہ ہے کون جو جوبلی میں آتا تھا؟“
 ”اس کا کہنا ہے کہ وہ میرا کزن ہے۔۔۔۔۔ چچا زاد بھائی۔۔۔۔۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ جھوٹا بھائی ہے۔ اس سے میرا کوئی رشتہ ہوگا بھی تو کہیں دور دراز کا۔“
 ”اس نے ایسا کیا کہا تھا کہ آپ نے اس کا جوبلی میں آنا بند کر دیا؟“

اس سوال پر عماد کا چہرہ کچھ سرخ ہو گیا۔ ”اس نے مجھ سے دغا بازی کی تھی۔“
 ”کیا دغا بازی کی تھی؟“

”تمہارے سامنے پہلی بار شائلی کا نام اپنی زبان پر لارہا ہوں۔ اس نے مجھ سے بے وفائی کی تھی۔ اس نے شہباز سے تعلقات استوار کر لیے تھے۔ اس بارے میں مجھے خاصے شبہات تھے لیکن کوئی ثبوت نہیں تھا۔ شائلی سے مجھے بہت محبت تھی اس لیے میں نے بس اتنا کیا کہ شہباز کا یہاں داخلہ بند کر دیا۔ شائلی جزیہ ہو کر رہ گئی۔ اس معاملے میں وہ مجھ سے ایک بار لڑ پڑی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں شہباز کو جوبلی میں آنے دیا کروں۔ اس کی ان باتوں سے میرے شبہات اور قوی ہو گئے۔“

”اسی لیے آپ کو اس سے نفرت ہے؟“
 ”نفرت؟“ عماد سیدھا حلیہ کر چھت کو سینے لگا پھر بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے اس سے نفرت ہے یا اب بھی محبت ہے۔۔۔۔۔ یا میری نفرت میں بھی محبت ہے۔ بہت الجھ گیا ہوں میں۔ میری خواہش ہے کہ تم مجھے اپنی محبت کا اتنا سہارا دو کہ میں اسے بھول جاؤں لیکن تم مجھے اس کی یاد دلارہی ہو۔“
 ”اس کی موت کیسے ہوئی تھی؟“ ثانیہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

”چپ ہو جاؤ اب۔“ عماد کچھ چیخ سا پڑا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم اسے بھلانے میں میری مدد کرو لیکن تم مسلسل اس کی بات کیے جا رہی ہو۔“
 عماد کی ناراضگی کے خوف سے ثانیہ نے خاموشی اختیار کر لی۔

کئی منٹ چت لیٹا رہنے کے بعد عماد نے پھر اس کی طرف کروٹ لی اور اسے پیاد کرتے ہوئے بولا۔ ”ثنیہ! میں تمہاری بے تحاشا محبت کا طلب گار ہوں۔“
 ”میں بے تحاشا ہی آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔“
 ثانیہ اس سے لپٹ گئی۔ اس کی چٹکیں جھجک گئی تھیں۔ ”آپ کو کیا معلوم کہ آپ میرے خوابوں کے بھی شہزادے ہیں۔“

عماد اس کے آخری جملے کی سچائی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”اگر میرا کام بہت ضروری نہ ہوتا تو میں شہر جانا ہی چھوڑ دیتا۔ ہر وقت تمہارے ساتھ رہتا۔ تمہائی میں تمہارے اعصاب پر بس روح سوار ہے گی۔ میں شرمیلا سے کہوں گا کہ میری عدم موجودگی میں وہ ہر وقت تمہارے ساتھ رہا کرے۔ چلو اب اٹھو خود کو سنبھالو اور ڈنر کے لیے چلو۔“
 ذرا دیر بعد وہ دونوں ڈائننگ ہال میں تھے۔ اس وقت لیڈی برگنر اور شرمیلا دونوں ہی ثانیہ اور عماد کو ممتی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عماد نے ثانیہ کو کس طرح سنبھالا ہوگا۔

☆☆☆
 دوسرے دن عماد کے جانے کے بعد ثانیہ نے خود کو خواب گاہ تک محدود کر لیا اس لیے شرمیلا بھی وہیں موجود رہی تھی۔ اس نے شائلی کی روح کا کوئی ذکر نہیں چھیڑا۔ دوسرے موضوعات چھیڑے۔ ثانیہ اپنے خیالوں میں ڈوبی رہی۔ شرمیلا نے اسے ٹوکا بھی نہیں کہ اس نے خاموشی کیوں اختیار کر رکھی ہے۔

اسی دوران میں لیڈی برگنر اشہر کا چکر لگا آئی۔ وہ راہبہ سے وہ چیز لے کر آئی تھی جس کا راہبہ نے وعدہ کیا تھا۔ شرمیلا کو کسی بہانے سے تھوڑی دیر کے لیے ٹال کر وہ چیز سونے کے تاروں سے بنی ہوئی اس چیز کو بازو بند کا نام دیا جاسکتا تھا۔
 ”رات کو۔۔۔۔۔“ لیڈی برگنر نے کہا۔ ”جب پرس سے قربت ہونے لگے تو یہ کسی طرح چھپا کر بازو سے اتار دیا کرنا۔ اگر پرس کی نظر پڑ گئی تو وہ سوالات کی بوچھاڑ کر دیں گے۔“
 ”میں خیال رکھوں گی۔“

”اسے بازو پر باندھنے کے بعد کچھ محسوس ہوا؟“
 راہبہ نے کہا تھا کہ تم تو اتانی محسوس کرو گی۔“
 ثانیہ نے ذرا دیر خاموشی اختیار کی پھر بولی۔ ”ہاں، میں خود میں کچھ عجیب جوبلی محسوس کر رہی ہوں۔ شاید اب وہ روح مجھے خوفزدہ نہ کر سکے۔“

ثنیہ کا یہ جواب راہبہ کی بات کا نفسیاتی اثر ہو سکتا تھا۔ شرمیلا کے دایں آجانے کی وجہ سے اس موضوع پر بات آگے نہیں چلی۔ لیڈی برگنر تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ شرمیلا بولی۔ ”لیڈی برگنر کے کہنے پر میں نے خانساں کو ہدایت کر دی ہے کہ آج لچ میں یارات کو ڈنر پر وہ کوئی ایسی چیز تیار کرے جو اس نے یہاں پہلے نہ بنائی ہو۔“

”نیا پان اچھا لگے گا۔“ ثانیہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
 شرمیلا نے اسے غور سے دیکھا۔ ”آپ اچانک کچھ بدلی ہوئی نظر آنے لگیں۔“
 ”تم باتیں کر رہی تھیں اور میں سوچتی رہی تھی کہ مجھے پرس کی محبت کی طاقت حاصل ہے اس لیے مجھے خود کو مضبوط ہی سمجھنا چاہیے۔“

”خوب۔“ شرمیلا نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔
 ”اب میں آنکھیں بند کر کے کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔ نیند تو شاید آنے لے لیکن شہد کی سے بھی انسان کو سکون مل جاتا ہے۔ میں رات کا واقعہ بالکل فراموش کر دینا چاہتی ہوں۔“
 ”ضرور۔“

”لیکن پرس کے علاوہ کسی کی موجودگی میں آنکھیں بند کیے رکھنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ تم کچھ دیر کے لیے جا کر جوبلی کے دوسرے معاملات دیکھو۔“
 ”لیکن۔۔۔۔۔“

”پرس کا ڈر ہے تمہیں کہ مجھے اکیلا کیوں چھوڑا گیا؟“
 ”جی۔“

”مت ڈرو۔ میں انہیں بتاؤں گی بھی نہیں کہ تم مجھے تنہا چھوڑ گئی تھیں۔“

شرمیلا قدرے چپکھاہٹ کے ساتھ خواب گاہ سے چلی گئی۔ ثانیہ دراصل شہباز کو قون کرنے اور اسے نئے واقعات بتانے کے لیے بے چین تھی۔ اس نے شرمیلا کے جانے کے بعد موبائل سنبھالا۔

”ثنیہ! میں اس وقت کالج میں کلاس میں ہوں۔“
 رابطہ ہونے پر شہباز نے کہا۔ ”کوئی خاص بات ہے کیا کہ اس وقت قون کیا ہے؟“

”بات نہیں، باتیں ہیں۔“
 ”دس منٹ بعد فون کر لو۔ کلاس ختم ہونے والی ہے۔“
 ”ٹھیک۔“ ثانیہ نے کچھ کر رابطہ منقطع کر دیا۔
 دس منٹ بعد وہ دونوں پھر رابطے میں تھیں۔
 ثانیہ نے پوچھا۔ ”تم نے کب بزرگ سے ملنے کی بات کی تھی۔“

”موقع نہیں ملا ثانیہ! لیکن آج ضرور مل لوں گی۔“
 ”خیر، کوئی بات نہیں۔ مجھے اس وقت کچھ دوسری باتیں کرنا ہیں۔ کل سے اب تک یہاں بہت کچھ ہو چکا ہے۔“
 ثانیہ نے سب واقعات بتانے کا آغاز کیا۔ شہباز سچ سچ میں کوئی سوال بھی کرتی رہی۔ سب کچھ بتانے کے بعد

ثنیہ نے کہا۔ ”ان سب واقعات پر تم کیا تبصرہ کرو گی؟“
 ”ثنیہ! شہباز نے سنجیدگی سے کہا۔ ”حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ تم مجھے پچھلے دنوں بتاتی رہی ہو، اسے میری عقل تسلیم نہیں کر رہی تھی۔ بس تمہارا دل رکھنے کے لیے میں تمہاری باتوں پر ہاں میں ہاں ملاتی رہی ہوں۔ بزرگ سے ملنے کی بات بھی میں نے صرف تمہاری تسلی کے لیے کی تھی۔“
 ”کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ کوئی روح نہیں؟“

”میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے۔ یہ اکیسویں صدی ہے ثانیہ! وہ زمانہ گیا جب بھوت بھڑیل اور رعوں کے قصے سننے میں آتے تھے۔ اب کوئی بھی عقین نہیں کرے گا کہ جوبلی میں کوئی روح ہے۔“

”میں ابھی تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں نے اپنے سرہانے اس کی آواز سنی تھی جبکہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ ایک سانپ ساسر سراسر اتھا میرے کچے کے نیچے سے نکلا تھا اور پردوں کے پیچھے غائب ہو گیا تھا۔“

”یہ تمہارا وہم ہو سکتا ہے کہ تم نے کوئی سانپ دیکھا تھا کیونکہ تمہارے اعصاب پر روح سوار ہے اس لیے تمہیں اس قسم کا وہم ہو سکتا ہے۔“

”تو اس کی آواز کو بھی تم میرا وہم کہو گی؟“
 شہباز نے کچھ رک کر کہا۔ ”میں اسے یوں سمجھ رہی ہوں کہ جوبلی میں کوئی ہے جو تمہیں ڈرانا چاہتا ہے۔“
 ”آواز کے بارے میں کچھ نہیں کہا تم نے۔“

”ابھی سوچا ہے میں نے اس کے بارے میں۔“
 شہباز نے کہا۔ ”تمہارے کچے کے نیچے کوئی ایسی ڈیوائس رکھی گئی ہوگی جو تمہیں سے بولنے کی آواز نشر کرے۔“
 ”اگر میں تمہاری بات مان لوں تو وہ ڈیوائس کس نے رکھی ہوگی؟“

”جو تمہیں ڈرانا چاہتا ہے۔“
 ”تب تو پھر وہ ڈیوائس شرمیلا ہی رکھ سکتی ہے۔ لیڈی برگنر تو میرے ساتھ شہر گئی ہوئی تھیں لیکن۔۔۔۔۔“ ثانیہ کو یاد آیا۔ ”میری عدم موجودگی میں پرس بھی غیر متوقع طور پر خاصی جلدی حویلی پہنچے تھے۔ میں سمجھیں وہ واقعہ سنا چکی ہوں۔ وہ نہر میں حویلی سے آتے ہوئے ملے تھے لیکن میں شہباز نہیں کر سکتی کہ وہ یہ حرکت کریں گے۔ وہ تو مجھے چاہتے ہیں۔“
 ”تو پھر وہ یا تو شرمیلا ہی ہوگی یا حویلی کا کوئی اور فرد جواب تک تمہاری نظر میں نہیں آیا۔“

”لیکن شرمیلا کو تو مجھے ڈرانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس سے کسی کو فائدہ ہو سکتا ہے تو وہ شائلی کی روح ہی

ہو سکتی ہے۔“
 ”پھر وہی روح۔“ شبنہ بھنبھلا سی گئی لیکن پھر فوراً
 سنجیدہ ہو کر بولی۔ ”تمہیں معلوم ہے شانی کی لاش کہاں دفن
 کی گئی ہے؟“
 ”مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں مری
 تھی۔ مجھے بس یہ تاثر ملتا رہا ہے کہ وہ مر چکی ہے اور ایس بی
 نادر کے خیال کے مطابق اس کے مر ڈر کے متعلق کو پولیس حل
 کر رہے گی۔“
 ”کیا پولیس کو لاش مل چکی ہے؟“
 ”مجھے اس کا علم نہیں۔“
 ”تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ شانی مری ہی نہ ہو، کہیں
 غائب ہو گئی ہو اور پولیس یہ سمجھ رہی ہو کہ اس کا مر ڈر کر کے
 لاش غائب کر دی گئی ہے۔“
 ”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“
 ”یہ امکان تو ہے کہ شانی زندہ ہو۔ وہی تمہیں روح
 بن کر ڈرا رہی ہو۔ اسے یہ گوارا نہ ہو کہ جو جلی میں پرس کی
 دوسری ہوئی بھی آجائے۔ وہ اس طرح تمہیں ڈرا کر جو جلی
 سے بھاگ سکتی ہے۔ وہ یہ خیال بھی کر سکتی ہے کہ تم خوفزدہ ہو کر
 پرس سے طلاق لے لو۔“
 ”اگر میں تمہارا ڈیو اؤکس کا مفروضہ مان لوں اور یہ بھی
 مان لوں کہ شانی زندہ ہے اور جو جلی میں ہے تو اسے اپنی
 خواب گاہ میں ہی رہنا چاہیے۔“
 ”بہت اچھا سوچا تم نے اور شاید اسی لیے پرس نے
 حکم صادر کر دیا ہے کہ شانی کی خواب گاہ میں کوئی نہ جائے۔
 جائے گا تو ہاں شانی کو دیکھ لے گا۔“
 ”اس سے پرس کو کیا فائدہ ہوگا؟“
 ”اس کا تو پتا لگانا بڑے گا۔ آخر پرس کیوں چاہتا
 ہے کہ لوگ شانی کو مردہ ہی سمجھتے رہیں۔“
 ”اس راز سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرو۔“
 ”تمہاری باتیں مان لوں تو پھر یہ بھی مانتا پڑے گا کہ
 درے کی جھلی ہٹا کر شانی ہی نے جھانکا تھا اور میرے سیکے
 کے نیچے ڈیو اؤکس بھی اسی نے رکھی تھی۔“
 ”اب تک میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ میرے
 قیاسات ہیں۔ اس بارے میں تم کسی طرح چھان بین کرو
 کہ حقیقت کیا ہے۔“
 ”تو پھر مجھے کسی بھی صورت شانی کی خواب گاہ میں
 جانا چاہیے۔“
 ”اگر وہ زندہ ہے تو اسے وہاں ہونا چاہیے۔“

”اور اگر وہ واقعی مر چکی ہو؟“
 ”تو پھر یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ روح کا ڈھانسا
 کرنے والا کون ہے؟“
 ”کوئی جانتا شاید آسان نہ ہو۔“
 ”کوشش تو کرنا چاہیے۔ اس سارے واقعے پر تم میری
 باتوں کی روشنی میں غور کرو۔ اس موضوع پر ہم بعد میں پھر
 باتیں کر لیں گے تم کو علم ہے کہ میں اس وقت کالج میں ہوں
 ہوں۔ مجھے اس وقت دوسری کلاس میں ہونا چاہیے تھا۔“
 ”ٹھیک ہے۔ تم کلاس میں جاؤ۔ مزید باتیں بعد میں
 ہوں گی۔“
 دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔
 ”شانہ! آج تمہیں بند کر کے لیٹ گئی۔ وہ سب سے پہلے
 اس پر غور کر رہی تھی کہ شانی کی خواب گاہ میں کیسے جائے؟“
 ☆☆☆
 رات آئی اور معمول کے مطابق گزر گئی۔ صبح بریک
 فاسٹ کے بعد عمار شہر چلا گیا۔ دن بھی گزرتا رہا۔ شانہ کی
 بے چینی بڑھتی رہی۔ وہ شانی کی خواب گاہ میں جانے کے
 لیے مضطرب تھی۔ سچ کے وقت عمار آیا۔ شام تک شانہ کے
 ساتھ محبت کا وقت گزرتا رہا۔ اندھیرا پھیلنے سے پہلے پھر
 چلا گیا۔ شانہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ شانی کی خواب گاہ میں جانا
 اس کے لیے آسان نہیں ہوگا۔ لیڈی برکسز اس پر اور شانی
 کی خواب گاہ پر اب کڑی نظر رکھ رہی تھیں۔ اس رکاوٹ کی
 وجہ سے شانہ پر جنون طاری ہونے لگا۔ وہ جنون بڑھتا گیا۔
 عمار کو گتے تین گتے سے زیادہ ہو چکے تھے جب شانہ کا جنون
 انتہائی بڑھ چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسی وقت شانی کی
 خواب گاہ میں جائے گی اور اس حقیقت سے پردہ اٹھا کر
 رہے گی کہ شانی زندہ ہے یا جو جلی میں واقعی اس کی روح ہی
 منظر لا رہی ہے۔
 وہ بستر سے اٹھی اور تیزی سے چلتے ہوئے دروازہ
 کھول کر باہر نکلی۔ اس رات پھر یہ اتفاق ہوا کہ عمار جلدی
 آ گیا۔ وہ اس وقت اپنے کان سے موبائل لگائے کھڑا رہا
 تھا۔ ”ہیلو۔“ کسی کی کال اسی وقت آئی تھی۔
 ”شانہ! کہاں جا رہی ہو؟“ عمار نے اس کی کلائی پکڑ لی۔
 ”شانہ نے جھنجھلا کر جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔
 ”کیا ہے ہو گئی ہے۔“ عمار نے کہہ کر دوبارہ اس کی
 کلائی زور سے پکڑ لی پھر فوراً ماتھ پیس میں بولا۔ ”سوری!
 یہ میں کی اور سے کہہ رہا تھا۔ کیوں فون کیا ہے؟“
 ”شانہ کلائی چھڑانے کے لیے زور لگا رہی تھی۔ اسی

وقت کی طرف سے شرملا آ گئی۔
 ”اچھا۔“ موبائل میں کہتے ہوئے عمار کے لیے میں تکی
 تھی۔ ”آتا ہوں۔“ پھر اس نے موبائل اپنی جیب میں ڈال کر
 شانہ سے کہا۔ ”اس وقت تم پر کیا وحشت طاری ہوئی ہے؟“
 ”میں اب سارا معاملہ واضح طور پر دیکھنا چاہتی
 ہوں۔“ شانہ چیخ پڑی۔
 ”کیسا معاملہ؟“
 ”میں جانا چاہتی ہوں کہ شانی زندہ ہے یا واقعی
 مر چکی ہے۔“
 ”وہ مر چکی ہے پرسز!“ شرملا بول پڑی۔
 ”تم مت بولو۔“ شانہ غرائی۔ اس کا جنون اب سر
 چڑھ کر بول رہا تھا۔
 ”شانہ! عمار غصے سے بولا۔
 ”مجھے بتایا جائے۔“ شانہ بھی زور سے بولی۔ ”یہ
 پابندی آخر کیوں لگائی گئی ہے کہ شانی کی خواب گاہ میں کوئی
 نہ جائے۔“
 ”پھر وہی شانی!“ عمار کا غصہ بڑھا۔
 ”ہاں، وہی شانی۔“ شانہ نے کہا۔ ”میں اس کی
 خواب گاہ میں جا رہی ہوں۔“
 ”پاکل ہو گئی ہو کیا۔۔۔۔۔ تم ہرگز نہیں جاؤ گی۔“
 ”جاؤں گی۔“ شانہ طعن بھرا ذکر کرتی تھی۔
 اس مرتبہ عمار نے اس کی کلائی چھوڑ کر اس کے منہ پر
 تھپڑ رسید کر دیا۔
 ”ہاں، ہاں، مارو۔ جان سے مار دو لیکن میں جاؤں
 گی۔“ شانہ پلٹ کر بھاگی۔
 ”روکو اسے۔“ عمار نے شرملا سے کہا۔ ”مجھے فوراً
 پولیس اسٹیشن جانا ہے۔“
 ”کیوں پرس؟“
 ”ایس بی نادر نے طلب کیا ہے۔ اب وہ آپ سے
 باہر ہو رہا ہے۔“ عمار نے فون سے کہا۔ ”تم اسے روکو۔ اس
 کا اشارہ بھانجی ہوئی شانہ کی طرف تھا۔
 ”میں اسے دیکھتی ہوں۔“ کسی طرف سے لیڈی
 برکسز کی آواز آئی اور پھر اسے بہت تیزی سے شانہ کی
 طرف جاتے دیکھا گیا۔
 ”آپ اطمینان سے پولیس اسٹیشن جائیں۔“ شرملا
 نے کہا۔ ”میرے بیان کی وجہ سے نادر آپ کا کچھ نہیں بگاڑ
 سکتا۔ وہ کلینر میں دب گئی تھی۔ یقیناً مر چکی ہوگی۔“
 ”نی الجال تم اسے دیکھو۔“ عمار نے اشارہ کیا۔

شانہ کے پیچھے لیڈی برکسز ایک موٹر پر نظروں سے
 اوجھل ہو چکی تھی۔ عمار باہر جانے کے لیے بڑھ گیا۔ جب
 شانہ دوڑی تھی تو اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔
 ”شانی یقیناً زندہ ہے۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی اس
 راہداری میں داخل ہوئی جو شانی کی خواب گاہ کی طرف جاتی
 تھی۔ ”اس سینی کی وجہ سے آج پرس نے مجھے تھپڑ بھی
 مار دیا۔ وہ زندہ ہے یا مردہ، آج معلوم کر کے رہوں گی۔
 اگر وہ روح ہے تو بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ میرے بازو
 پر حقائق بند موجود ہے۔“ وہ اس وقت پاگل ہی ہوئی جا رہی
 تھی۔ اس پر ذہنی دباؤ کا ایک دن سے بڑھتا رہا تھا جب سے
 روح کی بات سنانے آئی تھی اور اب شبنہ سے باتیں کرنے
 کے بعد ذہنی دباؤ اتنا بڑھا تھا جیسے دماغ کا سڑک توڑ کر باہر
 نکل جائے گا۔
 ”رک جائے پرسز!“ لیڈی برکسز کی آواز سنائی دی۔
 ”سب کچھ دہم ہے تو یہ آواز بھی دہم ہی ہوگی۔“ اسے
 خیال آیا اور اس کے قدم تیزی سے اٹھتے رہے لیکن اس وقت
 اسے رکنا ہی پڑا جب لیڈی برکسز اس کے سامنے آ کھڑی
 ہوئی اور بولی۔ ”بس، اب اور اسے نہ جانے پرسز!“
 ”میں جاؤں گی۔“ شانہ نے سختی سے کہا۔ ”میں آپ
 کی بہت عزت کرتی ہوں لیڈی برکسز! مجھے کوئی ایسا قدم نہ
 اٹھانے دیجیے جس کا مجھے بعد میں افسوس ہو۔“
 ”میں آپ کی بہتری کے علاوہ کچھ نہیں سوچ سکتی۔“
 لیڈی برکسز نے کہا۔
 ”تو مجھے جانے دیجیے۔“
 ”آپ کو جانے دینے میں آپ کی بہتری نہیں ہے۔“
 ”ہٹ جائے میرے سامنے سے۔“ شانہ نے کہتے
 ہوئے لیڈی برکسز کے برابر سے آگے نکل جانا چاہا۔
 ”نہیں۔“ لیڈی برکسز نے اس کی کلائی پکڑنا چاہی۔
 ”جاؤں گی۔“ شانہ چیخ پڑی۔ ساتھ ہی اس نے
 لیڈی برکسز کو بڑی زور سے دھکا دیا۔ لیڈی برکسز ادیوار
 سے جا ٹکرائی۔
 شانہ نے پلٹ کر دیکھے بغیر پھر تیزی سے آگے بڑھنا
 شروع کر دیا۔ اسے یہ بھی خیال نہیں آیا کہ لیڈی برکسز انے
 اسے دوبارہ کیوں نہیں پکارا۔ یہ بھی خیال نہیں آیا کہ عمار اس
 کے پیچھے کیوں نہیں آیا تھا یا شرملا کیوں نہیں آئی تھی۔ اس
 وحشت نے اسے پاگل کر دیا تھا کہ شانی کی حقیقت سامنے
 آنا چاہیے۔
 بڑھتے ہوئے قدم شانی کی خواب گاہ میں داخل

ہو گئے۔

☆☆☆

”تحریف رکھے پرس!“ ایس پی نادر نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

عماد اس کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ غصے سے اس کے ہونٹ جھپٹے ہوئے تھے۔

نادر نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا۔ ”ممکن ہے، ذرا دیر بعد میں آپ کو ہتھکڑیاں لگا دوں۔“

”کس جرم میں؟“ عماد کا لہجہ بہت تلخ تھا۔

”شائنی کے قتل کے جرم میں۔“

”تم کوئی خواب دیکھ رہے ہو ایس پی اوہ گلیشیر کے نیچے دب گئی تھی کیا شرمیلا کا بیان تمہارے ریکارڈ پر نہیں۔“

”وہ میرے دماغ میں بھی ریکارڈ ہے۔ تمہیں بچانے کے لیے اس نے حویلی کے نمک کا حق ادا کیا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ شائنی سے تمہارا بہت زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ وہ اس پر مصر تھی کہ شہباز کو حویلی میں آنے سے نہ روکا جائے۔ وہ اس کا بہت پرانا اور اچھا دوست ہے لیکن تم یہ اجازت دینے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہو رہے تھے۔ جھگڑے میں اتنی تیزی آئی کہ تم نے اس پر ہاتھ اٹھانا چاہا۔ وہ تیزی سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔“

عماد عجیب سے انداز میں ہنسا۔ ”اور میں نے آگے بڑھ کر اسے قتل کر دیا؟“

”نہیں۔“ نادر نے کہا۔ ”اس کی لاش حویلی میں نہیں، گلیشیر کے نیچے سے آخر کار نکال لی گئی ہے۔“

”تو شرمیلا کا بیان درست ثابت ہوا نا؟“

”میں پورا بیان دہرا نا چاہتا ہوں۔“ نادر نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بات کے انتظار میں وہ باتیں کر کے وقت گزارنا چاہتا تھا۔ عماد اسے تنہائی نظروں سے دیکھنے لگا۔

نادر بولا۔ ”پیچھے ہٹ کر شائنی نے تم سے کہا تھا کہ اگر یہ نوبت آسکتی ہے کہ تم مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ تو میں حویلی سے جاری ہوں۔ میں قریبی شہر کے ہوٹل میں قیام کروں گی۔ وہاں ایک ہی بڑا ہوٹل ہے۔ اگر تم اپنے کئے پر ندامت محسوس کرو اور حویلی میں شہباز کی آمد بحال کر کے مجھے واپس بلانا چاہو تو اس ہوٹل میں مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکلی تھی۔ تمہارا جھگڑا بیرونی دروازے کے قریب ہی ہوا تھا۔ باہر نکل کر شائنی ایک لینڈ کروزر میں بیٹھی اور اسے تیزی سے دوڑا دیا۔“ نادر نے خاموش ہو کر پھر

اپنی گھڑی دیکھی اور بولا۔ ”یہی بیان ہے نا شرمیلا کا؟“

”بولے رہو۔“ عماد کا لہجہ بھی تنکھا تھا۔

”ہاں۔“ نادر مسکرایا۔ ”اس کے آگے شرمیلا کا بیان یہ ہے کہ وہ اس جھگڑے کے سبب تم دونوں کی علیحدگی نہیں چاہتی تھی اس لیے وہ شائنی کو روکنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑی۔ شائنی نے لینڈ کروزر سیدھی دوڑادی۔ وہ جنگل کی طرف جا رہی تھی۔ ان دنوں آج کل جیسا ہی موسم تھا۔ برف پگھل رہی تھی، گلیشیر ٹوٹ کر جنگل پر گر رہے تھے لیکن شائنی ہر خطرے سے بے نیاز لینڈ کروزر کو دوڑاتی رہی۔ وہ درے تک پہنچنا چاہتی تھی تاکہ وہاں سے دوسرے شہر چلی جائے۔ یہ دیکھ کر شرمیلا نے وہیں گھڑی ہوئی ایک جیب سنہالی اور لینڈ کروزر کے پیچھے دوڑی۔ وہ لینڈ کروزر نے آگے نکل کر اسے روکنا چاہتی تھی۔ تم اپنی جگہ پر کھڑے پھانک کی طرف دیکھتے رہے۔ پندرہ منٹ بعد تمہارے پاس شرمیلا کا فون آیا۔ اس نے تمہیں بتایا کہ اس نے ایک گلیشیر کو پھسلے دیکھ لیا تھا۔ اسے مجبوراً اپنی جیب روکنا پڑی پھر اس نے دیکھا کہ گلیشیر لینڈ کروزر پر گر رہا تھا۔ شرمیلا نے اپنی جیب پھر دوڑائی اور اس مقام تک پہنچی۔ لینڈ کروزر کا بہت معمولی سا حصہ گلیشیر میں دبے سے رہ گیا تھا۔ شرمیلا کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ گلیشیر کی برف توڑ کر شائنی کو نکال سکتی اس لیے وہ جیب میں بیٹھ کر حویلی کی طرف واپس روانہ ہوئی۔ اسی وقت اس نے تمہیں فون کیا تھا۔“

”اس سے تم نے کیا اخذ کیا ایس پی؟“ عماد نے طنزیہ لہجہ میں پوچھا۔

”شرمیلا کے اس آخری حصے پر ہی مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ وہ تمہیں بچانا چاہتی تھی اس لیے اس نے یہ بیان دیا کہ شائنی کی موت کے وقت تم حویلی میں ہی تھے۔ حویلی آکر اس نے پولیس کو فون کر کے یہ سب کچھ بتایا۔ پولیس فوراً اس مقام پر پہنچی۔ لینڈ کروزر کا کچھ حصہ گلیشیر میں دبے سے بچ گیا تھا۔“

”یہ دیکھنے کے بعد بھی تم شرمیلا کے بیان کو غلط سمجھ رہے ہو؟“ عماد نے زہر لیے لہجہ میں پوچھا۔

نادر نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کہا۔ ”اب تم پولیس کی رام کہانی سنو۔ گلیشیر میں دب جانے سے بچ جانے والا حصہ پولیس کو دور ہی سے نظر آگیا تھا جس کے قریب پولیس اس لیے نہیں جاسکی کہ ایک اور بہت بڑا گلیشیر گڑبڑاہٹ کے ساتھ اسی طرف گر رہا تھا جہاں لینڈ کروزر کا کچھ حصہ دکھائی دیا تھا۔ اگر پولیس نہ نہتی تو اس گلیشیر کے

نیچے دب سکتی تھی۔ احتیاط کام آئی۔ وہ گلیشیر اسی جگہ گرا اور لینڈ کروزر کا نظر آنے والا حصہ بھی گلیشیر میں دب چکا تھا۔“

”یہ میرے علم میں آچکا ہے۔“ عماد نے کہا۔ ”تم ہر قیمت پر گلیشیر کے نیچے سے شائنی کو نکالنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے تمہیں کافی عرصے انتظار کرنا پڑا کہ گلیشیر گرنا بند ہو جائے۔ اس کے بعد ہی تم نے وہاں گلیشیر کی برف کھدوانا شروع کی تھی لیکن یہ یقین تمہیں بھی ہوگا اور مجھے بھی تھا کہ شائنی زندہ نہیں بنی ہوگی۔“

”یقیناً۔“ نادر نے کہا۔ ”مجھے بھی یقین تھا کہ شائنی زندہ نہیں بنی ہوگی لیکن میں لاش اس لیے بھی نکالنا چاہتا تھا کہ وہ پولیس کا فرض تھا۔ دوسرے مجھے یہ شبہ بھی تھا کہ شاید شائنی گلیشیر کے نیچے دبے سے پہلے ہی مار ڈالا گیا ہو۔“

”اور مار ڈالنے والا میں ہوں۔“ عماد نے ہلے انداز میں ہنسا۔

”ہاں، اور یہ شبہ اس لیے تھا اور ہے کہ تم بہت غصہ ور ہو۔ تم حویلی ہی کے ایک فنکشن میں شہباز پر اس طرح جھپٹے تھے جیسے اسے جان سے مار ڈالنا چاہتے ہو۔ حویلی کے ایک ملازم کی کسی غلطی پر تم نے اسے بھی اس بری طرح زد و کوب کیا تھا کہ وہ مرتے مرتے بچا تھا۔ شرمیلا کے اس بیان پر یقین کرنے کے بعد کہ تمہاری اور شائنی کی شدید لڑائی ہوئی تھی۔ اس کی گواہی حویلی کے دو ملازم بھی دے چکے ہیں اور پولیس نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کا نام ریکارڈ پر نہیں لایا جائے گا۔ تمہاری اتنی نفسی فطرت کے باعث مجھے خیال گزرا کہ شائنی کے پیچھے شرمیلا نہیں بلکہ تم گئے تھے۔ شرمیلا نے حویلی کے نمک کا حق ادا کرنے کے لیے یہ بیان دیا تھا کہ تم اس وقت حویلی ہی میں تھے۔“

”کیا لاش نکال لی گئی ہے؟“ عماد کا لہجہ سخت تھا۔

”ہاں۔“ نادر نے کہا۔ ”اور میرا خیال صحیح ثابت ہوا کہ اسے گلیشیر گرنے سے پہلے قتل کیا جا چکا تھا۔ ایک وزنی چیز سے اس کے سر پر ایسی جگہ وار کیا گیا تھا کہ شدید چوٹ اس کے دماغ تک پہنچے۔ وہ اسی سے مری گئی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یہ بتاتی ہے۔ پولیس کو آؤ قتل بھی مل گیا ہے۔ وہ گاڑی کا یہیہ بدلے والا آہنی جیک ہے۔ گلیشیر میں دبے سے پہلے جنگل کے دو درخت اس پر گرے تھے۔ ان کی وجہ سے برف اس تک نہیں پہنچی تھی۔ اس پر انگلیوں کے نشانات مل گئے ہیں یعنی اس ہاتھ کے نشانات جس نے وہ جیک شائنی کے سر پر مارا تھا۔ لو، ادھر میری باتیں ختم ہوئی ہیں اور فکر پرس کے ماہرین کی رپورٹ بھی آگئی ہے۔“

پولیس کا ایک آدمی کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ عماد ہونٹ جھپٹے ایس پی کی طرف دیکھتا رہا۔

آنے والے نے فکر پرس کی رپورٹ نادر کے سامنے رکھ دی۔ نادر نے رپورٹ دیکھی اور اس طرح کھڑا ہوا جیسے اسے کرسی میں لگے ہوئے اسپرنگ نے اچھال دیا ہو۔

”یہ... یہ... اس کے منہ سے لفظ نہیں نکل رہے تھے۔“ ”تو... شرمیلا کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔“

”کیا؟“ عماد کے منہ سے نکلا۔

”آئی ایم سوری پرس!“ ایس پی کا چہرہ یکسر بدل گیا۔

”آپ پر میرا شبہ قطعی غلط نکلا۔ شائنی کی قاتل شرمیلا ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔“ وہ میز کے گرد گھوم کر عماد کے قریب گیا۔ عماد ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”میرے ساتھ آئیے پرس!“ ایس پی بہت مضطرب تھا۔

”اگر جیک پر شرمیلا کی انگلیوں کے نشانات ہیں تو آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ شرمیلا ہی کی انگلیوں کے نشانات ہیں؟“

”سب کچھ بتا دوں گا آپ کو... حقیقت اب میری سمجھ میں آئی ہے۔ فوراً آئیں... ہو سکتا ہے کہ اس وقت پرس کی زندگی بھی خطرے میں ہو۔ میری مراد آپ کی بیوی

ثانیہ سے ہے۔“

”کیا؟“ عماد ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ ”ثانیہ کی زندگی...“

”ہاں۔“ ایس پی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ ”ثانیہ کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔“

☆☆☆

ثانیہ نے شائنی کی خواب گاہ میں قدم رکھا ہی تھا کہ پشت سے ایک ہاتھ اس کے شانے پر آیا۔ ثانیہ گھبراہٹ اور خوف میں اپنے پیچھے دیکھتے ہوئے خود بھی پیچھے ہٹی۔

”ڈر گئیں پرس؟“ شرمیلا بہت سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

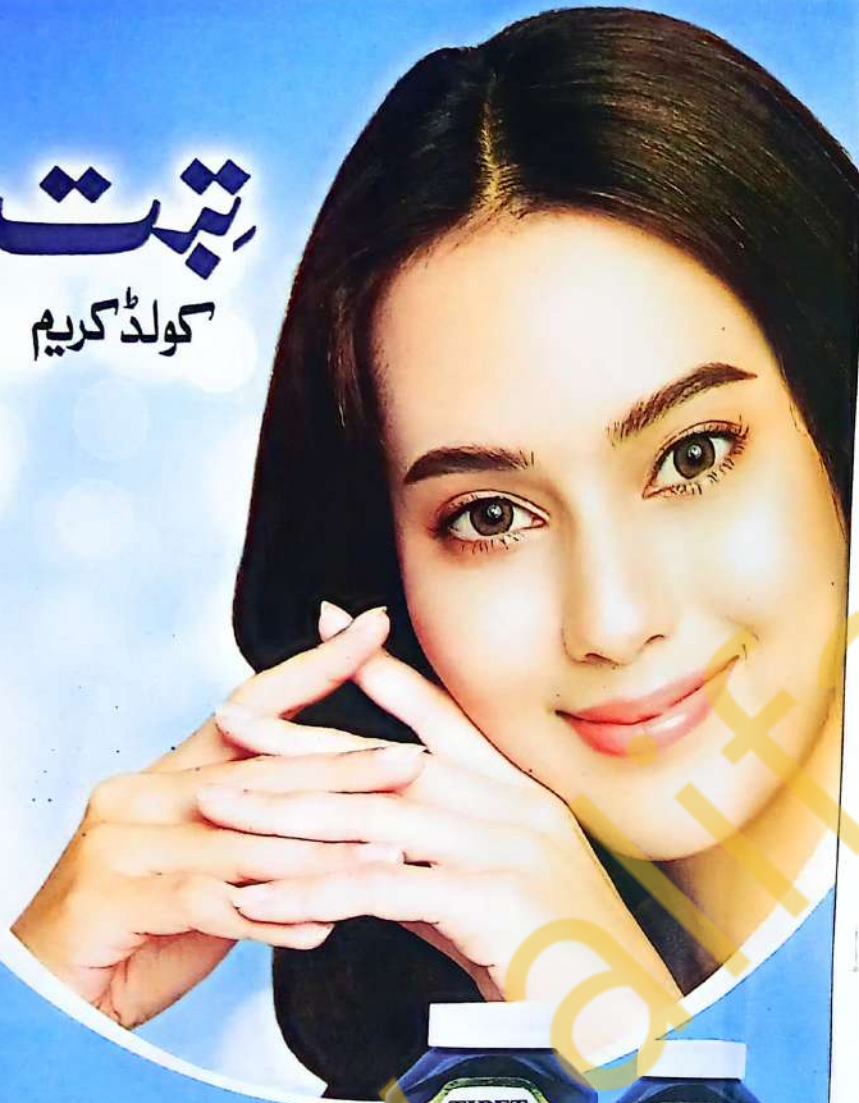
”تم ہو۔“ ثانیہ نے سکون کی سانس لی۔

”آپ نے لینڈی برگر آؤ گھڑی کر دیا؟“

”نہیں تو، میں نے انہیں اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے بس دھکا دیا تھا۔ وہ دیوار سے جا لگی تھیں۔“

”جا لگی نہیں، وہ دیوار سے ٹکرائی تھیں۔ ان کی دونوں کہنیوں اور سر پر شدید چوٹ آئی ہے۔ وہ چکرا کر گر پڑی تھیں۔ اتفاق سے ایک ملازم ادھر سے گزرا تھا۔

تبت کولڈ کریم



سرد اور خشک موسم میں تبت کولڈ کریم جلد کو
نمکی اور روکھے پن سے محفوظ رکھے۔ اس کا باقاعدہ
استعمال جلد کو تروتازہ اور ملائم بنائے۔

تبت کولڈ کریم - جلد جوان چہرہ حسین

TCC/27/2K24

”کیوں نادرا!“ انیلا ہنس کر بولی۔ ”پرنس کو
تھکوا یاں ابھی تک نہیں لگائیں؟“
”بورنہ کرو۔“ نادرا بھی ہنس دیا۔
”شرمیلا کے بارے میں کچھ بتائیے۔“ ثانیہ
بولی۔ کھانا شروع ہو چکا تھا۔
نادرا نے ثانیہ کو جواب دیا۔ ”وہ کوما میں چلی گئی ہے۔
اب اس پر مقدمہ اسی وقت چل سکتا ہے جب وہ کوما سے باہر
آجائے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ وہ زیادہ عرصے بھی کوما
میں رہ سکتی ہے۔ اس کے مقدمے میں آپ دونوں کے علاوہ
لیڈی برگنڈا کی گواہی ضروری ہوگی۔“
عماد بول پڑا۔ ”میں تو بہت جلد ہمیشہ کے لیے
اسٹیٹ چھوڑنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ اپنا سب کچھ بیچ
جاؤں گا۔ اس جوہلی سے تو کسی افراد کو دیکھی ہے۔“
”جا کر کتنی سنبھالے گا۔“
”ہاں۔“ عماد نے کہا پھر مسکرا کر بولا۔ ”اور اب
میری آفس سیکریٹری بھی میری بیوی ثانیہ ہوگی۔“
ثانیہ مسکرا دی۔ اب وہ پوری طرح ہشاش بشاش تھی۔
نادرا بولا۔ ”جب بھی شرمیلا پر مقدمہ چلا، آپ کو آنا
پڑے گا۔“
”وہ آتا توئی طور پر ہوگا۔“
”اور اب لیڈی برگنڈا کیا کریں گی؟“
”انہیں میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“
”نی اگال میں یہاں سے اپنا ضروری سامان لے
جاؤں گا۔ باقی سامان بھونانے کی ذمہ داری تم پر ہوگی انیلا!“
”ضرور۔“ انیلا نے کہا۔ ”لیکن آپ بھی بھی ہم سے
ملنے تو آیا کریں گے؟“
”یقیناً..... اور تم بھی وہیں آیا کرنا۔ اگر پولیس تمہیں
اجازت دے۔“ عماد نے ہنس کر نادرا کی طرف دیکھا۔
نادرا مسکرا کر بولا۔ ”میں بھی چند دن کی چھٹی لے کر
انیلا کے ساتھ آیا کروں گا۔“
خوشگوار باتوں میں کھانا کھالیا گیا۔ دوسرے دن
عماد، ثانیہ کو ساتھ لے کر بیٹک گیا۔ اپنا اکاؤنٹ اس نے
کمپنی کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروایا۔
چوتھے دن ہیلی کاپٹر نے وہاں سے پرواز کی۔ اس
میں عماد کے ساتھ ثانیہ تو تھی ہی لیکن لیڈی برگنڈا بھی تھی۔
ہیلی پٹر پر کھڑے ہوئے ایس پی نادرا اور انیلا نے
ہاتھ ہلا کر انہیں الوداع کہا۔

”وہ شیطان کیا مر گئی؟“ عماد نے نادرا سے پوچھا۔
”میرا خیال ہے بے ہوش ہوئی ہے۔ تم نے کیا، کیا
تھا اس کے ساتھ؟“
”میں کچھ نہیں کر سکا تھا۔ پانی کی ایک موٹی دھار اس
کے سر سے لگرائی تھی اور وہ گر پڑی تھی۔ وہ اب مجھے بھی مار
ڈالنا چاہتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالتور تھا۔“
”ریوالتور بھی مل گیا ہے۔“ نادرا نے بتایا۔
اس دوران میں لیڈی برگنڈا زیر لب کچھ پڑھتی رہی
تھی۔ اس نے قریب آ کر پہلے ثانیہ پر چوٹا کادرا اس کے بعد
پرنس پر۔
”اب ان دونوں کو تباہ چھوڑ دیا جائے۔“ ایس پی
نادرا نے کہا اور وہاں سے جانے کے لیے مڑا۔
”سب کچھ ہوا کیسے؟“ لیڈی برگنڈا نے اس کے
ساتھ چلے ہوئے پوچھا۔
”بتاتا ہوں آپ کو۔“ نادرا نے کہا۔
وہ دونوں خواب گاہ سے نکل گئے۔

☆☆☆

خاصی رات گزر چکی تھی جب ثانیہ اور عماد ڈنر کرنے
بیٹھے۔ شالنی کے کمرے کی آگ بجھائی جا چکی تھی لیکن فائر
فائٹرز وہاں اب بھی کام کر رہے تھے اسی لیے ایس پی نادرا
بھی نہیں گیا تھا۔ عماد کی بہن انیلا بھی آگئی تھی۔ وہ دونوں بھی
ڈانٹنگ ٹیبل پر تھے۔ لیڈی برگنڈا ہمیشہ کی طرح صرف
نگرائی کر رہی تھی۔
کھانا شروع کرنے سے پہلے ثانیہ نے لیڈی برگنڈا
سے کہا۔ ”میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ میری وجہ سے
آپ کا سر پھٹا۔“
”معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کیجیے پرنسز! اس
وقت آپ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھیں۔“
”اچھا، وہ سب کچھ بھول جائیے۔ یقیناً ابھی تک آپ
نے بھی ڈنر نہیں کیا ہوگا۔ آج ہمارے ساتھ ڈنر کیجیے۔“
”ارے نہیں پرنسز!“ لیڈی برگنڈا نے جلدی سے
کہا۔ ”میں.....“
عماد نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”پرنسز نے میرے
منہ کی بات چھین لی ہے۔ میں بھی یہی کہنے والا تھا، آئیے۔“
”آپ میرے برابر کی کرسی پر بیٹھیے۔“ ثانیہ پھر بولی۔
لیڈی برگنڈا کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ کسی قدر
چٹکچٹا ہٹ کے ساتھ ثانیہ کے برابر کی کرسی پر بیٹھ گئی۔
”شروع کرو ایس پی!“ نادرا نے ہاتھ بڑھایا۔